حیدر قریشی شخص و عکس

ارشد خالد



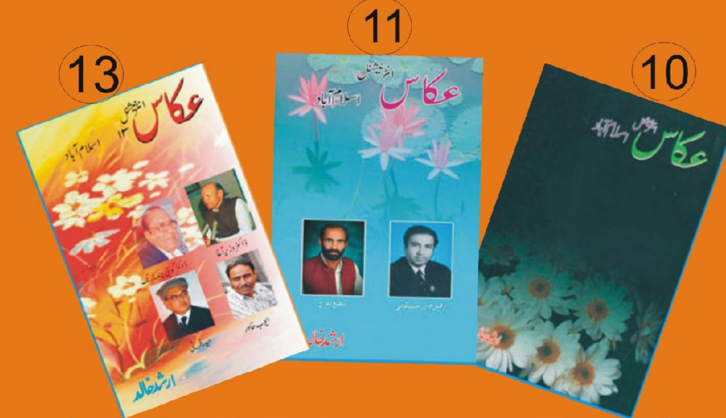
حیدر قریشی شخص و عکس

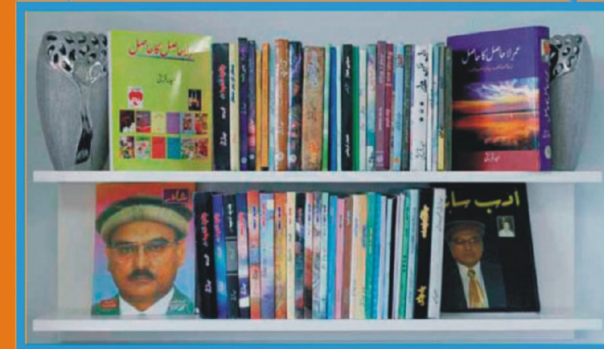
ارشد خالد

Haider Qureshi SHAKHS O AKS

Compiled By: Arshad Khalid







دو ریکس پر حیدر قریشی کی مطبوعہ کتب اور جدید ادب کے شمارے
اور حیدر قریشی سے متعلق کتب و رسائل

حیدر قریشی شخص و عکس

عکاس کا حیدر قریشی نمبر

اور بعد میں عکاس کے دوسرے شماروں میں
چھپنے والے حیدر قریشی سے متعلق مضامین ایک ساتھ

مدیر و مرتب

ارشد خالد

عکاس انٹرنیشنل اسلام آباد
مکان نمبر 1164، گلی نمبر 2، بلاک سی
نیشنل پولیس فاؤنڈیشن سیکٹر O-9 ۔ لوہی بھیر، اسلام آباد

جملہ حقوق بحق مرتب محفوظ

نام کتاب:	حیدر قریشی شخص و عکس
مدیر و مرتب:	ارشد خالد
سرورق:	ارشد خالد
اشاعت کا سال:	جون ۲۰۱۴ء
مطبع:	رانا سلیم پرنٹنگ پریس لاہور

قیمت: 200 روپے

ناشر: عکاس انٹرنیشنل

AKKAS PUBLICATIONS
House No 1164 Street No 2 Block C
National Police Foundation ,Sector O-9
Lohi Bhair, Islamabad, Pakistan
Tel.0300-5114739 0333-5515412

....

E- Mail:

akkasurdu2@gmail.com

انتساب

برمنگھم میں مقیم اردو کی معروف شاعرہ اور ادیبہ

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کے نام

بے رحم ہواؤں کی نظر دیکھتے رہنا
کشتی کو ڈبو دیں نہ بھنور، دیکھتے رہنا
(رضیہ اسماعیل)

میں لہر چناب کی ہوں
غیرت بھائیوں کی
بیٹی پنجاب کی ہوں
(رضیہ اسماعیل)

فہرست

عکاس حیدرقریشی نمبر　　مرتب ومدیر:ارشدخالد

شمارہ نمبر۴،اکتوبر۲۰۰۵ء

ادبی زاویے

شخصی زاویے

اقتباسات:

عکاس انٹرنیشنل اسلام آباد مرتب و مدیر: ارشد خالد

شمارہ نمبر۱۰،جنوری ۲۰۱۰ء

خصوصی مطالعہ:عمرِ لاحاصل کا حاصل

عکاس انٹرنیشنل اسلام آباد مرتب و مدیر: ارشد خالد

شمارہ نمبر۱۱،مئی ۲۰۱۰ء

حیدر قریشی بحیثیت محقق و نقاد

عکاس انٹرنیشنل اسلام آباد مرتب و مدیر: ارشد خالد

شمارہ نمبر۱۳،مارچ ۲۰۱۱ء

ایک کتاب: عمرِ لاحاصل کا حاصل

حیدرقریشی شخص وعکس

’’حیدرقریشی شخص وعکس‘‘ بنیادی طور پرصرف **عکاس** میں وقتاً فوقتاً چھپنے والے مضامین اوردوسرے مواد پرمبنی کتاب ہے۔اکتوبر۲۰۰۵ء میں **عکاس** کا حیدرقریشی نمبرشائع کیا گیا تھا۔اس نمبرکوابتدائی اضافی سولہ صفحات کے بعدجوں کا توں اورپہلی ترتیب کے مطابق شامل کرلیا گیاہے۔یہ نمبر۱۱۲صفحات پرمشتمل تھا۔

عکاس انٹرنیشنل اسلام آباد کے شمارہ نمبر۱۰،۱۱،اور۱۳میں حیدرقریشی کی کتاب’’عمرِ لاحاصل کا حاصل‘‘ کے حوالے سے اورحیدرقریشی کی تنقیداورتحقیق کے حوالے سے خصوصی طور پر چندمضامین شائع کیے گئے تھے۔ان مضامین کوشماروں کی ترتیب کے مطابق اس کتاب میں شامل کرلیا گیاہے۔یہ سارے۸۰صفحات ہیں۔یوں عکاس میں چھپنے والے سارے مضامین اورحیدرقریشی نمبر کے کل صفحات ۱۹۲ بنتے ہیں۔ان صفحات کی نمبرنگ اسی طریق سے کردی گئی ہےاورشروع کے سولہ صفحات کو A-1 سے A-16 تک نمبردے کرالگ سے واضح کردیا گیاہے۔مجموعی طورپریہ کتاب۲۰۸صفحات پرمشتمل ہے۔

عکاس کے **حیدرقریشی نمبر** میں’’حیدرقریشی شخص وعکس‘‘ کے عنوان سے میں نے ان کے شخصی اورادبی کوائف جمع کیے تھے۔اب تک ان کوائف کے ادبی حصہ میں کئی اہم اضافے ہوچکے ہیں۔میں نے **عکاس** کے اکتوبر۲۰۰۵ء والے نمبرمیں وہ کوائف اسی طرح رہنے دیئے ہیں جیسے تب تھے،لیکن اس کتاب کے آخرمیں اس باب کو نئے اضافوں کے ساتھ شامل کردیا ہے۔نئے اضافوں سے اندازہ کیا جاسکے گا کہ گزشتہ آٹھ نو برس کے دوران حیدرقریشی کی ادبی کارکردگی کیسی رہی۔وہ ادب کی دنیامیں مختلف میدانوں میں کتنے متحرک اورفعال رہے۔ بنیادی طور پر’’حیدرقریشی شخص وعکس‘‘ میں وہ سارامواد شامل ہے جوعکاس کے مختلف شماروں میں شائع ہوتا رہا ہے۔لیکن اس میں ایک مضمون بطورخاص الگ سے شامل کررہاہوں۔ڈاکٹرانورسدید نے اِسی برس کے آغاز میں حیدرقریشی کے بارے میں ایک شاندارمضمون شائع کیا تھا۔یہ مضمون اختصار کے ساتھ حیدرقریشی کی جملہ ادبی جہات کا احاطہ کرتا ہواایک عمدہ تعارف ہے۔اس کی اہمیت وافادیت کے باعث اس مضمون کو پورے حوالے کے ساتھ اس کتاب کے خصوصی پیش لفظ کے طور پرکتاب میں شامل کررہاہوں۔

اب حیدرقریشی کے کوائف کے عنوان’’حیدرقریشی شخص وعکس‘‘ کوکتاب کے نام کے طور پراختیارکررہا ہوں۔اس کتاب کوایک رنگ میں **عکاس** کا حیدرقریشی سے متعلق مطبوعہ ریکارڈ یک جا کرنے کا عمل کہا جاسکتا ہے۔اس لحاظ سے یہ ایک دستاویزی نوعیت کا کام بن گیاہے۔یہ حیدرقریشی کے ساتھ میری دیرینہ رفاقت کا ثمر بھی ہے کہ میں ان ساری تحریروں کو یک جا کرکے کتاب کی صورت میں پیش کررہاہوں۔ایسے موسم میں جب انڈیا اور پاکستان کی بعض یونیورسٹیوں میں حیدرقریشی کے ادبی کام پرسنجیدگی کے ساتھ توجہ دی جانے لگی ہے، مجھے امید ہے کہ میری یہ کتاب ادبی دنیا کے ساتھ یونیورسٹیوں میں حیدرقریشی کے بارے میں تحقیق کرنے والے طلبہ کے کام آئے گی۔

یہ امید ایک مدیرومرتب دوست کی طرف سے اپنے شاعراورادیب دوست حیدرقریشی کے لیے مستقبل کی نیک تمناؤں کا اظہار ہے۔

ارشد خالد

مدیر**عکاس انٹرنیشنل**،اسلام آباد

۵/جون۲۰۱۴ء

پیش لفظ

جرمنی میں پاکستان کا ادبی وتہذیبی سفیر۔۔۔حیدرقریشی

ڈاکٹرانورسدید(لاہور)

☆

کن کا ایک لفظ اسیروں پہ کہیں سے اترا
آسماں ہو گئے تخلیق قفس کے اندر

یہ شعرارد و کے تازہ فکر شاعر حیدر قریشی کا ہے۔جوانہوں نے اپنی غزلوں،نظموں،اور ماہیوں کی نئی کتاب کے سرورق پر اپنی داخلی تخلیقی شخصیت کے تعارف کے لئے درج کیا ہے۔اس کتاب کا عنوان ''قفس کے اندر'' بھی اس شعر سے اخذ کیا ہے اور یہ معنوی طور پر اس بات کا استعارہ ہے کہ شاعر کا وجود وقت اور زنداں کا اسیر ہے۔اورشاعری انہیں اس زنداں سے رہائی نہیں دلاتی بلکہ ہفت افلاک بھی ان کے ساتھ محوِ اختلاط وکلام ہو جاتے ہیں۔مضامین غیب سے خیال میں اترنے لگتے ہیں۔اورصریرِ خامہ نوائے سروش بن جاتا ہے۔

میں حیدرقریشی کواس زمانے سے جانتا ہوں جب ان پر جوانی کا عالم طاری تھا اور ان کی شاعری کی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔اس زمانے میں وہ خانپور کے قریب ایک شوگر فیکٹری میں ملازم تھے۔دن کومحنت اور مشقت کرتے،رات کی تنہائی میں شاعری کرتے۔میں نے ان کی غزلیں ڈاکٹر وزیر آغا کے رسالے''اوراق''میں پڑھیں تو میرا پہلا تاثر یہ تھا کہ حیدرقریشی آرائشی نقش ونگار پیدا کئے بغیر شعر کا داخلی اور خارجی حسن ابھارتے ہیں۔چنانچہ میں نے ان کی شاعری پر اپنی رائے کا اظہار کیا تو یہ حقیقت بھی تسلیم کی کہ حیدرقریشی کی سادگی ہی ان کا حُسن ہے اور ان کی شاعری کی خورو ئیدگی ہی ان کا وقار ہے۔حیدرقریشی کی زندگی کا یہ دور معاشی آزمائشوں میں الجھا ہوا تھا۔ایک طرف متوسط گھرانے کا یہ فرد اپنے معاشی حالات بہتر بنانے کے لیے زمانے سے نبرد آزما تھا تو دوسری طرف اپنے چینی کے کارخانے کے مزدوروں کے مستقبل کوسنوارنے کے لئے یونین کی تنظیمی سرگرمیوں میں

مصروف تھا اور انہیں صنعتکاروں کی شدید مخالفت کا سامنا تھا۔ادب کے افق پر وہ ایک روشن ستارے کی طرح طلوع ہوئے تھے۔لیکن رسالہ''اوراق''اور ڈاکٹر وزیر آغا سے رابطے نے یہاں بھی حیدر قریشی کوادبی تنازعوں میں الجھا دیا تھا۔لیکن میرا یہ مشاہدہ حقیقت پر مبنی ہے کہ انہوں نے وفاداری کواستواری سے مشروط کیا اور پھر زندگی کے ہر موڑ پر اسے ایمان کا درجہ دیا۔خان پور میں حیدرقریشی نے اپنی زندگی کا تشکیلی دور گزارا اور اپنے آزادانہ اظہار کے لئے ایک رسالہ''جدید ادب''جاری کیا۔اس رسالے کا خمیر ان کے ادبی باطن سے اُٹھا تھا۔اس لئے''جدید ادب'' ان کی زندگی کے سفر میں ہمیشہ ان کے ہم رکاب رہا۔

حیدرقریشی نے اپنے طالب علمی کے زمانے میں پڑھا تھا کہ''سفر وسیلۂ ظفر''ہوتا ہے اور''سر پھول وہ چڑھا جو وطن سے نکل گیا''چنانچہ انہوں نے بھی خان پور سے نقل مکانی کی اور اندرونِ ملک سفر اختیار کیا۔کچھ وقت چناب نگر فیصل آباد میں گزرا جواس زمانے میں لائل پور کے نام سے موسوم تھا۔پھر ایبٹ آباد چلے گئے جہاں ان کی ایم اے کی ڈگری کام آئی اور انہیں محکمہ تعلیم میں اعلیٰ ملازمت مل گئی،لیکن وہ عالم رنگ وبو کی حدود میں رہنے والے انسان نہیں تھے۔ان کے سامنے چمن اور تھے تو آشیاں بھی اور تھے۔اور وہ آسمانوں کے بدلتے رنگ دیکھنے کے بھی شیدائی تھے۔ایک دن اچانک خبر آئی کہ حیدرقریشی جرمنی پہنچ گئے ہیں۔میں نے ان کی آسودگی کا اندازہ ان کے رسالے''جدید ادب''سے لگایا جو اَب نہ صرف بین الاقوامی ادبی پرچہ بن چکا تھا بلکہ اس کی ضخامت بھی سینکڑوں صفحات تک جا پہنچی تھی۔یوں سمجھئے کہ خان پور کا مختصر مقامی''جدید ادب''اب جرمنی جتنی وسعت اختیار کر چکا تھا اور اس کے لکھنے والے پوری دنیا میں پھیلے ہوئے تھے اور خود حیدرقریشی کے اظہار میں وسعت پیدا ہوئی تو وہ غزل،نظم اورانشائیے تک محدود نہ رہے بلکہ تحقیق وتنقید کی طرف بھی آئے،خاکہ نویسی کومنفرد معیار عطا کیا۔یادنگاری میں اپنی زندگی کے وہ نقوش پیش کئے جو پڑھنے والوں کوافسانوں سے زیادہ دلچسپ محسوس ہوئے

حیدرقریشی نے ادب کا آغاز''دبستانِ وزیر آغا''سے کیا تھا۔انہوں نے رسالہ''اوراق'' کی فکری جہت کواپنا رہنما بنایا اور اپنی انفرادیت کواس چراغ سے روشن کیا۔تاہم میرا مشاہدہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی ادبی زندگی میں اس نصب العین کوبھی قائم رکھا جو رسالہ''ادبی دنیا''میں مولانا صلاح الدین احمد کے پیشِ نظر تھا اور جسے توسیع ڈاکٹر وزیر آغا نے رسالہ''اوراق''میں دی تھی۔میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا کی قربت نے حیدرقریشی کے مزاج کوتحریکی بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ڈاکٹر وزیر آغا نے جدید انشائیہ کے فروغ کی تحریک پروان چڑھائی تھی،حیدرقریشی نے پنجابی کی صنفِ شعر''ماہیا''کی تحریک برپا کی اوراسے اتنا فروغ دیا کہ اب''ماہیا''اردو دنیا کے ہر گوشے میں تخلیق کیا جارہا ہے۔اور یہ بات نظر انداز نہ کی جائے کہ جس طرح وزیر آغا نے انشائیہ کے بانی ہونے کا سہرا اپنے سر نہیں باندھا(حالانکہ جناب مشتاق احمد یوسفی نے تو یہ قول فیصل دے دیا تھا کہ وزیر آغا ہی جدید اردو انشائیہ کے بانی اور منتہی ہیں)اسی طرح حیدرقریشی نے بھی اردو ماہیا کے آغاز کی پگڑی ہمت رائے شرما کے سر پر

رکھ دی۔ دوسری بات یہ ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا نے ''انشائیہ'' کی تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے رسالہ ''اوراق'' جاری کیا تھا تو حیدر قریشی نے بھی اپنے رسالہ ''جدید ادب'' کی نشاۃ ثانیہ جرمنی سے کی تو اسے ماہیا کے فروغ کے لئے مختص کر دیا۔ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ''ماہیا تحریک'' کے قافلہ سالار کی حیثیت میں اردو ادب کی تاریخ حیدر قریشی کو ہمیشہ یاد رکھے گی۔

حیدر قریشی کی ادبی زندگی کی یہ جہت خصوصی تذکرے کی متقاضی ہے کہ انہوں نے ادب میں آلودگی کو کبھی قبول نہیں کیا۔ اور اس کا آئینِ ادب ''حق گوئی و بے باکی'' ہے۔ چنانچہ انہیں اردو ادب کا قائدِ حزب اختلاف کہا جائے تو یہ بالکل درست ہوگا۔ ایک زمانے میں وہ ایسے جعلی ادیبوں کو منکشف کرنے میں کوشاں تھے جو خود نہیں لکھتے بلکہ پیسے دے کر دوسروں سے لکھواتے ہیں اور اپنے نام پر چھپواتے اور شہرت حاصل کرتے ہیں۔ پھر ان کا رخ ''سرقہ نگاروں'' کی طرف ہو گیا جو مغرب کی زبانوں میں لکھی ہوئی کتابوں کو اپنی زبان میں ترجمہ کر کے چھاپتے ہیں اور اسے بلا حوالہ اپنی فکری کارگزاری شمار کرتے ہیں۔ ایسے جعل سازوں کو بھنڈر کرنے میں حیدر قریشی نے خصوصی خدمات انجام دی ہیں۔ انہوں نے ایسے دزونگاروں کو سرِ عام منکشف کیا ہے جن کے ہاتھ پر ادب کا چراغ رکھا ہے اور جن کی سرقہ شدہ روشنی قارئینِ ادب کو غیر ادبی، غیر فطری انداز میں متاثر کر رہی ہے۔ ادب کی نئی تاریخ حیدر قریشی کے انکشاف سے ہی استفادہ کرے گی۔

حیدر قریشی اپنے ذاتی حوالے سے ایک کثیر الجہت ادیب ہیں۔ ان کے ادبی سفر کا آغاز ''اوراق'' کے دوسرے دور میں ۱۹۷۱ء سے شروع ہوا تھا۔ بیس برس کے بعد ان کی شاعری کا پہلا مجموعہ ''سلگتے خواب'' ۱۹۹۱ء میں اسلام آباد سے شائع ہوا۔ مجروح سلطان پوری نے اسے شاعری میں تازگی لانے کی سعیٔ جمیل قرار دیا۔ ''عمرِ گریزاں''، ''محبت کے پھول''، ''دعائے دل'' اور ''درد سمندر'' ان کی شاعری کے مزید مجموعے ہیں۔ تازہ ترین کتاب ''قفس کے اندر'' ہے جس کے ایک شعر نے مجھے یہ مضمون لکھنے کی تحریک دی ہے۔ تخلیقی نثر میں انہوں نے سب سے پہلے افسانے میں قلم کاری کی۔ ''روشنی کی بشارت'' اور ''قصے کہانیاں'' اور ''ایٹمی جنگ'' ان کے افسانوں کے مجموعے ہیں جو انگریزی اور ہندی میں بھی ترجمہ ہو چکے ہیں۔ انشائیوں کے مجموعے کا نام ''فاصلے اور قربتیں'' ہے۔ سفر نامہ کی صنف میں ''سوئے حجاز'' خاکہ نگاری میں ''میری محبتیں'' اور یادنگاری میں ''کھٹی میٹھی یادیں'' کے نام سے کتابیں چھپ چکی ہیں۔ تحقیق و تنقید میں انہوں نے سب سے پہلے ''ڈاکٹر وزیر آغا۔۔۔ عہد ساز شخصیت'' میں اپنے ادبی محسن کو خراجِ تحسین پیش کیا اس کے بعد ''حاصلِ مطالعہ'' ''ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور مابعد جدیدیت'' ''تاثرات'' ''مضامین اور تبصرے'' ''اردو میں ماہیا نگاری'' ''اردو ماہیا کی تحریک'' ''اردو ماہیا کے بانی ہمت رائے شرما'' اور ''ماہیے کے مباحث'' جیسی کتابیں شائع کیں۔ ان کے کالموں کے مجموعے ''اِدھر اُدھر سے'' ''منظر اور پس منظر'' ''خبر نامہ'' اور ''چھوٹی سی دنیا'' کے عنوانات سے چھپ چکے ہیں۔ اور تالیفات میں

''شفق رنگ'' ''کرنیں'' اور سرائیکی غزل شامل ہیں۔

اہم بات یہ ہے کہ حیدر قریشی نے دنیا میں سب سے پہلی اردو کی ادبی ویب سائیٹ[1] جاری کی اور ان کی سب کتابیں انٹرنیٹ پر بھی دستیاب ہیں۔ حال ہی میں انہوں نے ''جدید ادب'' کا ''میرا جی'' نمبر شائع کیا جس پر تبصرے پوری اردو دنیا میں شائع ہو رہے ہیں۔

حیدر قریشی اردو ادب کے وسیع الجہات ادیب ہیں۔ پاکستان میں منزہ یاسمین نے ان کی شخصیت و فن پر ایم اے کا مقالہ لکھا ہے۔ ہندوستان میں ''حیدر قریشی شخصیت اور ادبی جہتیں'' کے عنوان سے ڈاکٹر عبدالرب نے تحقیقی کتاب لکھ کر گلبرگہ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اور اب میں کہہ سکتا ہوں کہ حیدر قریشی بلاشبہ پہلے ''دبستانِ سرگودھا'' سے وابستہ تھے لیکن اب خود شجر سایہ دار بن گئے ہیں۔ میں انہیں ''دبستانِ حیدر قریشی'' کے نام سے موسوم کرتا ہوں جس نے جرمنی میں اردو ادب کا چراغ روشن کر رکھا ہے۔ وہ پاکستان کے تہذیبی اور ادبی سفیر ہیں اور انہیں قومی اعزاز ''پرائیڈ آف پرفارمنس'' سے سرفراز کیا جانا چاہئے۔ ان سے کم درجہ کے ادیب یہ اعزاز حاصل کر چکے ہیں۔

(بحوالہ ہفت روزہ ندائے ملت لاہور۔ شمارہ: ۹ تا ۱۵ جنوری ۲۰۱۴ء)

....

[1] یہاں اس ہلکی سی وضاحت کی ضرورت ہے کہ حیدر قریشی نے اردو کی سب سے پہلی ویب سائٹ جاری نہیں کی۔ البتہ کسی زندہ ادیب کی پہلی اور مکمل ویب سائٹ حیدر قریشی نے ہی قائم کی۔ اسی طرح حیدر قریشی کے جدید ادب جرمنی سے پہلے بعض اردو ادبی رسائل کتابی صورت میں چھپنے کے ساتھ جزوی طور پر انٹرنیٹ پر موجود تھے لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ حیدر قریشی کا ادبی رسالہ جدید ادب پہلا ادبی رسالہ تھا جو بیک وقت کتابی صورت میں بھی شائع ہو رہا تھا اور مکمل طور پر انٹرنیٹ پر بھی دستیاب تھا۔ یہ دونوں اعزاز یقیناً حیدر قریشی کے دامن میں ہیں۔

(ارشد خالد)

کب اپنی پہچان کے سارے بھید کھلے ہیں خود پر
جھانک ابھی کچھ اور بھی اندر، من کو اور ٹٹول
(حیدر قریشی)

مہکار ہے کلیوں کی
جیسے دعا کوئی
دھرتی پہ ہو ولیوں کی
(حیدر قریشی)

ادبی کتابی سلسلہ

عکاس
کتاب نمبر ۴

اشاعتِ خاص

حیدر قریشی نمبر

مرتب

ارشد خالد

معاونین

اکرام الحق سرشار ۔ خالد ندیم ۔ صدیق لاٹکی

رابطہ کے لئے:

مکتبہ عکاس

مکان نمبر 1164، گلی نمبر 2، بلاک سی

نیشنل پولیس فاؤنڈیشن سیکٹر O-9 اسلام آباد

نام کتاب: عکاس کتاب نمبر۴

مرتب: ارشد خالد

تاریخ اشاعت: یکم اکتوبر ۲۰۰۵ء

سرورق: خورشید اقبال (۲۴ پرگنہ)

مطبع: ایس ایم اشتیاق پرنٹرز۔لاہور

قیمت: ۳۰ روپے

ناشر

مکتبہ عکاس

House No 1164 Street No 2 Block C

National Police Foundation ,Sector O-9

Lohi Bhair, Islamabad

ای میل:**akkasurdu@hotmail.com**

فہرست

ادبی زاویے

شخصی زاویے

ادب کی پرکھ کا سوال

''ادب کی پرکھ کا سوال ایک نجی محفل کی گفتگو سے اٹھا تو ان (وزیر آغا) کے داخلی اضطراب نے ایک نئے سوال کو جنم دیا۔'' پچھلے دنوں ایک نجّی محفل میں اردو کے ایک بزرگ نقّاد نے کسی تازہ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ میرے لیے اس کتاب کو پسند کرنا ناممکن ہے۔اس لیے کہ یہ تو میرے عقائد ہی کے خلاف ہے۔اور میں سوچنے لگا کہ ادب کی پرکھ کے سلسلے میں اگر عقیدے کو کسوٹی مقرر کیا جائے تو اس کے کیا نتائج برآمد ہوں گے؟''(**'ڈاکٹر وزیر آغا کی تیکنیک'** مضمون بحوالہ **کتاب شام کا سورج** از **ڈاکٹر انور سدید**۔ص۲۶۰)

اپنی بات:

حیدرقریشی سے میری دوستی خانپور کے زمانے سے قائم ہے۔ پھر وہ خانپور سے نکل کر کہیں سے کہیں ہوتے ہوئے جرمنی جا پہنچے اور میں بھی خانپور سے نکل کر کئی شہروں سے ہوتا ہوا راولپنڈی آ پہنچا۔ اگر چہ کوٹ سمابہ میں بھی مجھے بعض بزرگ شاعروں کی رفاقت ملی ہوئی تھی لیکن سچ یہ ہے کہ مجھے اور خانپور کے بہت سارے دوسرے دوستوں کو صحیح معنوں میں ادب کا ذوق اور شوق حیدرقریشی کی صحبتوں سے ملا تھا۔ جب حیدرقریشی کے بارے میں نذر خلیق کی مرتب کی ہوئی کتاب شائع ہوئی تو مجھے حیدرقریشی پر کچھ کام کرنے کا شوق ہوا تھا۔ اب سعید شباب کی کتاب بھی آ گئی ہے۔ اس سے میرے شوق کو رستہ سجھائی دے گیا۔ ادبی دوستی میں ادب کا ایسا رستہ اختیار کیا جائے جو دوسروں سے کچھ مختلف ہو۔ ''عکاس'' تو میں پہلے ہی وقتاً فوقتاً چھاپ رہا ہوں۔ عکاس کا حیدرقریشی نمبر کسی ادبی رسالے یا ادبی کتابی سلسلے کا پہلا نمبر ہو گا۔ یہ خیال آیا اور بس پھر اس منصوبے پر کام شروع کر دیا۔ مجھے اس وجہ سے خوشی ہو رہی ہے کہ میں نے جن ادیبوں سے مضامین کے حصول کے لیے رابطہ کیا ان میں سے زیادہ تر نے نہ صرف تعاون کیا بلکہ میری ہر طرح سے حوصلہ افزائی کی۔ اس تجربے کے نتیجہ میں سنجیدگی سے سوچ رہا ہوں کہ دوسرے اہم شاعروں اور ادیبوں کے بارے میں بھی اسی معیار، اسی اختصار اور اسی انداز کے خاص نمبر شائع کروں۔

جدید ادب کے خانپور کے زمانے سے حیدرقریشی کا یہ طریقۂ کار رہا تھا کہ وہ کسی مضمون یا افسانے کے آخر میں بچ جانے والی جگہ پر کوئی اقتباس دے دیا کرتے تھے۔ ان پر کتابیں مرتب کرنے والے بعض دوستوں نے بھی اس طریق کار کو اپنایا۔ چنانچہ میں نے بھی اسی طریقے کو اختیار کیا ہے۔ مضامین کے آخیر میں جہاں کچھ جگہ بچ رہی ہے وہاں متعلقہ موضوع سے کسی حد تک میل کرتا ہوا کوئی اقتباس حوالے کے ساتھ دے دیا ہے۔ حیدرقریشی کے بارے میں نذیر فتح پوری اور سنجے گوڑبولے اور پروفیسر نذر خلیق کی مرتب کردہ کتب میں دونوں کتابوں کے مرتبین کی اپنی اپنی ترتیب کے باوجود بعض اقتباسات دونوں کتابوں میں دکھائی دیتے ہیں۔ اس عمل سے ان اقتباسات کی اہمیت اجاگر ہوتی ہے اور ان کی واقعی اہمیت ہے۔ البتہ میں نے زیادہ سے زیادہ کوشش کی ہے کہ اس نمبر میں کوئی مضمون یا اقتباس تکرار کا احساس نہ دلائے اور جہاں تک ممکن ہے غیر مطبوعہ مضامین کو ہی شامل کیا جائے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اقتباسات کے انتخاب میں چونکہ عام طور پر چھپے ہوئے مواد سے ہی استفادہ کیا جانا ممکن ہے، اس لیے پہلے والی ساری کتابیں میرے پیشِ نظر رہی ہیں۔ لیکن ان سے اقتباسات کے چناؤ میں اتنی احتیاط ضرور

کی ہے کہ وہ پہلے کسی کتاب میں اقتباس نہ کئے گئے ہوں۔ آخری مرحلے میں مجھے حیدرقریشی کی طرف سے، ان کے نام لکھے گئے افتخار امام صدیقی کا خط ملا ہے، اس کا مختصر سا حصہ بطور اقتباس دے دیا ہے۔

اس نمبر میں شامل مضامین کو ترتیب دیتے وقت میرے پیش نظر محترم مضمون نگاروں کے حفظ مراتب کے مطابق نام اور مقام کی بجائے حیدرقریشی کی ادبی اصناف میں دلچسپی کی ترتیب رہی ہے۔ اگر چہ میری دی ہوئی ترتیب حتمی نہیں ہے۔ میرے اندازے کے مطابق حیدرقریشی نے جس طرح مختلف اصناف سخن میں دلچسپی لی۔۔۔ اسی ترتیب سے ان اصناف پر لکھے جانے والے مضامین کو شامل کیا گیا ہے۔ یہ وضاحت اس لیے ضروری ہے کہ اصناف کی ترتیب کا خیال رکھنے کی وجہ سے کئی معتبر اور زیادہ اہم لکھنے والے نسبتاً بعد میں یا آخر میں نظر آئیں گے۔ یہ صرف اس نمبر کی ترتیبی مجبوری ہے۔ اس کے لیے میں سارے دوستوں سے معذرت خواہ ہوں۔

عکاس کے حیدرقریشی نمبر کی تیاری کے سلسلے میں پروفیسر نذر خلیق صاحب نے ذاتی طور پر بہت تعاون کیا ہے، جس کے لئے میں ان کا بے حد ممنون ہوں۔ اسی طرح جن مضمون نگار دوستوں نے خاص توجہ کے ساتھ تعاون کیا ان کا خاص شکریہ ادا کرنا مجھ پر واجب ہے۔ ڈاکٹر رشید امجد، ڈاکٹر علی احمد فاطمی، منشا یاد، احمد ہمیش، اکبر حمیدی، سلطان جمیل نسیم، خاور اعجاز، ناصر نظامی۔۔۔ ان سب کا شکریہ کہ ان کے مضامین سے اس نمبر کی اہمیت میں اضافہ ہوا ہے۔ ان کے علاوہ دوسرے تمام دوستوں کا بھی شکریہ جن کے مضامین اس نمبر میں شامل ہیں۔ ان کا تعاون قابلِ تعریف ہے۔

امید ہے **عکاس** کے **حیدر قریشی نمبر** کو سنجیدہ علمی، ادبی حلقوں میں پسند کیا جائے گا اور اس نمبر کی پذیرائی کے نتیجہ میں مجھے دوسرے اہم ادیبوں کے خاص نمبر چھاپنے کا حوصلہ ملے گا۔

ارشد خالد

''عمرِلا حاصل کا حاصل ''نادر، انوکھا اور منفرد تجربہ

''(حیدرقریشی) کی پوری زندگی کا تخلیقی اثاثہ ''عمرِ لا حاصل کا حاصل'' کے نام سے شائع ہوا ہے جس میں پانچ شعری مجموعے (سلگتے خواب، عمرِ گریزاں، دعائے دل، دردسمندر اور محبت کے پھول) اور چھ نثری مجموعے (افسانے: روشنی کی بشارت اور قصے کہانیاں۔۔۔ انشائیے: فاصلے قربتیں۔۔۔ سفرنامہ: سوئے حجاز۔۔۔ خاکے: میری محبتیں اور کھٹی میٹھی یادیں) شامل ہیں جسے اردو ادب کا نادر، انوکھا اور منفرد تجربہ قرار دیا جاسکتا ہے۔''

(**ڈاکٹر انور سدید** اقتباس از تبصرہ مطبوعہ **روزنامہ نوائے وقت لاہور** سنڈے میگزین مورخہ 21اگست 2005ء)

میرزا ادیب

سلگتے خواب

(تاثرات کا یہ مکمل متن کسی کتاب میں شامل نہیں اس لیے اس نمبر میں شامل کیا جا رہا ہے۔**ارشد خالد**)

حیدر قریشی مجھ سے دُور بھی ہیں اور قریب بھی۔ دُور زمینی فاصلے کے لحاظ سے، اور قریب اس محبت اور خلوص کی بنا پر جو وہ میری ذات کے لئے روا رکھتے ہیں، مگر کچھ لمحے ایسے بھی آتے ہیں جب وہ میرے بہت ہی قریب آ جاتے ہیں، یہ وہ لمحے ہوتے ہیں جب میں اُن کی کسی تڑپا دینے والے والی تخلیق کا مطالعہ کرتا ہوں، یہ تخلیق بالعموم شعری صورت میں ہوتی ہے۔ حیدر قریشی نے اپنی ذہانت کا ثبوت کئی صورتوں میں دیا ہے، وہ ایک شاعر بھی ہیں، افسانہ نگار بھی، اور ان کے علاوہ ایک مدیر بھی۔ مجھے ان کی ساری صلاحیتوں نے متاثر کیا ہے، مگر میں جب معروضی انداز میں ان کا تجزیہ کرتا ہوں تو کہہ سکتا ہوں کہ میری نظروں میں ان کی غزل ان کے تخلیقی جوہر کی خصوصی مظہر ہے۔ ان کے بعض غزلیہ شعروں نے مجھے حزن و ملال کی کیفیت سے بھی دوچار کیا ہے مگر ایسی کیفیت کے اندر بھی اپنا ایک سرور ہوتا ہے۔ یہ سرور در سرور قسم کی کیفیت سے عبارت ہے۔ اس کی وضاحت نہیں ہو سکتی۔ میں نے حیدر کے جب یہ شعر پڑھے تھے تو میری آنکھیں بے اختیار نم ناک ہو گئی تھیں:

یہ ساری روشنی حیدرؔ ہے ماں کے چہرے کی　　کہاں ہے شمس و قمر میں جو نور خاک میں ہے

عشق اور نوکری مل کر دونوں چوس گئے ہیں تجھ کو　　تُو تو بس اب ایسے ہے جیسے گنے کا پھوگ

دوسرے شعر پر شاید کچھ اہلِ ذوق ناک بھول چڑھائیں، لیکن میں سمجھتا ہوں حیدر نے نچلے اور متوسط طبقے کی زندگی کے ایک عمومی پہلو کا اظہار دل میں اُتر جانے والے انداز سے کر دیا ہے۔ گنے کا پھوگ ایک ایسی مثال ہے جو میں نے پہلی بار ایک شعر میں دیکھی ہے۔ حیدر کے اور بھی کچھ اشعار ایسے ہیں جن کے متعلق میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ انھیں گنگنانے کو بے اختیار جی چاہا اور اکثر گنگناتا رہا:

منزلوں نے تو مجھے ڈھونڈ لیا تھا حیدرؔ　　پھر مرا شوقِ سفر مجھ کو چرا لایا تھا

خوشی حد سے زیادہ دے کے بھی برباد کرتا ہے　　انوکھے ہی ستم وہ صاحبِ ایجاد کرتا ہے

اور یہ شعر تو قیامت کا شعر ہے:

غم تمہارا نہیں جاناں ہمیں دُکھ اپنا ہے　　تم بچھڑتے ہو تو ہم خود سے بچھڑ جاتے ہیں

آج حیدر قریشی اپنا پہلا شعری مجموعہ دنیائے ادب کو دے رہے ہیں، میں اُن کے اس مجموعے کا خیر مقدم کرنے والوں میں بصد مسرت شامل ہوں!

(۱۹۹۱ء کی تحریر)

ڈاکٹر علی احمد فاطمی (الہٰ آباد)

حیدر قریشی کی غزلیہ شاعری کے امتیازات

۱۸۵۷ء کے انقلابات کے بعد شعر و ادب کی صورتِ حال اور اس کے تقاضے کچھ اس انداز کے ہوئے کہ کچھ بڑوں نے اپنے آپ کو صرف شعر و شاعری تک محدود نہ رکھا اور نثر نگاری، تنقید نگاری، انشائیہ نگاری، صحافت وغیرہ کو بھی زیرِ قلم لا کر ادب کی مقصدیت یا بامقصد ادب کی معنویت کی ایسی بنیاد رکھی کہ جس سے باقاعدہ ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ حالیؔ، شبلیؔ، آزاد وغیرہ ایسے اکابرینِ ادب میں سے ہیں جن کی ہمہ جہتی مختلف شعبہ ہائے ادب میں ان کی غیر معمولی کارکردگی نے ایک تاریخ مرتب کی۔ یہ سلسلے کچھ ایسے قائم ہوئے کہ جدید دور میں علی سردار جعفری، وزیر آغا، احمد ندیم قاسمی، محمد حسن، شمس الرحمٰن فاروقی، قمر رئیس، شمیم حنفی، رفعت سروش وغیرہ نے نثر، نظم، تخلیق، تنقید، غرضیکہ مختلف اصناف و شعبوں میں نہ صرف اپنی موجودگی درج کی بلکہ کار ہائے نمایاں انجام دیئے۔ اسی سلسلے کی کڑی ہیں حیدر قریشی، جو بنیادی طور پر شاعر ہیں اور عمدہ شاعر ہیں۔ شاعری کی مختلف اصناف پر تو طبع آزمائی کی ہی ہے اس کے ساتھ ساتھ افسانے بھی لکھے ہیں، انشائیے اور خاکے بھی، رپورتاژ اور سفرنامے بھی اور تحقیق و تنقید سے بھی رشتہ ہے اور ایک عمدہ و معیاری رسالہ کے مدیر بھی ہیں۔ اس مصروف دور میں قلم اور ذہن کا اتنی کثیر اصناف میں تقسیم ہونا اور الگ الگ زاویہ سے مسلسل کام کرتے رہنا ایک مشکل ہی نہیں پیچیدہ کام ہے۔ لیکن حیدر قریشی کی غیر معمولی محنت اور صلاحیت ان سب پر بیک وقت طبع آزمائی کرتی رہتی ہے اور تقریباً ہر شعبہ میں اپنا مناسب و معقول مقام و شناخت بھی رکھتی ہے۔ تاہم جیسا کہ عرض کیا گیا کہ وہ بنیادی طور پر شاعر ہیں اور وہ بھی غزل کے رومانی و عشقیہ شاعر، جیسا کہ انہوں نے خود کہا ہے ؎

خوشی کے لمحے لکھو، عمرِ اضطراب لکھو　　نکالو وقت کبھی عشق کا حساب لکھو

عشقیہ شاعری بظاہر خوشی کے لمحوں سے سرشار سمجھی جاتی ہے اور اس کا مرکز و محور جنس و جسم سمجھا جاتا ہے لیکن جو لوگ حقیقی عشق کی معرفت رکھتے ہیں ان کی پوری عمر اضطراب میں ہی گزرتی ہے، ایک صحت منداضطراب۔ اسی لیے ہمارے مقتدر شعراء نے اضطراب، رنج و غم کی بڑی قدر کی ہے اور اسے بڑی نعمت قرار دیا ہے، اس سے نہ صرف غم کی معرفت ہوتی ہے بلکہ حیات و کائنات کا عرفان بھی حاصل ہوتا ہے، نیز

تزکیۂ نفس کا موثر ذریعہ بھی ہاتھ آتا ہے اور نجاتِ دیدہ و دل کا بھی۔ اسی لیے ہمارے ایک شاعر نے کہا تھا ؎

دل گیا رونقِ حیات گئی　　غم گیا ساری کائنات گئی

یہ وہ مشکل منزل ہے جہاں سفلی جذبات اور پاکیزہ تخیّل کے درمیان مسلسل تصادم کی سی کیفیت رہتی ہے، جن فنکاروں نے دونوں کیفیتوں پر قابو پالیا یعنی عشقِ مجازی و عشقِ حقیقی باہم شیر و شکر ہو گئے تو عشقیہ شاعری لب و رخسار، بوس و کنار کی حدوں سے نکل کر انسانی آثار و آزار میں ڈوب کر حیات و کائنات کی سرحدوں کو چھونے لگتی ہے۔ لیکن عشقِ حقیقی یا عشقِ انسانی کی منزل تک پہنچنے کے لیے عشقِ مجازی یا عشقِ جسمانی بھی ضروری ہے، جو لوگ رومانی شاعری کو سرسری طور پر لیتے ہیں وہ اس راز کو سمجھ نہیں پاتے کہ جنس و جسم صرف دو بدن کا نہیں، دو آتماؤں کا اور دو تہذیبوں کا ملن ہوتا ہے۔ جہاں سے بقا و فنا کی منزلیں بھی شروع ہوتی ہیں اور شاعر آفاق کی ان منزلوں تک پہنچنے لگتا ہے جہاں ساری کائنات سے وہ عشق کرنے لگتا ہے اور محبوب محض ایک حوالہ بن کر رہ جاتا ہے۔ اگر آپ سلیقہ سے اپنے محبوب سے محبت نہیں کر سکتے تو دنیا سے بھی نہیں کر سکتے، اگر آپ مقامیت کا مفہوم نہیں سمجھ سکتے تو عالمیت کا راز سمجھنے سے بھی قاصر رہیں گے، کیونکہ بڑی شاعری مقامیت سے عالمیت تک کا سفر طے کرنے کا نام ہے۔

حیدر قریشی کی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو بادی النظر میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ بڑے مقصد سے دور ہلکی پھلکی رومانی شاعری ہے۔ مثلاً ؎

اب کے جدائیوں میں بھی رنگِ وصال ہے　　بے دَم ہوں میں اِدھر تو اُدھر وہ نڈھال ہے

ہم تو سمجھ رہے تھے کہ وقتی اُبال ہے　　اب ماننا پڑا کہ محبت وبال ہے

تمہارا عشق بھی ہم سے ادھورا رہ گیا جاناں　　جہاں میں ہم سے حالانکہ یہی اک کام ہونا تھا

تمہارے عشق میں کس کس طرح خراب ہوئے　　رہا نہ عالمِ ہجراں، نہ وصل یاب ہوئے

اس نوع کے متعدد اشعار ایک عام قاری کی نظر میں محض عشقیہ رنگ کے معمولی سے اشعار لگ سکتے ہیں۔ لیکن ان کی تہوں میں اتریئے، اس کی کیفیت و معنویت میں داخل ہوئیے تو محبت کو وقتی اُبال سمجھنے والے لوگوں کے لیے ایک درس ہے کہ سچا عشق وہ معرکۂ جاں ہے کہ ایک سچا عاشق بھی بہ آسانی اس کے مکمل تقاضے پورے نہیں کر سکتا، حالانکہ اس کا دعویٰ ہے کہ جہاں میں اس کا وجود صرف عشق کرنے کے لیے ہی ہے۔ عشق، تصورِ عشق یا معاملاتِ عشق کو سرسری یا ہلکے طور پر لینے والوں کو اس کا علم ہونا چاہیے کہ اس جہان میں خرابی زیادہ ہے لیکن اس خرابی میں ہی مضمر ہے تعمیر کی دنیا، فکر و خیال کی دنیا۔ اس راستے پر چلتے چلتے سچا عاشق، سچا شاعر ایک ایسی دنیائے لامکان میں داخل ہو جاتا ہے جہاں دنیا، آوازیں، شکست و فتح سب بے معنی سے لگنے لگتی ہیں۔ اب ذرا یہ اشعار ملاحظہ کیجیے ؎

وسعت میں لامکاں کی اب کھو چکا ہوں میں　　کس نے فصیلِ وقت سے آواز دی مجھے

میں منزلوں کی کھوج میں خود سے بچھڑ گیا　　پھر عمر بھر تلاش ہی اپنی رہی مجھے

حقیقتوں کے سرابوں میں کھو چلا ہوں میں　　یقیں دلاؤ مجھے بدگمانیوں کی طرح

پھر ایک منزل یہ بھی آتی ہے ؎

اس طرح شہرِ انا پر میں تباہی مانگوں　　اپنے ہونے سے نہ ہونے کی گواہی مانگوں

میں اپنے ہونے کے احساس سے ہراساں ہوں　　مِرے شعور میں کچھ کیفِ بےخودی بھر دو

جب منزل ہونے اور نہ ہونے تک پہنچ جائے تو تشکیک کی یہ منزل ہی حقیقتوں کی تلاش جاری رکھتی ہے۔ اور پھر شاعر ایک ایسی دنیا میں پہنچ جاتا ہے جہاں حقیقت اور غیر حقیقت، وجود و عدم وجود، فنا و بقا کی صورتیں اس کی دنیائے فکر خیال کا فلسفہ بن جاتی ہیں اور گوشت پوست کا معشوق محض ایک ذریعہ اور زاویہ ہوتا ہے، کلیہ نہیں۔ چند اشعار اور دیکھئے ؎

ایک اَن دیکھے کی سوچوں میں گھرا رہتا ہوں میں　　اُس کی آنکھیں، اُس کا چہرہ سوچتا رہتا ہوں میں

خواہشوں کی تتلیوں کے ساتھ اُڑتا ہوں مگر　　وسوسوں کے سامنے بے دست و پا رہتا ہوں میں

تم نے کبھی زخموں کے نگینے نہیں دیکھے　　عشّاق کے دہکے ہوئے سینے نہیں دیکھے

سامنے ہے گھر مگر مفقود گھر کے راستے　　کھو گئے آخر کہاں معبود گھر کے راستے

دشتِ حیرت میں کھڑا ہوں چشمِ حیرت وا کیے　　ہیں ابھی غائب، ابھی موجود گھر کے راستے

شاعری صرف عشق و محبت کا نام اور عشق و محبت صرف لب و رخسار اور بوس و کنار کا نام نہیں۔ اچھی بات یہ ہے کہ زندگی کی تگ و دو، جد و جہد، دربدری نے حیدر قریشی کو اس بات کا احساس دلا دیا ہے کہ تخلیقی عمل ایک ایسا مقدّس یا با مقصد عمل ہے جس سے صرف اپنی ذات وابستہ نہیں ہوتی بلکہ حیات و کائنات کے در کھولتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں ذات صرف حوالہ ہے ورنہ اس میں موسم، چمن، گھر، شہر، اہلِ ستم، کعبہ، صنم وغیرہ سب کچھ ملے گا اور اپنی مکمل انسانی اور سماجی معنویت کے ساتھ اور یہ کیفیت و خصوصیت شاعری کی پہلی ہی منزل پر ہے۔ میں نے ابھی تک ان کے جتنے بھی اشعار پیش کیے ہیں وہ ان کے پہلے شعری مجموعہ ''سلگتے خواب'' سے ہیں۔ ''عمرِ گریزاں'' سے لے کر بعد کا سفر ظاہر ہے کہ سنجیدگی اور پختگی کے اعتبار سے آگے کا سفر ہے، جہاں ان کی تہہ داری، فکر انگیزی اور معنی آفرینی کی ترقی یافتہ صورتیں واضح طور پر دکھائی دیتی ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ بعد کے دور میں حیدر قریشی نے عشقیہ شاعری ترک کر کے محض فلسفیانہ شاعری ہی کی ہو۔ عشق کی آگ اور اس کا جنون اپنے رنگ ضرور بدلتا ہے لیکن تا دمِ حیات پیچھا نہیں چھوڑتا، اور عشق کا درد جیسے جیسے بڑھتا ہے دردمندی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے ؎

درد جتنا بھی ترے در سے عطا ہوتا گیا — کاسۂ دل دردمندوں کا دعا ہوتا گیا
پھر مری شہ رگ سے بھی آتا گیا نزدیک تر — مجھ سے کیا بچھڑا ہے وہ گویا خدا ہوتا گیا
گونج اُٹھیں گنبدِ جاں میں مری تنہائیاں — کوئی خط خاموش لفظوں سے صدا ہوتا گیا
جس قدر ہوتا گیا اُس کی محبت کا اسیر — ذات کے زندان سے حیدؔر رہا ہوتا گیا

ایک طرف محبت کے حوالے سے ذات کے زنداں سے رہا ہونا دوسری طرف گنبدِ جاں کی تنہائیوں کا گونجنا اور پھر محبوب کا خدا ہوجانا اور وہ بھی ہجر کی صورتوں میں۔ یہ عشق کی ایسی منزل ہے جو طویل ریاضت، عبادت، جنون اور حکمت کے بعد آتی ہے۔ جہاں دنیا پہلے تو آنکھوں سے دیکھی جاتی ہے اس کے بعد روح میں اُتر جاتی ہے۔ محبت اور محبوب کی حقیقت سب کچھ وسعت پا کر کونین پر چھا جاتی ہے۔ یہ غزل دیکھیے۔

یونہی دیکھا تھا جسے چشمِ تماشائی سے — اب نکلتا ہی نہیں رُوح کی گہرائی سے
اہلِ دنیا بھلا اِس رَمز کو کیسے سمجھیں — عشق رُسوا نہیں ہوتا کبھی رُسوائی سے
جسم بھی اپنی جگہ زندہ حقیقت ہیں مگر — دل نہیں ملتے فقط جسموں کی یکجائی سے
مرحلے آئے تھے خوف اور گنہ کے پہلے — روشنی گیان کی پھر پھُوٹی تھی تنہائی سے
بے لحاظی کا کسے دُکھ نہیں ہوتا حیدؔر — ہم نے شکوہ نہ کیا پر کسی ہرجائی سے

اس منزل پر پہنچتے پہنچتے فکر کی بلندی، خیال کی نزاکت، غزل کے اسرار و رموز حیدر قریشی کی غزل گوئی کے وہ امتیازی اوساف بن جاتے ہیں جہاں حقیقت اور رومانیت، کلاسیکیت اور جدیدیت، مقامیت اور عالمیت اور ان سب پر غالب ایک مخصوص شاعرانہ کیفیت نے ان غزلوں کو لائقِ مطالعہ ہی نہیں بلکہ عہدِ حاضر کا ایک رزمیہ بنا دیا ہے جس کا پُر شوق مطالعہ ایک نئی جمالیاتی دنیا میں لے جاتا ہے۔ جہاں زمان و مکاں ماضی و حال باہم مدغم ہو کر غزلیہ شاعری کی ایک ایسی لَے اور ایک ایسا آہنگ بن جاتے ہیں جہاں شاعری صرف ادب ہی نہیں بلکہ فکر و فلسفہ، تاریخ و تہذیب کا روپ اختیار کر لیتے ہیں۔ بعض اشعار تو ایسے ہیں جن کی معنویت و مقصدیت کا دائرہ پھیل کر قوسِ قزح کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔ ایک آفاقی معنویت کا علمبردار۔ چند اشعار اس لب و لہجہ کے ملاحظہ کیجیے۔

عشق کی دنیا کے اَن دیکھے نگر رہتے ہیں — عمر تھوڑی سی ہے اور اتنے سفر رہتے ہیں
جو دل میں کشمکشِ نیک اور بد نہ رہے — لہو کی لہروں میں پھر کوئی جزر و مد نہ رہے
یہی تذبذب و تشکیک اب سند ٹھہرے — سند سمجھتے تھے جن کو وہ مستند نہ رہے
درد و غم سے اسے نکھارتا ہے — عشق انسان کو سنوارتا ہے

انتہائے تیرگی سے ہوگیا سورج طلوع — پیاس اتنی بڑھ گئی کہ خود سمندر ہوگئی
کھوج رہے تھے روح کو جسموں کے رستے سے — طور طریقے پاگلوں والے کر رکھے تھے
جو بس میں ہے وہ کر جانا ضروری ہوگیا ہے — تری چاہت میں مر جانا ضروری ہوگیا ہے

کبھی میر تقی میؔر نے کہا تھا۔ — عاشق سا تو سادہ کوئی اور نہ ہوگا دنیا میں
جی کے زیاں کو عشق میں اس کے اپنا وارا جانے ہے

عشق اور جنون کی یہی وہ منزل ہے جہاں شاعر سود و زیاں سے بہت اُوپر اُٹھ کر عالمِ دیوانگی میں کشف و وجد کی ایسی منزل پر آ کھڑا ہوتا ہے جہاں سب کچھ حقیر سا لگنے لگتا ہے اور حیات و کائنات سے متعلق بہت سارے سوالات اپنے آپ جنم لینے لگتے ہیں۔ بڑی شاعری اکثر سوالات ہی قائم کرتی ہے۔ دیوانِ غالبؔ کا پہلا مصرعہ ''نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا''۔۔۔ اقبالؔ نے بھی کہا تھا:
''زندگی کا راز کیا ہے، سلطنت کیا چیز ہے'' شاعری جب ایسے فلسفیانہ سوالات میں گم ہوتی ہے تو پیغمبری کے راستے پر چلنے لگتی ہے اور ہر بڑا سنجیدہ شاعر سوالات ہی قائم کرنے لگتا ہے اور ان سوالوں کے ذریعہ دنیا اور انسانوں کو سمجھنے و سمجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ ہماری شاعری کی ایسی سنجیدہ اور بڑی روایت ہے جو ہر شاعر کے حصہ میں نہیں آتی ہے جب تک کہ پوری سنجیدگی اور سپردگی کے ساتھ دنیا سے رشتے نہ جوڑے جائیں فکر و فن کے معیاری آداب نہ سمجھ لیے جائیں۔

خوشی کی بات ہے کہ حیدر قریشی کی شاعری میں ایسے سوالات کثرت سے کبھی بالائی سطح پر اور کبھی زیریں سطح پر دکھائی دیتے ہیں جس سے غزل کا مزاج و مذاق سنجیدہ و معیاری ہو جاتا ہے۔ اگر انہیں صورتوں میں غزل کی زبان اور اس کے اسلوب پر بھی قدرت ہو تو رمزیت و اشاریت، جمال و جلال، سوال کا اٹوٹ حصہ بن کر شاعرانہ اقدار اور انسانی افکار کی لازوال صورتوں میں ڈھل جاتے ہیں۔ اور پھر مشقِ سخن اور فکرِ مسلسل کا امتزاجی و انجذابی رویہ ایک ایسی وحدت میں ڈھل جاتا ہے جہاں حرف و لفظ کا اسلوب بھی شاعر کے فکری لب و لہجہ میں ڈھل کر ایک ایسی راہ اختیار کر لیتا ہے جس کی منزلِ مقصود پیغمبری کے علاوہ کچھ نہیں۔ میں اب حیدر قریشی کی دو غزلوں کے چند اشعار پیش کر کے اپنی بات اختتام تک پہنچاتا ہوں۔ ایک غزل وہ ہے جہاں اس نوع کے سوالات ہیں۔

عروج کیا ہے، زوال کیا ہے — خوشی ہے کیا اور ملال کیا ہے
یہ گردشِ ماہ و سال کیا ہے — زمانے! تیری یہ چال کیا ہے
ہوس تو بے شک ہوس ہی ٹھہری — پہ جستجوئے وصال کیا ہے
ہے دل کوئی بے کنار صحرا — کہ آرزوؤں کا جال، کیا ہے

حقیقتیں تو فریب نکلیں   جہانِ خواب و خیال کیا ہے
خدا ہے مشکل کشا تو حیدؔر   کوئی بھی کارِ محال کیا ہے

اس غزل میں صرف سوالات نہیں ہیں بلکہ کائنات کے وہ آثار و آزار ہیں جن سے ایک سنجیدہ شاعر ہمہ وقت دست و گریباں رہتا ہے۔ کرب و انتشار میں مبتلا رہتا ہے۔ اب یہ اس کا کاملِ فکر و فن ہے کہ انتشار کو انبساط اور کرب کو حظ میں تبدیل کر کے اسے ایک ایسی منزل پر لا کھڑا کرے جس سے امید و نشاط کی کرن پھوٹ پڑے۔ بڑی اور بامقصد شاعری کا یہی کمال ہوا کرتا ہے۔ حیدر قریشی کا کشف و وجد، علم و ہنر اور ان کا شاعرانہ کمال اسی منزل پر آ پہنچا ہے جہاں وہ کہنے پر مجبور ہیں ؎

اندر کی دنیائیں مِلا کے ایک نگر ہو جائیں   یا پھر آؤ مل کر ٹوٹیں اور کھنڈر ہو جائیں
ایک نماز پڑھیں یوں دونوں اور دعایوں مانگیں   یا سجدے سے سر نہ اٹھیں یا لفظ اثر ہو جائیں
خیر اور شر کی آمیزش اور آویزش سے نکھریں   بھول اور توبہ کرتے سارے سانس بسر ہو جائیں
ہم ازلی آوارہ جن کا گھر ہی نہیں ہے کوئی   لیکن جن رستوں سے گزریں رستے گھر ہو جائیں
ایک گنہ جو فانی کر کے چھوڑ گیا دھرتی پر   وہی گنہ دوبارہ کرلیں اور اَمر ہو جائیں
صوفی، سادھو بن کر تیری کھوج میں ایسے نکلیں   خود ہی اپنا رستہ، منزل اور سفر ہو جائیں

زندگی کے شب و روز، جد و جہد، دربدری، مادی آسودگی کی کھوکھلی صورتیں بظاہر عمر کو لاحاصل بنا دیتی ہیں لیکن فن اور فنکار اسی سلسلۂ لاحاصل میں منزلِ حاصل تلاش کرتا رہتا ہے۔ حیدر قریشی کا یہ سفرِ مسلسل اور یہ شعری سرمایہ عمرِ گریزاں کی تگ و دو اور غم شناسی کا یہ عمل شعر و سخن کی ایک ایسی دنیا میں لا کھڑا کرتا ہے جہاں افکار و اقدار ہی حقیقت ہیں باقی سب خواب، ایک ہیولیٰ، ایک دھند۔ اچھی بات یہ ہے کہ حیدر قریشی امکان اور عرفان کی اس منزل پر آ گئے ہیں جہاں سے بڑی شاعری اپنے راستے ہموار کرتی ہے۔ کسی عمدہ شاعری میں بڑی شاعری کے امکانات پیدا ہونے لگیں اور اس کے درِ فکر و معنی وا ہونے لگیں، اس میں گہری معنویت اور امکانی وسعت پیدا ہونے لگے تو پھر راستے خود بخود ہموار ہونے لگتے ہیں۔ یہ کم بڑی بات نہیں۔ دیارِ غیر اور ایک غیر ادبی ماحول میں جس طرح وہ شعر و سخن، ادب و تہذیب سے جذباتی و فکری انداز سے وابستہ ہیں اور جس سچی لگن، محبت و محنت سے سعیٔ مسلسل میں مصروف و مشغول ہیں، یقین ہے کہ حیات و کائنات کا عرفان و ادراک انہیں ایک ایسی منزل پر لا کھڑا کرے گا جہاں منزل خود انہیں آواز دے گی۔ تب ان کے خوابوں کو حقیقت کی ایسی تعبیر مل جائے گی جو انسانیت کی تقدیر بن جائے گی۔ ایک ایسا نروان جو آدمی کو مکمل انسان بنانے کے لیے کافی ہوا کرتا ہے۔ ☆☆

منزلوں نے تو مجھے ڈھونڈ لیا تھا حیدؔر   پھر مِرا شوقِ سفر مجھ کو چُرا لایا تھا

نسرین نقاش (سری نگر)

حیدر قریشی کی تازہ غزلیں

حیدر قریشی عصرِ حاضر کے نہایت اہم فنکار اور پختہ گو شاعر ہیں۔ ان کے چار شعری مجموعوں کے مجموعہ ''غزلیں، نظمیں، ماہیے'' کی اشاعت کے بعد بھی ان کی شاعری رواں دواں ہے۔ آپ ایسے جہاندیدہ شاعر ہیں جنھوں نے دنیا کے گرم و سرد کو بھگتا ہے۔ ذاتی تجربات و مشاہدات کا ایک سرمایہ ان کے پاس ہے جو ان کے فن کو جلا بخشتا ہے۔ ''غزلیں، نظمیں، ماہیے'' کی اشاعت کے بعد سے اب تک ان کی جو غزلیں میرے مطالعہ میں آئی ہیں۔ اس وقت ان کے حوالے سے کچھ بات کروں گی۔

دودھ بدن ہے وہ تو مصری کوزہ ہم   سو اب اس کے عشق میں گھلنے والے ہیں
وصل کی شب تھی اور اجالے کر رکھے تھے   جسم و جاں سب اس کے حوالے کر رکھے تھے
ہوس تو بے شک ہوس ہی ٹھہری   پہ جستجوئے وصال کیا ہے
طے ہو گیا اک وصل سفر اور مکمل   یہ چوٹی بھی اب ہو گئی سَر اور مکمل
ایک خوشخط سے شخص نے حیدؔر   ہم کو بھی خوش خیال کر ڈالا

غزل کے لغوی معنی عورتوں سے گفتگو کرنا ہے۔ حیدر قریشی شاعری کی اس بنیادی صفت کو نظر انداز نہیں کرتے۔ وہ حسن و عشق کے آپسی معاملات، وصل و فراق، وفا و جفا، بدگمانیاں اور دل شکنیاں جو ہر عاشق کا مقدر ہیں، ان سے خود بھی ہمکنار ہیں، اسی لیے اپنے جذبات و احساسات میں حقیقت کے رنگ بھر دیتے ہیں ؎

اندر کی جانب اور بھی اندر سفر کیا شروع   ازلی مسافروں کو جب اس نے قیام لکھ دیا
معافی مانگنا پھر بعد میں خلوص کے ساتھ   گناہ کرنا خشوع و خضوع سے پہلے
کون انگڑائی سی لیتا ہے نفس کے اندر   لذتِ وصل مہکتی ہے ہوس کے اندر
واقفیت ہے ان سے اپنی برسوں کی   دکھ تو ہمارے ملنے جلنے والے ہیں

آخر الذکر شعر میں دکھ علامت سے بڑھ کر خود ایک کردار کی صورت میں عالمِ وجود میں آ گیا ہے۔

حیدر قریشی کی زبان سادہ، لہجہ فطری اور اظہار بیان پُر سلیقہ ہے۔ اُن کے یہاں جو اُن کی فکر میں بلندی و بالیدگی اور جذبے میں شدت پائی جاتی ہے وہ ان کی شاعری میں فکر و جذبے کا ایک خوبصورت سنگم بن جاتا ہے۔ وہ نفسِ مضمون کو شعری پیکر میں ڈھالتے وقت علامات و استعارات اور تشبیہات کا استعمال

کرتے ہیں۔وہ معنویت اوراشاریت کو بروئے کار لاکراپنے شعروں میں چمک پیدا کر دیتے ہیں۔

تم نے وہ منظر ہی کب دیکھے ہیں، جب — دردسمندر، دل دریامیں گرتے ہیں
درختوں پر پرندے لَوٹ آنا چاہتے ہیں — خزاں رُت کا گزر جانا ضروری ہوگیا ہے
سیاہِ شب نے تو اندھیر کردیا تھا بہت — سوآگیا ہوں میں وقتِ طلوع سے پہلے
یہ عیدآئی ہے کس قتل گاہ میں حیدرؔ — سلام پھیر لیا ہے رکوع سے پہلے
آنکھیں اس کی بھی ہیں اب برسات بھری — حیدر میل دلوں کے دھلنے والے ہیں

اسرارِ کائنات اور فطرت کے تقاضے کئی مقامات پر انسان کو حیران و ہراساں کرتے رہتے ہیں۔زندگی کیا ہے؟،موت کیا ہے؟ گردشِ وقت اور قسمت کیا ہیں؟اس قسم کے بے شمار سوالات انسان کو مضطرب کرتے رہتے ہیں۔ایک شاعراور سوچنے والا ذہن رکھنے والا ایسے اہم سوالات کو کیونکر نظر انداز کر سکتا ہے۔حیدر قریشی بھی ایسے سوالات سے دوچار ہوتے ہیں اور پھر بے اختیار کہہ اٹھتے ہیں۔

عروج کیا ہے، زوال کیا ہے — خوشی ہے کیا اور ملال کیا ہے
یہ گردشِ ماہ وسال کیا ہے — زمانے! تیری یہ چال کیا ہے
سوال جو اتنے کر رہے ہو — تمہارا اصلی سوال کیا ہے

حیدر قریشی کے یہاں یک رُخی شاعری کی حد قایم نہیں ہوتی، انسانی زندگی سے وابستہ لگ بھگ سبھی مسائل ان کی شاعری میں موجود ہیں۔آفاقی قدروں کا حامل یہ شاندار فنکار اور دردمند شاعر کسی بانکے شہسوار کی طرح میدان شعروادب میں مسلسل آگے بڑھ رہا ہے۔شعری تخلیق کی نئی نئی منزلیں اس کا مقدر بنتی جا رہی ہیں۔

نئے زخموں کا حق بنتا ہے اب اِس دل پہ حیدرؔ — پُرانے زخم بھر جانا ضروری ہوگیا ہے
کُن کا اک لفظ اسیروں پہ کہیں سے اترا — آسماں ہو گئے تخلیق قفس کے اندر
اک روح کہ سونا ہے مگر مَیل بھری بھی — اک آگ اسی مَیل کو دھونے کے لئے ہے
آنکھوں میں ابھی دھول سی لمحوں کی جمی ہے — دل میں کوئی سیلاب سا رونے کے لئے ہے
بن جاتا تریاق اسی کا زہر اگر تم حیدرؔ — کوئی آیت پیار کی پڑھتے اور اس پر دَم کرتے

☆☆

”آپ کی غزلوں کا معیار اتنا اچھا ہے کہ مجھے یقین ہے کہ اگر اہلِ وطن نے چند روز کے لئے بھی اپنے تعصّبات کو سلا دیا تو وہ ان کی تعریف کرنے پر خود کو مجبور پائیں گے“ (مکتوب **ڈاکٹر وزیر آغا** بنام حیدر قریشی۔تحریر کردہ ۲۸/مئی ۱۹۹۱ء بحوالہ **حیدر قریشی کی ادبی خدمات** ص ۴۰۔۴۱)

احمد ہمیش (کراچی)

حیدر قریشی کی نظمیں

حیدر قریشی جس جرمنی میں رہتے ہیں، وہیں کا ایک بڑا شاعر(۱) ہولڈرلن ہوا کرتا تھا۔ہولڈرلن نے ایک موقع پر کچھ یوں کہا تھا کہ شاعر آسمانی بجلی سے جل جاتا ہے یا آسمانی بجلی شاعر کو جلا دیتی ہے۔بات تو ایک ہی ہے مگر اس میں مضمر رمز خالص جذبی وحسی ہے۔جس کسی نے طوفانی بارش کے دوران گرج چمک اور کڑک کے ساتھ آسمانی بجلی کو زمین پر گرتے بلکہ کسی پیڑ پر گر کے اُسے خاکستر کرتے دیکھا ہو وہ آسمانی بجلی اور پیڑ کی مطابقت سے شاعری اور شاعر کے درمیان تعلق کی صداقت کا تصور کرتا ہے۔

ہر چند کہ حیدر قریشی نے صنفِ شاعری کی ہر فارم خاص طور پر غزل، نظم اور ماہیے میں اپنی علیحدہ پہچان بنائی۔تاہم اُن کے پانچ شعری مجموعوں میں سے تین مجموعوں ”عمرگریزاں“، ”دعائے دل“ اور ”دردسمندر“ میں نظمیں شامل ہیں اوران مجموعوں میں سے منتخب کی گئی نظمیں قاری کو متوجہ کرتی ہیں۔

حیدر قریشی پاکستان سے جرمنی کن حالات میں گئے !وثوق سے کچھ کہا نہیں جا سکتا۔تاہم ان کی نظموں پر ایک نظر کرتے ہوئے کون اندازہ کر سکتا ہے کہ اُن کی عمر کا کون کون سا حصہ گریزاں تھا!یا کہیں اُن کی اب تک کی گریزاں عمر ایک سرے سے ہی گریزاں ہو، درمیان میں کہیں کچھ چھوٹ گیا ہو یا جگہ بھرنے کے لئے خالی رہ گیا ہو!اس سب کے پیش نظر آسانی سے کوئی ورڈکٹ (Vardict) نہیں دیا جا سکتا۔یہ ضرور ہے کہ انہوں نے ”عمرِ گریزاں کی نظمیں“ کے عنوان سے جو نظمیں خلق کیں، اُنہیں اُن کے اسلوبِ شعری اور کیفیتِ نزول کی اساس پہ موضوع کیا جا سکتا ہے۔

زیرِ نظر نظموں میں سے پہلے شروع کی تین نظموں ”خطا“، ”درد“ اور ”ایک اداس کہانی“ کو ایک معنوی لڑی (SPECTRUM) میں موضوع کیا جائے تو تصویری وحدت ”ایک اداس کہانی“ میں مرکوز ہوتی ہے، اس طرح کہ جو دُھند عمرِ گریزاں کی یادوں سے ترکیب ہو کے آنکھوں کے چارسو پھیلی ہے وہ نظم ”خطا“ میں مذکور دل اور آنکھوں میں بسنے والے حسن سے بچھڑ کے عاشق کے مقدر کے خلاف بنے ہوئے سفاک سناٹے سے منسلک ہے۔جب کہ نظم ”درد“ میں شاعر کے تصورِ عشق کی توثیق درد کے رشتوں سے

(۱) ”ڈیزائن“ کے فلسفہ کا محرک جرمن فلسفی ہیڈیگر ہولڈرلن کی شاعری کا بہت دلدادہ تھا۔

ہوتی ہےاوران سب کے معنی نظم ’’اداس کہانی‘‘ میں حسرتِ ناتمام کے موڑ پہ کچھ یوں واضح ہوتے ہیں:

مگر کانوں میں سارے منظروں کی
مدھر بھری جھنکار اور چہکار کی صورت
رگِ جاں تک اُترتی ہے،لہو میں بولتی ہے
روح میں رس گھول دیتی ہے
مگر دل میں نہیں آتی
کہ دل کے دیس میں آنے کے سارے راستے
آنکھوں سے آتے ہیں

مگر اس کو کیا کیا جائے کہ حیدرقریشی کے دل کا دیس بہت دور بساطِ نظر سے اوجھل ہے جس کی صورتِ حال اس حد تک مختلف ہے کہ نظم ’’پھاگن کی سفاک ہوا‘‘ تک آتے آتے آسمانی بجلی پیڑ پر گر چکی ہے، یہ پیڑ ہی تو شاعر کا وجود ہے۔معلوم یہ ہوا کہ شاعری آسمانی بجلی ہے اور شاعر کا وجود پیڑ ہے۔تاہم پیڑ کا خاکستر ہونا تخلیقی وجود کا جواز ہے اور اس سے منسلک ہے درد کے رشتے:بیوی،شعیب ،عثمان ،ٹیپو،مانو،رضوانہ......یہ رشتے شاعر کے گم شدہ بچپن کے رشتے ہیں لیکن گم شدہ بچپن کی یادوں کے حوالہ سے درد کے رشتوں کو اسم دینے پر اکتفا نہیں کیا گیا۔جمالیاتی نظام میں کھوئے ہوئے رشتوں کی بھی بازیافت ہوتی ہے۔مثلاً ’’تمہارے لئے ایک نظم‘‘ کی ان سطروں پر ایک نظر کیجئے:

طلسمِ حرف کے جو اسم بھی ہیں
سب تمہاری آنکھ کے جادو میں بستے ہیں
مرے مفہوم اور معنی تمہاری روح میں پنہاں
تمہیں پانے کی خواہش
صرف خواہش ہی نہیں جاناں!
مجھے اپنے ادھورے پن کی تکمیل کرنی ہے

اس ادھورے پن کی تکمیل کے لئے ’’جاناں‘‘ سے مخاطب ہوتے ہوئے طلسمِ حرف کے اسرار سکھانے اور ہاتھوں میں ہاتھ دے کے نزدیک آنے کے لئے اظہارِ تمنا کے باوجود عمرِ گریزاں حائل نظر آتی ہے۔’’چاند کی تسخیر کے بعد‘‘،’’میں آنسوؤں کا گلا گھونٹ دوں گا‘‘،’’نصف سلور جوبلی‘‘،’’صدا کا سمندر‘‘،فاصلوں میں ملاپ‘‘،’’منی پلانٹ‘‘،’’محبت کا خدا‘‘،’’حاصلِ زندگی‘‘،’’بہار کے بھلے دن‘‘،’’عجیب دشمن‘‘،’’دعائے دل‘‘،’’بے فیض موسم کا دکھ‘‘،’’ایک درواڑ کا پیغام‘‘،’’ہوا‘‘،’’دعا

گزیدہ‘‘، قیامت‘‘،’’ایک خواہش کی موت‘‘،’’سرسوں کا کھیت‘‘اور’’تخلیق در تخلیق‘‘میں حیدرقریشی کے دل کے دیس سے فاصلہ حائل کا کرب محسوس ہوتا ہے۔البتہ’’دعائے دل‘‘ کی نظمیں کے عنوان سے کچھ متفرق نظمیں’’نئی شالاط‘‘اور’’دعا‘‘بلکہ دردِسمندر کی نظمیں کے عنوان سے’’چلو ایک نظم لکھتے ہیں‘‘اور محبت کا ایک یادگار دن‘‘میں حیدرقریشی کا تصورِ حسن صدیوں کی کہانیوں کو سمیٹے ہوئے ہے:

وہ شہد اور زہر میں گوندھے ہوئے
سوئے ہوئے سارے زمانے جاگ اٹھے ہیں
ہماری داستاں تو داستاں در داستاں کا سلسلہ ہے

جب کہ’’دردِسمندر‘‘ کی منفرد ترکیب حیدرقریشی کے شعری اسلوب کی مہرِ استناد ثبت کرتی ہے۔کون نہیں جانتا کہ اپنی جنم جات مٹی یا اپنے جنم جات دیس کو چھوڑ کے غیر ملکوں کا رُخ کرنے والوں کو معاشیات لے جاتی ہے۔مگر حیدرقریشی کے شعری نظام سے تو یہ انکشاف ہوا کہ وہ اپنی روح تو اپنے دل کے دیس میں چھوڑ گئے۔ذرا’’محبت کا ایک یادگار دن‘‘ کی ان سطروں میں جھانک کے دیکھئے:

خوابوں بھری کیا رات تھی،تعبیر جن کی ساتھ تھی
اور پھر اسی تعبیر میں،لے کر قلم تقدیر سے
سارے زمانوں سے بھرا وہ ایک دن
میرے ہی نام لکھ دیا/راہِ فنا میں عشق نے دل کو دوام لکھ دیا

سفر خواہ سارے زمانوں کا ہو یا ایک دن کا ہو......وہ ناتمام ہوتا ہے اور عشق کی راہ میں توقع ایک ان دیکھی ڈور کی طرح ہوتی ہے جسے عاشق شاعر تھامے ہوئے چل رہا ہوتا ہے،منزل کی تمنا سے بے نیاز!



حیدرقریشی کی نظموں کو پڑھ کر مجھے یہ اندازہ بھی ہوا ہے کہ کثیر المطالعہ فنکار ہیں اور کئی علوم مفیدہ پر گہری نظر رکھتے ہیں جن کا مجموعی اثر ان کی تخلیقی صلاحیت پر ایک فلسفی جیسے ہوش مندو باشعور شاعر کی صورت میں جاں گزیں ہے۔۔۔۔۔میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ حیدرقریشی کی نظمیں سطحی جذبہ احساس اور ہلکے پھلکے تفکر کی پروردہ نہیں بلکہ ان کی تفہیم کے لیے قاری کا بھی خاصا پڑھا لکھا ہونا ضروری ہے۔یہ بڑے امکانات کی شاعری ہے اور میرا مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ حیدرصاحب کو ایسی اعلیٰ ادب آموز و خیال افروز نظموں کی تخلیق پر مزید توجہ دینی چاہیے۔بڑی بے تکلفی اور بڑی بے ساختگی سے انہوں نے انگریزی الفاظ کو بھی اپنے ماضی الضمیر کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔

(اقتباس از مضمون’’حیدرقریشی کثیر الجہات شاعر‘‘از **پروفیسر آفاق صدیقی**
بحوالہ کتاب **حیدر قریشی کی ادبی خدمات**،ص۱۳۸۔مرتب پروفیسر نذر خلیق)

شگفتہ الطاف (بھاولپور)

حیدر قریشی کی ماہیا نگاری

میتھیو آرنلڈ نے ادب کو تنقیدِ حیات کہا ہے۔ دراصل ادب کی تمام تر اساس انسانی زندگی کے پیچ وخم اور تجربات سے مزین ہوتی ہے۔ انہی تجربات کے مختلف نتائج واثرات کو اکٹھا کریں تو کوئی نہ کوئی ادب پارہ تخلیق پاتا ہے۔ جسے تخلیق کار کی شخصیت کا آئینہ کہا جا سکتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ تخلیق کار کا رشتہ اپنی تخلیق کے ساتھ حقیقی محسوسات اور صداقت پر مشتمل ہو۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی کے بقول ''سچا ادیب وہی ہے جو مصنف کے دل ودماغ کی پیداوار ہو۔ ایسے ادب کے اوراق پر خود مصنف کی چھاپ موجود ہوتی ہے۔ اس لیے کسی تصنیف کو سمجھنے کے لیے پہلے مصنف کو سمجھنے کی ضرورت ہے کیونکہ تصنیف دراصل مصنف کے مزاج کا پرتو ہوتی ہے۔'' [1]

گویا اپنے معاشرے اور اپنی روایت سے جڑی ہوئی کسی بھی تخلیق کو اس کے تخلیق کار کے توسط سے سمجھا جا سکتا ہے۔ دیگر اصنافِ ادب کی طرح اردو ماہیے کا مزاج بھی اپنے معاشرے اور روایت کے ساتھ ساتھ تخلیق کار کے شخصی رنگ وآہنگ سے گھلا ملا ہوا ہے جس کے طفیل ماہیا نگار کے جذبات وتجربات اور اس کی شخصیت کو آسانی سے دریافت کیا جا سکتا ہے۔

یہ صنفِ سخن جو پنجابی زبان سے اردو ادب میں آئی ہے اپنے ساتھ پنپنے کی بے شمار وسعتیں بھی لائی ہے۔ قبل ازیں اگر چہ اس کے مزاج اور اس کے رویئے میں پنجاب اور پنجاب کے تہذیبی وثقافتی اثرات، معاشرتی روایات، یہاں کے لوک حوالے، لوک داستانیں اور لوک محاورے نشو ونما پاتے رہے ہیں لیکن اردو زبان کی شیرینی اور اس زبان کی طلسماتی آغوش نے اس صنفِ سخن کا رنگ وروپ ایسا نکھارا ہے کہ اب اس کا جمال مایوں بھیگی دلہن کے روپ کو بھی شرمانے لگا ہے۔

''اردو ماہیے'' پر اردو زبان کا ایک بڑا احسان یہ بھی ہے کہ اس زبان نے اسے علاقائی حدود وقیود کی پناہوں سے نکال کر وسعتوں کے افق پر عالمی ادب کے روبرو کھڑا کر دیا ہے اور بہت سے

جدت پسند اور ادب پرور شاعروں نے اپنی سرپرستی کا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا ہے انہی شعرا کی فہرست میں ایک روشن نام حیدر قریشی کا ہے۔ حیدر قریشی نے نہ صرف اردو ماہیے کا بھرپور استقبال کیا ہے بلکہ اس کی محققانہ نظر نے اس صنفِ ادب کی فنی حیثیت، عروضی جائزے اور اس صنفِ کے موجدِ اول کی دریافت کا بھی جائزہ لیا ہے۔

حیدر قریشی کی ادبی شخصیت کو پرکھا جائے تو اسے مختلف الجہت شخصیت کا نام دیا جا سکتا ہے۔ حیدر قریشی نے اگر چہ تحقیق اور نثر میں بھی اپنے قلم کے جوہر دکھائے ہیں لیکن شعری اصناف میں غزلیں۔ نظمیں اور ماہیے حیدر قریشی کے خاص میدان ہیں جن میں ''ماہیے'' سے حیدر قریشی کی خصوصی رغبت کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ گزشتہ چند دہائیوں میں جو تحریک اردو ماہیے کے حوالے سے پروان چڑھی ہے اس میں اردو ماہیے کو فروغ دینے والوں میں اہم ترین نمایاں نام حیدر قریشی کا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ حیدر قریشی اس عوامی صنف کو اردو زبان کی رنگت اوڑھے نئے اسالیب اور نئے رنگ وآہنگ کے ساتھ عوام الناس میں پھولتا پھلتا دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس رغبت میں جہاں حیدر قریشی کی موزوں شعری طبعیت نے بہت سے خوبصورت ماہیے تخلیق کیے وہاں فکری اعتبار سے ماہیے کی ہئیت' مزاج اور عروضی پیمانے پر نقد ونظر کا کام بھی کیا ہے۔

اردو ماہیے پر عروضی اعتبار سے تنقیدی کام کی ضرورت اس لیے بھی بہت ضروری ہے کہ یہ صنف بھی ''ہائیکو'' اور ''ثلاثی'' کی طرح عمومی ساخت کے مطابق بظاہر تین مصرعوں کی ایک نظم ہے لیکن اس کا عروضی اعتبار ہی اسے ''ثلاثی'' اور جاپان سے درآمدہ صنف ''ہائیکو'' سے جدا قرار دیتا ہے۔ اکثر لوگ بہ نظر غائر جائزہ لیے بغیر ہی ماہیے اور ہائیکو کے درمیان فرق دریافت نہیں کرتے حالاں کہ وزن اور بحر کے اعتبار سے ان دونوں اصناف کا نمایاں فرق بخوبی دیکھا جا سکتا ہے مثال کے طور پر ہائیکو کا وزن اگر ۵۔۷۔۵ نہ ہو تو وہ ہائیکو نہیں ہے اور اسی طرح ماہیے کا وزن ۱۲۔۱۰۔۱۲ نہ ہو تو وہ ماہیا نہیں کہلا سکتا۔ دوسری صورت میں اردو ماہیے کا درست وزن کچھ اس طرح سے ہے۔

فعلن فعلن فعلن / فعلن فعلن فع / فعلن فعلن فعلن

یا پھر پنجابی ماہیے کی دھن پر طلوع ہونے والا اردو ماہیے کا دوسرا وزن

معفول مفاعیلن / فعل مفاعیلن / معفول مفاعیلن

ہی درست تصور ہوتا ہے۔

محض تین مصرعوں کی ترتیب کی بناء پر ہی ''ماہیے'' ہائیکو اور ثلاثی کو گڈمڈ نہیں کیا جا سکتا۔ حیدر قریشی نے اسی حوالے سے اپنی فکری بصیرت اور تحقیقی وتنقیدی نظریات کا مدلل اظہار کیا ہے

اور تاریخِ ادب اردو میں ماہیے کے مزاج، ہئیت اور وزن کے حوالے سے دیگر ماہیا نگاروں کے لیے فنی اعتبار سے بہت سی آسانیاں پیدا کردی ہیں۔

حیدر قریشی کی تحقیقی وتنقیدی افادیت کے ساتھ ساتھ حیدر قریشی کے خوبصورت اردو ماہیے ہماری توجہ اردو ماہیے کی خوش رنگی اور خوبصورتی کی طرف مبذول کرواتے ہیں۔صوتی آہنگ کے طفیل قدرتی طور پر ماہیے کی خوش بختی ہے کہ اس کی موثر دھن دیر تک دل ودماغ پر چھائی رہتی ہے۔اس پر حیدر قریشی کا منفرد اسلوب جس میں مناظر کی دھوپ چھاؤں' چشمے' کہسار' جھیلیں' درپن۔وصال موسم اور سلگتے خوابوں کے رنگ دکھائی دیتے ہیں۔یوں بھی ماہیا چونکہ عوامی جذبات وخواہشات کا بیان ہے اس لیے اس کے اسلوب میں بھی ہمیں عوام الناس کی آواز سنائی دیتی ہے۔حیدر قریشی کے اردو ماہیے بھی امن وآشتی' دھرتی رنگ' لوک داستانوں' جذبہ محبت اور مذہبی وابستگی کے نمایاں رنگوں سے بھرے پڑے ہیں۔

اس درجہ کشادہ ہے
شہرِ علم ﷺ کا دل
بے حد سے زیادہ ہے ۲

دنیا پہ کرم کردے
پیار کی سینوں میں
پھر روشنیاں بھردے ۳

اس دردخزانے کے
چل دو نفل ہی پڑھ
رب کے شکرانے کے ۴

مٹی سے محبت کا رشتہ جسم وجاں کے مصداق ٹھہرتا ہے ایک سچے فنکار کی طرح حیدر قریشی کے ''ماہیے'' جہاں آرزوؤں اور دعاؤں کے پھول برسا رہے ہیں وہاں دھرتی رنگ سے رنگے ہوئے بھی ہیں۔دھرتی کی محبت میں اسے پھول رُت اچھی لگتی ہے۔دھرتی کے رسم ورواج، شادی بیاہ کی تقریبات اس کے ماہیوں کا اثاثہ ہیں اور دھرتی کی خوشبو سے گوندھی ہوئی لوک داستانیں اس کے ماہیوں میں سانس لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔

مکھ دھرتی کا نورانی
جھومر پیڑ اس کے
کھیت اس کی ہیں پیشانی ۵

چانداور ستارے ہیں
ہم سب اس دھرتی
کے راج دلارے ہیں ۶

مستی ہے ہواؤں میں
رات کی رانی کی
خوشبو ہے فضاؤں میں ۷

پہلے پُرآب ہوئی
یاد میں سوہنی کی
پھر آنکھ چناب ہوئی ۸

پنوں تھا کہ بادل تھا
آنکھ میں سسی کی
صحرا کوئی جل تھل تھا ۹

یہی رسمِ زمانہ ہے
بابل کے گھر کو
اب چھوڑ کے جانا ہے ۱۰

ان لوک داستانوں میں سسی پنوں کی کہانی ہو کہ ہیر رانجھا کی، سیتا رام کا قصہ ہو کہ سوہنی ماہیوال کا۔رادھا کہانی ہو کہ کرشن کنہیا۔حیدر قریشی علاقائی حدود سے بالا ہو کر سچے فنکار کی طرح لوک

داستانوں کو ماہیے کی فارم عطا کرتے ہیں۔حیدر قریشی کے ماہیوں میں مکالماتی انداز اور موضوعاتی طرزِ بیان بھی موجود ہے یعنی ہر ایک موضوع کے ذیل میں عنوان سے متعلق مختلف ماہیے اکٹھے کردیئے گئے ہیں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے ماہیوں پر اکثر اوقات اس کی منہ بولی زبان سرائیکی کا خاص اثر محسوس ہوتا ہے۔

فطری طور پر تقریباً ہر آدمی اپنی مادری زبان، مقامی روزمرہ ومحاورے اور اپنے کلچر سے انتہائی مانوس ہوتا ہے جس کا لاشعوری اظہار اس کے عمومی لب ولہجے سے ظاہر ہوتا رہتا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ عام آدمی کی نسبت تخلیق کار کی تخلیق میں بعض اوقات اس کی منہ بولی زبان اور مقامی کلچر کا نیا امتزاج ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو کر تخلیق کار کی انفرادیت کا باعث بن جاتا ہے۔یہی حال حیدر قریشی کی اردو ماہیوں میں سرائیکی کلچر اور سرائیکی الفاظ کی مٹھاس کا ہے جس سے حیدر قریشی کے ماہیوں کی فضا یکسر مختلف اور منفرد معنویت سے لبریز ہوگئی ہے۔حیدر قریشی کے شعری اسلوب میں سرائیکی الفاظ کے بے ساختہ استعمال کے حوالے سے ڈاکٹر شفیق احمد لکھتے ہیں۔''ان (حیدر قریشی) کا تعلق سرائیکی علاقے اور سرائیکی خاندان سے ہے ورنہ یہ الفاظ ان کی شاعری کا حصہ نہیں بن سکتے تھے''

حیدر قریشی کے سرائیکی ڈکشن میں ''لمبے وچھوڑے''، ''کجلا بھری آنکھیں''، ''چن ماہی''، ''ڈھولا''، ''کلہم کلہا'' اور ''یادوں کا بنیرا'' ایسے دیگر الفاظ یقیناً سرائیکی زبان کے اثرات کو نمایاں کرتے ہیں۔

دن وصل کے تھوڑے ہیں
جی بھر کر مل لو
پھر لمبے وچھوڑے ہیں ۱۲

تصویر خیالوں کی
کجلا بھری آنکھیں
''تفسیر اجالوں کی'' ۱۳

بادل ہیں گنیرے سے
چہرا کوئی ابھرا
یادوں کے بنیرے سے ۱۴

پنجاب رنگ اور پنجاب کی ثقافت، حیدر قریشی ہر دو حوالوں سے بے خبر ماہیا نگار نہیں ہے۔اس کے ہاں پنجاب کی ثقافت اور منظرنامے میں گُڑ کا شربت، مونجی کی چھڑائی، گندم کی کٹائی، پیتل کی پرات، پگڈنڈیاں، پیپل کی گھنی چھاؤں، آموں کا بور اور دیہاتی رہن سہن صاف دکھائی دیتا ہے۔

گندم کی کٹائی پر
چھوڑ دیا گاؤں
گوری کی سگائی پر ۱۵

پیپل کی گھنی چھایا
گزرے زمانے کا
سایہ کوئی لہرایا ۱۶

حیدر قریشی کے ماہیوں میں صداقتوں کا پہلو بہت مضبوط پہلو ہے۔وہ ہر منظرنامے کا جائزہ بہت قریب سے لیتا ہے کیوں کہ اسے معاشرتی عذابوں اور تاریخی حوالوں کو بھی انصاف سے رقم کرنا ہے حیدر قریشی کے موضوعات میں دکھ درد کے موسم ہوں کہ وصال کے لمحات چونکہ وارداتِ قلبی کو چھو کر الفاظ

ہوئے ہیں اس لیے خوبصورت دکھائی دیتے ہیں۔

آنکھوں میں ستارے ہیں
ہجر کی شب میں بھی
وہ پاس ہمارے ہیں ۱۷

پھرتے ہیں اکیلے میں
ساتھ نہیں کوئی
صدمات کے میلے میں ۱۸

بے نام اداسی کو
کون سمجھ پاتا
تیرے بن باسی کو ۱۹

حیدر قریشی کے ماہیوں میں کائنات کی خوبصورتی کھلی کتاب کی طرح موجود ہے اور ہر نظر اس میں سے اپنی پسند کے منظر نامے کو ڈھونڈ سکتی ہے۔حیدر قریشی کی نگاہِ سخن کے مختلف زاویے اس کے ماہیوں میں موجود ہیں۔کہیں وہ کائنات میں موجود حسن کا مطالعہ کرتا ہے اور کہیں اپنے فن میں بسے حسن و محبت کو الفاظ کی جامہ گری میں ملفوف کیے ہوئے دکھائی دیتا ہے۔

کچھ قید سنا دیتے
عشق کے مجرم کو
کوئی تو سزا دیتے ۲۰

کوئی وہم یا جادو تھا
رنگ ہوا، اس کا
جسم اس کا خوشبو تھا ۲۱

اظہار ضروری ہے
پیارا گر ہو تو
اقرار ضروری ہے ۲۲

حیدر قریشی کی ماہیا نگاری میں جدید تراکیب نئے پن کے ساتھ جلوہ گر ہوئی ہیں۔دھرتی کے کنگن، جھیلوں کے درپن، بیلوں کی جھانجھر، دریاؤں کی مالا، پگڈنڈیوں کے دل ایسی بے شمار ترکیبیں حیدر قریشی کو دورِ حاضر کے ماہیا نگاروں میں منفرد مقام عطا کرتی ہیں۔

اہلِ علم جانتے ہیں کہ پنجابی ماہیے کا اصل مضمون بالعموم دوسرے اور تیسرے مصرعے ہی میں پایا جاتا ہے جبکہ مصرعہء اول معنویت سے خالی رہ جاتا ہے لیکن ''اردو ماہیا'' اس عیب سے بھی پاک ہے اس کے تینوں مصرعے ایک مضمون سے جڑے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ حیدر قریشی کے ماہیے، صاف ستھرے اور بامعنی اسلوب کے ترجمان ہیں گوئٹے کہتا ہے

''ایک تخلیق اس وقت خوبصورت ہوتی ہے جب وہ ترقی کی انتہا کو پہنچ جاتی ہے''۔ ۲۳

حیدر قریشی کی تخلیقی صلاحیتوں میں سے جو فیض اور جو حسن اردو ماہیے کو نصیب ہو رہا ہے اس کی اڑان ترقی کی انتہا سے کچھ دور نہیں۔حیدر قریشی کی ماہیا نگاری اور ''اردو ماہیے'' سے بے پناہ وابستگی اس بات کا یقین دلاتی ہے کہ ''اردو ماہیے'' کا مستقبل خوش آئیند اور تابناک ہے۔

☆☆

کتابیات

مصنف	کتاب	ناشر	صفحہ
۱۔ڈاکٹر سلام سندیلوی	ادب کا تنقیدی مطالعہ	مکتبہ میری لائبریری لاہور، ۱۹۸۰ء	ص۔۱۷
۲۔حیدر قریشی	غزلیں، نظمیں، ماہیے	سرور ادبی اکادمی۔جرمنی۔۱۹۹۸ء	ص۔۳۲۵
۳۔حیدر قریشی	؍؍ ؍ ؍	؍؍ ؍ ؍	ص۔۳۲۶
۴۔حیدر قریشی	درد سمندر	زیرِ اشاعت شعری مجموعہ	
۵۔حیدر قریشی	غزلیں، نظمیں، ماہیے		ص۔۳۲۷
۶۔حیدر قریشی	؍؍ ؍ ؍		ص۔۳۳۰
۷۔حیدر قریشی	؍؍ ؍ ؍		ص۔۳۳۶
۸۔حیدر قریشی	؍؍ ؍ ؍		ص۔۳۳۷
۹۔حیدر قریشی	؍؍ ؍ ؍		ص۔۳۳۷
۱۰۔حیدر قریشی	؍؍ ؍ ؍		ص۔۳۴۱
۱۱۔ڈاکٹر شفیق احمد	''حیدر قریشی کی شاعری''	میاں محمد بخش پبلیشرز، خان پور	ص۔۱۰۴
۱۲۔حیدر قریشی	غزلیں، نظمیں، ماہیے		ص۔۳۵۹
۱۳۔حیدر قریشی	درد سمندر	زیرِ اشاعت شعری مجموعہ	
۱۴۔حیدر قریشی	غزلیں، نظمیں، ماہیے		ص۔۳۳۷
۱۵۔حیدر قریشی	؍؍ ؍ ؍		ص۔۳۵۶
۱۶۔حیدر قریشی	؍؍ ؍ ؍		ص۔۳۵۸
۱۷۔حیدر قریشی	؍؍ ؍ ؍		ص۔۳۶۴
۱۸۔حیدر قریشی	؍؍ ؍ ؍		ص۔۳۶۵
۱۹۔حیدر قریشی	؍؍ ؍ ؍		ص۔۳۶۵
۲۰۔حیدر قریشی	؍؍ ؍ ؍		ص۔۳۶۶
۲۱۔حیدر قریشی	؍؍ ؍ ؍		ص۔۳۶۸
۲۲۔حیدر قریشی	؍؍ ؍ ؍		ص۔۳۶۸
۲۳۔سعید احمد رفیق	تاریخِ جمالیات۔	زمرد پبلیکیشنز کوئٹہ، ۱۹۷۲ء	ص۔۱۴۴

ڈاکٹر رشید امجد (اسلام آباد)

حیدر قریشی کی افسانہ نگاری

حیدرقریشی نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا ہے:

''میری زندگی کے سارے نشیب وفراز لاشعوری طور پر میرے شعور کی تعمیر میں اہم کردار ادا کرتے رہے ہیں لہٰذا میری عملی زندگی میں پیش آنے والے مسائل اور سوالات ہی میرے کسی نظام فکر کی تشکیل کا باعث بنے ہوں گے اور لاشعوری طور پر سہی کسی نہ کسی رنگ میں میری تخلیقات میں در آئے ہوں گے۔''

(**جواز جعفری سے گفتگو**
مشمولہ **حیدر قریشی کے انٹرویوز** مرتب سعید شباب)

حیدرقریشی کے اس اقرار کے باوجود کہ انہیں تصوف سے دلچسپی ہے، ان کی کہانیوں کا خام مواد حقیقی زندگی کے منظر نامہ سے اخذ کیا گیا ہے۔ تصوف درویشی اور کسی حد تک گوشہ نشینی کا احساس دلاتا ہے لیکن اگر تصوف کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو اپنے وقت کے تمام بڑے صوفی، اپنے عہد سے پوری طرح جڑے ہوئے ہیں۔ کسی نے درست کہا ہے کہ ان کی محفلیں عوامی دربار تھے جن میں ہر شخص اپنے مسائل کے ساتھ موجود ہوتا تھا۔ روحانیت ان کا باطنی سفر تھا، گویا وہ دو دنیاؤں میں رہتے تھے۔ حیدرقریشی کے افسانوں پر بات کرتے ہوئے، یہ ذکر یوں ہوا کہ حیدرقریشی بھی دو دنیاؤں کا مسافر ہے، ایک اس کا باطنی مکاشفہ اور دوسرے اردگرد کی دنیا کا عملی تجربہ۔ چنانچہ اس کی کہانی دو سطحوں پر اپنی تفہیم کراتی ہے، اس کا خمیر اپنے عہد کی سماجی وسیاسی صورتِ حال سے اٹھتا ہے اور فکری طور پر وہ ایک اَن دیکھی دنیا کے اسرار بھی رکھتی ہے کہ قاری جس سطح پر چاہے لطف اندوز ہوسکتا ہے۔

حیدرقریشی نے متعدد بار کہا ہے کہ میں خوابوں اور حقیقتوں کے درمیان زندگی بسر کررہا ہوں، پرانی اصطلاحوں میں وہ بیک وقت حقیقت اور آدرش کے درمیان کہیں جینے کی کوشش کررہے ہیں۔ ایک حوالہ سے یہ مسلسل عذاب اور سلگتے رہنے کی صورت بھی ہے کہ حقیقت اور آدرش دو مختلف منطقے ہیں۔ صرف

حقیقت کو سب کچھ سمجھ لینے والا خوابوں سے محروم ہوجاتا ہے اور ہمیشہ خوابوں میں رہنے والا حقیقت سے دور ہوجاتا ہے۔ سچا ادیب ان دونوں کے درمیان ہوتا ہے۔ حیدرقریشی کی کہانیاں اپنے عہد کی سچائیاں ہیں لیکن ان کی اندرونی پرتوں میں خوابوں کی لذت بھی موجود ہے، جو ہر بڑے ادیب کا خاصہ ہوتی ہے۔

حقیقت اور خوابوں کے درمیان جو کشمکش ہے وہی زندگی ہے، اس حوالے سے حیدرقریشی کے تخلیقی عمل کو بھی سمجھا جاسکتا ہے۔ وہ اپنی ہر کہانی میں دو سطحوں پر موجود ہیں، اول معاشرے کے ایک نقاد اور دوسرے معاشرے کی موجود صورتِ حال سے اوپر اٹھ کر تخلیقِ انسان کے بنیادی مسائل پر غور وفکر کرتے ہوئے ایک صوفی کی حیثیت سے، اس کا اظہار بھی دونوں طرح ہوا ہے۔ ان کی بعض کہانیاں سیدھے سادے معاشرتی مسائل سے متعلق ہیں اور ان کا بیانیہ بھی تفہیم کی کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کرتا، لیکن ان کی بعض کہانیوں کے موضوع گنجلک اور باطنی کشف کی روداد ہیں۔ ایسی کہانیوں کے بیانیہ میں انہوں نے اسطور کے ساتھ ساتھ مذہبی کتابوں خصوصاً بائبل کے اسلوب کی پیروی کی ہے۔ بشارت ان کے یہاں ایک خاص استعارہ بھی ہے اور سچائی کی راہنمائی کرنے والی ایک علامت بھی۔

فرحت نواز نے اپنی ایک گفتگو میں کہا ہے کہ ''حیدرقریشی اپنی تمام تخلیقات میں خود سانس لیتے ہوئے اور زندگی بسر کرتے ہوئے موجود ہیں۔ خود اس طرح کہ ان کی اپنی زندگی کے ساتھ ان سے وابستہ تمام اہم کردار بھی ان کی تخلیقات میں موجود ہیں، بعض کھلی کتاب کی طرح ہیں لیکن ایسی کھلی کتاب جس کے معانی مسلسل کھلتے چلے جاتے ہیں۔'' یہ رائے حیدرقریشی کی حقیقت نگاری کے رویے کی تائید کرتی ہے۔ ہر لکھنے والا سب سے پہلے ایک ماحول اور ایک معاشرے میں زندہ ہوتا ہے۔ اس کی محبتیں، دشمنیاں اور نفرتیں اس کے لائحہ عمل کا تعین کرتی ہیں اور بعض کرداروں کو محبت اور بعض کو نفرت کا استعارہ بناتی ہیں۔ قریب کے جاننے والے بعض اوقات ان میں سے اصل چہرے بھی ڈھونڈھ لیتے ہیں لیکن دور بیٹھا قاری سارے نتائج کو اپنے آس پاس کے ماحول پر منطبق کرکے دیکھتا ہے یہ آفاقی سچائیوں کے زمرے میں آتا ہے کہ کسی کہانی کار کے کردار ان کے عمل اور افکار کس حد تک دوسروں کے لیے قابل قبول ہوتے ہیں لیکن یہ صرف کہانی کی اوپری پرت ہے۔ ہر کہانی کے اندر ایک اور کہانی ہوتی ہے اور جو افسانہ نگار کہانی کی ظاہری سطح کے اندر ایک اور کہانی پیدا کردینے کا فن جانتا ہے وہ بڑا افسانہ نگار ہے، حیدرقریشی کی اکثر کہانیوں میں یہ خوبی موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فرحت نواز نے اگر ایک طرف حیدرقریشی کی کہانیوں کی حقیقی صورت حال کا ذکر کیا ہے تو ڈاکٹر سعادت سعید کے نزدیک ''حیدرقریشی نے دور جدید کے سائنسی اور تکنیکی انقلاب اور تہذیب نو کی کنہ کی تنقیدی تفہیم کی ہے۔''

سچا ادیب آگہی کی جس اذیت سے گزرتا ہے اس کا اظہار حلاج کی طرح ہو جائے تو موت کا پھندا ہر وقت منتظر ہے اور اظہار نہ ہو تو سچائی کا کرب اندر ہی اندر کاٹتا رہتا ہے، توڑتا رہتا ہے۔اس اندرونی توڑ پھوڑ کا اظہار کس سطح پر ہو یہی ادیب کے مقام کا تعین کرتا ہے، خود حیدر قریشی کو بھی اس کا احساس ہے ڈاکٹر وزیر آغا سے ایک گفتگو میں انہوں نے کہا ''لکیر کے فقیر معاشرہ میں آزادانہ غور و فکر کرنے والوں کے لیے ایک طرف آگہی کی اذیت ہوتی ہے اور دوسری طرف معاشرے کی ملامت۔۔''۔اور یہ تو بالکل سچ ہے کہ آگہی کی اذیت ہی سے گزر کر بڑا ادب تخلیق ہوتا ہے۔اب اس حوالے سے حیدر قریشی کی کہانیوں کو دیکھ لیں تو صورتِ حال واضح ہو جاتی ہے۔ان کی کہانیاں بظاہر سیدھی سادی ہوں یا کسی فکری مکاشفہ کی دریافت ان میں آگہی کا کرب پوری طرح موجود ہے، یہی ایک سچے فنکار کی پہچان اور جواز ہے۔

ہر فنکار کے ذاتی کوائف کسی نہ کسی حوالے سے اس کے فن پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اس کی فکر کا تعین بھی کرتے ہیں۔کسی ایک ملک میں رہتے ہوئے ہر ادیب ایک عذاب سے گزر رہا ہوتا ہے کہ اس کے آس پاس جو بے انصافی ہو رہی ہے اس کے مداوے کے لیے وہ کیا کرے۔وہ اپنے آپ سے بھی لڑتا ہے اور معاشرے کی مجموعی خرابیوں کے خلاف بھی آواز اٹھاتا ہے۔ٹوٹتا ہے، جڑتا ہے اور اپنا اظہار کرتا رہتا ہے لیکن حیدر قریشی کو دوہرے عذاب سے گزرنا پڑا ہے۔۱۹۹۲ء میں اسے وطن چھوڑنا پڑا اس کے بارے میں جواز جعفری کے اس سوال کے جواب میں کہ ''آپ نے بخوشی وطن چھوڑا یا جلاوطن کیے گئے'' حیدر قریشی نے کہا ''جلاوطن تو نہیں کیے گئے لیکن وطن کو بخوشی نہیں چھوڑا۔'' وہ بڑی فراخ دلی سے اپنی جلا وطنی کو ''خود ساختہ'' کہتے ہیں۔یہاں اس جلاوطنی کا تجزیہ کرنے کی گنجائش نہیں لیکن اس دوہری اذیت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے جس سے حیدر قریشی گزرے ہیں، شاید ابھی تک گزر رہے ہیں۔۔۔پاکستان چھوڑنے سے پہلے ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ ''روشنی کی بشارت'' شائع ہو چکا تھا۔اس مجموعہ کے ایک افسانہ پر وہ صورتِ حال پیدا ہوئی جس کی وجہ سے انہیں ملک چھوڑنا پڑا۔صورت حال تو کئی برس سے موجود تھی اس حد تک کہ حیدر قریشی کو روزگار سے محروم ہونا پڑا لیکن یہ ایک افسانہ جواز بن گیا۔

''روشنی کی بشارت'' ایک استعاراتی نام ہے۔اس مجموعے کی کہانیاں دونوں سطحوں پر معنوی پرتیں کھولتی ہیں۔سیدھی سی کہانیاں بھی عام معنوں ہیں اکہری نہیں۔سادہ معنویت میں بھی ان کا جواز موجود ہے۔اس مجموعہ کی جو کہانیاں فکری دبازت کا پہلو لیے ہوئے ہیں ان کا اسلوب بھی نیم استعاراتی ،استعاراتی اور کہیں علامتی ہے۔ان میں اساطیری اسلوب کی جھلک بھی ہے اور کتاب مقدس کے بعض استعارے بھی اپنے عصر سے جوڑے گئے ہیں۔جدید افسانے میں اس مجموعہ کی اہمیت ہے اور جدید

افسانے کے ذکر میں اسی کا حوالہ ہمیشہ موجود ہوتا ہے۔ناصر عباس نیّر نے ان کی افسانہ نگاری کے حوالے سے کہا ہے کہ ستر کی دہائی والی نسل نے اوّلاً جدیدیت کے اثرات قبول کیے اور بعد ازاں اس جدیدیت کا محاسبہ کیا۔محاسبہ کرنے والوں میں حیدر قریشی بھی شامل ہیں۔اس میں شک نہیں کہ جب کوئی تحریک یا رجحان فیشن کی طرح مقبول ہوتا ہے تو اصل اور نقل کا فرق مشکل ہو جاتا ہے۔ہر بڑی تحریک کے ساتھ یہی ہوتا ہے۔ترقی پسند تحریک کے عروج کے زمانے میں کتنے ہی لوگ صرف نقادوں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے ترقی پسند بن بیٹھے تھے یہی کچھ ساٹھ کے بعد بھی ہوا لیکن ستر میں محاسبہ کرنے والے ستّر کے بعد کے لوگ ہی نہیں خود ساٹھ کی دہائی کے اچھے لکھنے والے بھی اپنا محاسبہ کر رہے تھے، پھر یہ کہ خارجی منظر نامہ میں ایک بڑی تبدیلی آئی تھی۔موضوعات کے حوالے سے اور وہ کہانی جو ترقی پسند تحریک کے زمانے میں بالکل خارجی اور ساٹھ کی دہائی میں ردعمل کے طور پر باطنی ہو گئی تھی، ستّر میں مجموعی طور پر خارج اور باطن کے امتزاج کی صورت ظاہر ہوئی اور صرف ستّر کے بعد کے لکھنے والوں کی سوچ نہیں تھی، خود ساٹھ کے لکھنے والے جواب مستحکم ہو گئے تھے اور عجزِ فن کی منزل سے بھی نکل آئے تھے، اس تبدیلی کے محرک تھے۔ انتظار حسین، انور سجاد، خالد حسین اور منشا یاد کی ساٹھ اور ستّر کی کہانیوں میں یہ تبدیلی دیکھی جا سکتی ہے، اس لیے یہ دعویٰ کہ یہ تبدیلیاں ستّر کی نسل کی دین ہیں، درست نہیں، انہیں کسی ایک نسل کی بجائے مجموعی اور عصری ارتقاء کے حوالے سے دیکھا جانا چاہیے۔

حیدر قریشی کا پہلا افسانوی مجموعہ ۱۹۹۲ء میں چھپ گیا تھا۔اس مجموعے کی کہانیاں ''میں انتظار کرتا ہوں''، ''روشنی کی بشارت''، ''حوا کی تلاش''، ''اپنی تجرید کے کشف کا عذاب'' اور ''ایک کافر کہانی'' اپنے عنوانات ہی سے اپنی فکری سمت کا تعین کرتی ہیں، ان کہانیوں میں تصوف کی وراثت کہانی کے باطن میں موجود ہے۔اسلوب کے حوالے سے بھی یہ کہانیاں دبیز اسلوب کی ذیل میں آتی ہیں۔جب یہ مجموعہ چھپا تھا اس وقت بھی اسے جدید اور اردو افسانہ میں شامل کیا گیا تھا۔

حیدر قریشی کا دوسرا مجموعہ ''قصہ کہانیاں'' (پہلے مجموعے کی کہانیوں سمیت ''افسانے'' کے نام سے) ۱۹۹۹ء میں شائع ہوا۔ہر جینوئن ادیب کا دوسرا مجموعہ پہلے مجموعے سے اگلا قدم ہوتا ہے، سوچ کے حوالے سے بھی اور اسلوب کے حوالے سے بھی لیکن ان میں ایک باطنی تسلسل بھی ہوتا ہے جو ادیب کی بنیادی پہچان ہے۔حیدر قریشی کے دوسرے مجموعہ میں بھی کئی کہانیاں ان کے پہلے مجموعہ کے فکری تسلسل اور ایک قدم آگے کے سفر کی روداد ہیں، مثلاً ''دو کہانیوں کی ایک کہانی'' میں ''منطق الطیر'' بھی موجود ہے اور شاہ جی کے روپ میں ایک صوفی بھی جو قدم قدم اپنے مرید کی فکری راہنمائی کرتا ہے۔

حیدر قریشی کو فکری طور پر میں ایک جدید ترقی پسند افسانہ نگار سمجھتا ہوں کیونکہ ان کے افسانے

سماجی زندگی کے خمیر سے تیار ہوتے ہیں اور معاشرے کے دکھ اور مظلوم کی بے بسی ان میں موجود ہے اس حوالے سے کہا جا سکتا ہے کہ ان کے موضوعات ترقی پسند ہیں اور معاشرے کو بدلنے کا آدرش رکھتے ہیں لیکن انہوں نے اپنی کہانیوں کو سیدھے بیانیہ میں پیش نہیں کیا بلکہ تخلیقی تجربے سے گزر کر ان کے لیے اظہار کی ایسی زبان وضع کی ہے جس میں استعارہ اور علامت دونوں موجود ہیں بلکہ اکثر انہوں نے تصوف کی اصطلاحات اور اساطیری حوالوں سے بھی کام لیا ہے جو انہیں جدید بناتے ہیں۔حلقہ اربابِ ذوق نے موضوع کے ساتھ ساتھ فن پارے کی ادبی حیثیت کو بھی ضروری قرار دیا تھا۔سات اور بعد کی ادبی نسلوں کی تربیت زیادہ تر حلقہ ہی میں ہوئی ہے۔حیدر قریشی بھی فکری طور پر حلقہ ہی کے پروردہ ہیں اس لیے ان کے افسانوں میں موضوع کی وسعت کے ساتھ ساتھ فنی حوالے بھی موجود ہیں اور وہ فنی جمالیات کے پوری طرح قائل ہیں۔

حیدر قریشی شاعر بھی ہیں،شاید افسانے کی طرف وہ بعد میں آئے ہیں۔شاعر ہونے کا فائدہ یہ ہوا کہ ان کا جملہ شعری خوبیوں یعنی لفظوں کے دروبست ،اختصار،معنوی دبازت اور تخلیقی جمالیات سے آراستہ ہے۔ادھر کچھ عرصہ سے انہوں نے باقاعدہ تنقید بھی لکھی اور یادداشتوں کے ساتھ ساتھ مختلف بین الاقوامی موضوعات کو بھی اپنایا ہے، یہ ان کی ہم جہتی کا اظہار ہے لیکن میرے نزدیک ان کی دو حیثیتیں زیادہ نمایاں ہیں، ایک شاعر اور دوسرے افسانہ نگار، یہ دونوں تخلیقی حیثیتیں ہیں اور غیر محسوس طور پر ایک دوسرے پر اثر انداز بھی ہوتی ہیں۔حیدر قریشی کے افسانوں کا اختصار، جملہ کی گرفت، ہر جملے کا دوسرے جملے سے ایسے جڑا ہونا جیسے زنجیر کی کڑیاں ہوں،مترنم لفظوں کا انتخاب اور کہانی کی مجموعی بُنت میں ماورائی تخلیقی ذہن،ان کی شاعر ذات کی دین ہے۔

حیدر قریشی کے دونوں افسانوی مجموعے ان کے فنکارانہ سفر کے دو مرحلے ہیں ان میں ایک فنی اور فکری ارتقاء ہے جو ان کی اگلی منزل کی نشاندہی کر رہا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ اردو افسانے کے مجموعی سفر میں بھی یہ دونوں مجموعے اپنی اہمیت اور پہچان رکھتے ہیں۔☆☆

''(حیدر قریشی) کثیر الجہت لکھنے والے ہیں۔تحریر بہت دلکش ہوتی ہے۔۔۔۔ان کی تحریروں میں کشمکشِ زیست غالب عنصر ہے۔مگر ان کی شاعری میں تہذیبی جلاوطنی اور سیاسی متعلقات بھی ہیں۔ان کے شعری اسلوب میں سرائیکی لسانیات کا اردو میں نفوذ بھی نظر آتا ہے۔شعری صنف ''ماہیا'' پر ان کا کام بڑے معرکے کا ہے۔وہ خواب گر بھی ہیں اور خواب شکن بھی۔۔۔۔''

(**احمد سھیل** بحوالہ کتاب **انٹرویوز مرتب : سعید شباب** ص ۱۳۵،۱۳۶)

ڈاکٹر ظفر عمر قدوائی (کلکتہ)

ایٹمی جنگ

ادبی دنیا میں حیدر قریشی کے نام اور کام کی خوشبو دور دور تک پھیلی ہوئی ہے۔موصوف صرف شاعر ہی نہیں بلکہ ایک ادیب، خاکہ نگار، افسانہ نگار، انشائیہ نگار، یادنگار اور نقاد بھی ہیں۔اردو صحافت میں بھی انہوں نے عالمی سطح پر اپنی شناخت بنائی ہے۔بہت ہی قلیل مدت میں حیدر قریشی کئی کتابوں کے مصنف اور مولف کی حیثیت سے بھی اپنی پہچان قائم کر چکے ہیں۔

زیرِ نظر مجموعہ ''ایٹمی جنگ'' میں مصنف کے تین مختصر افسانے ''حوا کی تلاش''۔''گلاب شہزادے کی کہانی'' اور ''کاکروچ'' شامل ہیں۔یہ سبھی افسانے سائینس کی تباہ کن دریافت ایٹم کے تناظر میں پُر مغز علامتی پیرائے میں لکھے گئے ہیں۔حوا شروع سے ہی ذہنی اور قلبی تسکین کی علامت سمجھی جاتی ہے جس کی جستجو میں ابن آدم ہر طرح کے جتن کرتا ہے۔ایٹم کی کھوج بھی اسی فکر سے متعلق ہے۔چنانچہ آج ایٹم بم جیسا تباہ کن ہتھیار اتنی کثیر تعداد میں جمع کیا جا چکا ہے کہ بقول مصنف ''یہ دنیا کو پانچ بار فنا کر دینے کے لیے کافی ہے'' اور حال یہ ہے کہ حرص دنیا میں ہر شخص دوسرے سے اپنی برتری تسلیم کرانے اور اپنا تسلط جمانے کی دھن میں ہے۔یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کے استعمال سے صید اور صیاد دونوں ہی کی موت یقینی ہے پھر بھی ایٹم بم سے وابستہ ہلاکتوں کو گلے لگانے کے درپے ہے۔یعنی کہ ''زندگی چاہنا اور موت کا ساماں کرنا''۔

یہ صورت حال حیدر قریشی کی فکر و تشویش کا سبب ہے۔اسی بے چین احساس میں انہیں فوج ابرہہ کی پسپائی پر رشک آتا ہے کہ وہ تو صرف ''کھائے ہوئے بھوسے کی مانند کر دیئے گئے تھے'' اور ایٹم کی تباہ کاریاں؟ معاذ اللہ!! چنانچہ وہ ایٹم یا حطم کا تعارف قرآن پاک کے لفظوں میں یوں کراتے ہیں کہ ''تم کو نہیں معلوم کہ یہ حطمہ کیا چیز ہے۔یہ اللہ کی خوب بھڑکائی ہوئی آگ ہے جو دلوں تک اتر کر ریزہ ریزہ کر دے گی (**سورہ الھمزا**) حطمہ کے لغوی معنی ڈنکن فاربی نے بھی قریب قریب یہی لکھے ہیں **جزو لا یتجزا** (ایسے ذرات میں تبدیل کر دینا کہ پھر ان ذروں کو ٹکڑے کرنا ممکن نہ ہو)۔یہی احساس ''روشنی کا وہ ہالہ'' ہے جو حیدر قریشی کے اشہب فکر کو قرآن پاک کی دوسری سورتوں اور آیتوں مثلاً القاریہ

نمبر۱۰۱۔الزلزال ۹۹۔المومن۲۴ آیۃ۸۲تا۸۵،سورہ یٰسین ۳۶ آیۃ ۷۷۔۷۸،سورہ الشوریٰ ۴۲،آیۃ۲۸،سورہ الفجر۸۹ آیۃ ۲۷،۲۸اور سورہ الرحمن۵۵تک پہنچا تا ہے جن میں مستقبل کا اور بھی بہت کچھ کچا چٹھا سامنے آجا تا ہے۔اس روشنی کے ہالے میں حیدر قریشی کو ملک السمٰوات والارض کی پسندیدہ راہوں کو اختیار کر کے ہی حوا یعنی تسکین کی جستجو میں فلاح نظر آتی اوراس کی بازیافت ممکن محسوس ہوتی ہے۔شرط یہ ہے کہ انسان ’’نفس مطمئنہ کے ساتھ اپنے رب سے اس حال میں رجوع کرے کہ وہ اسے پسند کرنے والا بھی ہو اوراس کا پسندیدہ بھی (سورہ الفجر ۸۹) ۔ورنہ یہ ایجادات اور ترقیاں یا ساری روشنی طبع بلا بن کر بھی نمودار ہو سکتی ہے جس کی قرآن پاک میں یوں خبر دی جا چکی ہے’’تم پر آگ کا شعلہ اور تانبا گرایا جائے گا پس تم ہرگز غالب نہیں آسکتے‘‘ان حقائق سے درس عبرت لے کر نئی امنگوں اور حوصلوں سے اس روشنی کے ہالے میں جب وہ بقائے نسل انسانی کی فکر میں آگے بڑھتے ہیں تو انہیں اپنا درِ مقصود حاصل ہو جا تا ہے اور دل پکار اُٹھتا ہے’’پس تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کا انکار کرو گے۔‘‘

گلاب شہزادے کی کہانی میں اس دور ترقی کے چار مناظر چار درویشوں کے حوالے سے پیش کیے گئے ہیں۔قصہ چہار درویش کی طرح یہ درویش بھی رات گزارنے کے لیے اپنی اپنی کہانیاں سناتے ہیں۔افسانے کی شروعات اس شعر سے ہوتی ہے ؎

ہوا شہکار جب اس کا مکمل وہ اپنے خون میں ڈوبا ہوا تھا

حقیقت میں یہی شعران چاروں مناظر کی روح اوراس افسانے کا مرکزی خیال ہے۔افسانے کے سماجی اور معاشرتی پہلوؤں اور تقاضوں سے قطع نظر انسان کی بڑھتی ہوئی ہوس کو ظاہر کرتے ہوئے تیل کے چشموں یعنی دنیا کی عظیم دولت کی جانب اٹھنے والی للچائی نگاہیں اوران کو ہتھیا لینے کی فکر اور بالآخر وہیں پر انسانیت کی موت کا قصہ ہے جسے مصنف نے علامتوں،تلازموں،استعاروں اور تشبیہوں کے ملبوس میں سجا کر پیش کیا ہے۔شروع افسانے میں حیدر قریشی نے اشارتاً لکھا ہے’’خون کا رنگ سرخ ہوتا ہے،خون میں سفید رنگ ملا دیں تو وہ گلابی بن جا تا ہے لیکن اگر خون ویسے ہی کہیں جم جائے تو سیاہ ہو جا تا ہے‘‘بظاہر اس جملے کا کوئی موقعہ و محل نہیں ہے لیکن دراصل یہی وہ آئینہ ہے جس میں انہوں نے حرص و ہوس،خود غرضی اور خود پرستی کی وہ تصویریں دکھائی ہیں جب ایک بھائی مال و زر کی خاطر دوسرے بھائی کی جان لے لیتا ہے۔بیوی عیش کوشی کی فکر میں اپنے منصب سے خیانت کرتی ہے۔خوشحال زندگی کے خواب میں منصوبہ بندی کے نام پر والدین اپنی ہی اولاد کا قبل از ولادت قصہ تمام کر دینے میں ذرا بھی نہیں ہچکچاتے۔اور آتش حسد جلانے والا خود ہی اپنی بھڑکائی ہوئی آگ میں جل کر خاکستر ہو جا تا ہے۔غرضیکہ لب بام تک پہنچتے

پہنچتے ہر کمند ہوس ٹوٹ جاتی ہے۔کہانی کا انجام پہلے افسانے کے برخلاف المناک اور مایوس کن ہے۔تیسرے اور آخری افسانے کا پس منظر بھی ایٹمی جنگ کی ہولناکیاں اور تباہ کاریاں ہے۔اسلوب نگارش تحیر (Suspence) پیدا کرتا ہے۔انداز بیان ڈرامائی ہے۔دوستوں کے مکالمے قصے کی دلچسپی میں اضافہ کرتے ہیں۔افسانے کا رنگ ڈھنگ سائینٹفک ہوتے ہوئے بھی فکشن ہے اور فکشن میں ایٹمی جنگ کے بعد روئے زمین پر کسی انسان کا زندہ بچ جانا کوئی عجوبہ نہیں۔تاہم یہ ضروری ہے کہ اس میں ہر قسم کی شعاع زنی کو جذب کر سکنے کی صلاحیت ہو جیسے کہ مکھی یا بالفرض کاکروچ۔جب تابکاری اثرات سے ان کی نشو ونما ہو گی تو مستقبل میں یہی کاکروچ زمین کے مالک ہوں گے۔یہیں سے کہانی ایک نیا موڑ لیتی ہے اور دوست اس سوچ میں ڈوب جاتے ہیں کہ ہو سکتا ہے ہم آج کے انسان ہزاروں سال پہلے کے کسی زمانے کے کاکروچ ہوں۔یہ تصور انہیں گھبراہٹ میں مبتلا کر دیتا ہے۔

مصنف کا خیال ہے کہ برصغیر کے عوام کو بھی اب ایٹمی جنگ کے نتائج یعنی ایک کی موت کے ساتھ ہی دوسرے کی یقینی ہلاکت کا اندازہ ہو گیا ہے تو پھر کیوں نہ سب مل کر محبت کو عام کرنے کی جدو جہد کریں اور پوری دھرتی کو ایک ملک بنالیں اوراس ملک کے باشندے کہلانے میں خوشی محسوس کرنے لگیں تو شاید ایٹمی جنگ کے سارے خطرات ختم ہو جائیں۔یہی اس کتاب کا مرکزی خیال ہے اوراس مجموعے کی شانِ نزول اس دھرتی پر بقائے نسلِ انسانی کی فکر ہے۔زبان صاف سادہ اور عام فہم ہے لیکن علامتی انداز بیان،استعاروں کی تفہیم نیز تشبیہات اور تلازموں کی تہہ داریاں نہایت غور طلب ہیں۔مصنف کا لب و لہجہ سبک اور پُر خلوص ہے۔اس نوعیت یا اسی طرح کی مثبت قدروں کی حامل تحریریں اس نفرتوں بھرے دور کا تقاضا ہیں۔حیدر قریشی صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے وقت کی ایک اہم ضرورت کی جانب ہمیں متوجہ کرنے کی مستحسن سعی کی ہے۔اس کتاب کی یقیناً خاطر خواہ پذیرائی ہو گی۔



’’(۱۹۸۰ء،۱۹۸۲ءاور۱۹۹۲ء کی لکھی ہوئی) میں اپنی تینوں کہانیاں ایک ساتھ پیش کر رہا ہوں۔ انڈیا اور پاکستان کے ایٹمی دھماکوں کے سیاسی پس منظر سے قطع نظر،میرے لیے یہ نئی صورتحال قدرے اطمینان کا موجب بن رہی ہے کہ دونوں طرف یہ احساس ہونے لگا ہے کہ کسی ایک کی ہلاکت کا مطلب لازمی طور پر دوسرے کی بھی ہلاکت ہے۔اس بات کو اچھے انداز میں کہا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ انڈیا اور پاکستان کا جینا،مرنا اب ساتھ ساتھ ہے۔غور کیا جائے تو یہ ساتھ جینا اور ساتھ مرنا تو محبت کا مقام ہے۔تو پھر کیوں نہ ہم سب مل کر محبت کے اس مقام کو پہچانیں!‘‘

(۱۲/جولائی ۱۹۹۸ء کو لکھے گئے حیدر قریشی کی کتاب **ایٹمی جنگ** کے پیش لفظ سے اقتباس)

سلیم انصاری (جبل پور)

حیدرقریشی کےافسانوں کی حقیقت

حیدرقریشی ایک کثیر الجہت تخلیقی فنکار ہیں۔وہ بیک وقت کامیاب جدید شاعر بھی ہیں اور صاحبِ طرز افسانہ نگار بھی۔اس کے علاوہ ان کے یہاں نظم ونثر کا گہرا تنقیدی شعور بھی بدرجۂ اتم موجود ہے۔حیدرقریشی کے یہاں اردو ادب میں ہیئت ومواد ہر دو سطح پر نئے نئے تجربات کوخوش آمدید کہنے کا پُرخلوص جذبہ بھی موجود ہے۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے پنجابی صنفِ سخن ماہیا کو اردو میں صحیح وزن پر رائج کرنے میں سب سے نمایاں رول ادا کیا ہے،جس کے لئے اردو والے بجا طور پر حیدرقریشی پر فخر کر سکتے ہیں۔

''روشنی کی بشارت'' حیدرقریشی کے ان افسانوں کا انتخاب ہے جو اپنے پیرایۂ اظہار ،موضوعات اور اسلوب کی انفرادیت کے سبب اردو افسانوں میں خصوصیت کا حامل ہے۔روشنی کی بشارت میں شامل افسانے ،جدید افسانوں پر تجریدیت ،ابہام ،انتشار،قنوطیت اور بے ربطگی وغیرہ جیسے تمام الزامات کو ردّ کرتے ہوئے ایک نیا جہانِ معنی خلق کرتے ہیں جس سے حیدرقریشی کی سوچ ،وژن اور تخلیقی صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔حیدرقریشی کے افسانوں کی تفہیم کے باب میں ڈاکٹر فہیم اعظمی کی درج ذیل رائے خاصی اہمیت رکھتی ہے:

''حیدرقریشی الہامی قصص ،اساطیر ،ذاتی اور معاشرتی مسائل کو آپس میں مدغم کر کے ایک ایسا آئینہ تخلیق کرتے ہیں جس میں پیدائش سے موت تک کی زندگی کا عکس نظر آتا ہے۔''

ڈاکٹر فہیم اعظمی کی رائے کی روشنی میں حیدرقریشی کے افسانوں کا مطالعہ کریں تو یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ ان کے یہاں کہانیاں علامتی/اساطیری ہونے کے باوجود کسی نہ کسی سطح پر معاشرتی اور تہذیبی زندگی کے مسائل ومصائب کا براہِ راست اظہار ہیں۔

حیدرقریشی کی کہانیوں کا ٹریٹمنٹ عام کہانیوں سے مختلف اور منفرد ہے۔ان کی بیشتر کہانیوں پر داستانی رنگ غالب ہے مگر ان کے لہجے کا خوشگوار دھیما پن اور اسلوب کی انفرادیت انہیں داستانوں کے ماحول سے الگ بھی رکھتی ہے۔حیدر قریشی اپنے باطن کی روشنی کو تجربے کے منشور سے گزار کر

روحانی/مذہبی عقیدوں کا ایمان افروز اسپکٹرم(SPECTRUM)تخلیق کرتے ہیں،جو یقینی طور پر ان کی کہانیوں میں روشنی کی بشارت کا اعلامیہ ہے۔حیدرقریشی کے یہاں روشنی ایک کلیدی استعارہ ہے جو ان کے افسانوں کے کینوس کو وسیع کر کے ان کی معنویت کے نئے امکانات کو روشن کرتا ہے۔حیدرقریشی اپنی کہانیوں میں بار بار ایک ایسی روشنی کا حوالہ دیتے ہیں جو قلندروں،درویشوں اور مستوں کے قلوب کو منور اور معطر کرتی ہے۔جو انسانوں کو ذات کے اندھیرے سے نکال کر ایمان افروز روحانی جذبوں اور عقیدوں سے معمور کرتی ہے۔

افسانہ''روشنی کی بشارت'' کا مرکزی کردار(جو حیدرقریشی خود ہیں)شہر کے سب سے بڑے بازار میں پہنچ کر اعلان کرتا ہے:

''لوگو!تم نے میری بشارت پر ایمان نہ لاکر خود کو روشنی سے محروم کرلیا ہے۔
نورِبصیرت سے محروم لوگو!تم نے روشنی کی تحقیر کی ہے''(روشنی کی بشارت)

''اچانک ساری روشنیاں گل ہوگئی ہیں اور مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میرا اندھا پن ختم ہوگیا ہے۔
تم جس مصنوعی روشنی کی باسی ہو اس کا طلسم ٹوٹ جائے تو پھر دیکھ لو کیا ہوتا ہے۔
میں اس سے کہنا چاہتا ہوں لیکن کہہ نہیں سکتا کیونکہ روشنیاں پھر آگئی ہیں،میرا اندھا پن بھی آگیا ہے۔'' (اندھی روشنی)

روشنی کی جو لکیر پہلے ابھری تھی وہ اب ایک ہالے کی شکل اختیار کرگئی ہے اور مجھ پر کرن کرن اتر رہی ہے'' (حوا کی تلاش)

''روشنی کا ہالہ ہم دونوں کے جسموں سے گزر کر ہماری روحوں میں اتر جاتا ہے اور ہم دونوں کے اندر سے ایک خوبصورت آواز ابھرتی ہے:اب بتاؤ کہ تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کا انکار کروگے؟'' (حوا کی تلاش)

حیدرقریشی اس روشنی کی بشارت دیتے ہیں جو انسان کے ضمیر کی روشنی ہے،جو خود کو خدا کے حوالے کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔جو انسان کو سچائی کا راستہ دکھاتی ہے۔حیدرقریشی ایک ایسی روشنی کے حوالے سے گفتگو کرتے ہیں جس میں انسان کی ذات اس پر روشن ہوتی ہے۔کہانی''روشنی کی بشارت''میں حیدر

قریشی نے جب سورجوں کا گواہ مٹی کا چراغ ہاتھ میں لے کر روشنی کی بشارت دی تو لوگوں نے تمسخر اڑایا۔ یہاں تک کہ ان کی ماں بھی انہیں تشویشناک نظروں سے دیکھتی ہے۔ان کی بیوی نے بھی سنجیدگی نہیں دکھائی۔ ایسا ہر دور میں ہوتا ہے۔سچائی پر چلنے والے اور سچائی کی راہ دکھانے والے ہمیشہ اقلیت میں ہوتے ہیں۔تکلیفیں اٹھاتے ہیں،اذیتیں برداشت کرتے ہیں اور جن کے یہاں ایمان کی توانائی تازہ ہوتی ہے،جن کے باطن روشن ہوتے ہیں، وہ آخر ایک دن اپنے مقصد میں کامیاب ہوتے ہیں۔

کہانی ''اندھی روشنی'' میں حیدرقریشی نے اس سچ کے اظہار کی کوشش کی ہے کہ دنیاوی عیش و آرام اور آسائشیں حاصل کرنے کی ہوس میں انسان اندھا ہوجاتا ہے،اپنے ضمیر اور باطنی سچائیوں کی توانائی سے محروم ہوجاتا ہے۔''حوا کی تلاش'' میں حیدرقریشی نے بتایا ہے کہ انسان جب خدا کے سامنے خودسپردگی کے احساس سے گزرتا ہے تو روشنی اس کے باطن میں نمودار ہونے لگتی ہے اور وہ رضائے الٰہی کے عظیم جذبے سے گزر کر انکشافِ ذات تک پہنچتا ہے۔

حیدرقریشی کی کہانیوں کا کلیدی کردار بار بار اپنی ذات کی دریافت کے لامتناہی عمل سے گزرتا ہے۔وہ اپنے آپ سے متعدد سوال کرتا ہے،ایسے سوالات قائم کرکے حیدرقریشی نے اپنی کہانیوں کو ایک نئی تخلیقی لذت سے آشنا کیا ہے۔دلچسپ بات یہ کہ ان تمام سوالات کے جوابات بھی ان کی کہانیوں میں ایک کے بعد ایک روشن ہوتے چلے جاتے ہیں۔اس طرح دیکھیں تو حیدرقریشی کی کہانیوں میں نفسیاتی،نظریاتی اور روحانی گتھیوں کو دکھانے اور سلجھانے کا عمل موجود ہے۔حیدرقریشی کی کہانیوں میں ایک اور بات جو سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کی کہانیاں اکثر ایک چھوٹے سے واقعے سے شروع ہوکر،تلاشِ ذات کے سفر سے گزرتے ہوئے روحانی رنگ کے مختلف منظروں میں تبدیل ہونے لگتی ہیں۔

کہانی ''پتھر ہوتے وجود کا دکھ'' بظاہر ایک معمولی سے واقعہ سے شروع ہوتی ہے۔جس میں کہانی کا کردار جو ایک بچہ ہے،جادو کی کتاب سے ایک کھیل پڑھ کر اُسے عملی شکل دینے کی کوشش کرتا ہے۔تبھی پڑوس کی ایک خوبصورت بچی بھی اس کھیل کی حیرتوں میں شامل ہوجاتی ہے۔لیکن جیسے جیسے کہانی آگے بڑھتی ہے،یہ دونوں کردار بھی اپنی سرحدیں عبور کرکے جوانی کے حیرت انگیز تجربات کے گواہ بن جاتے ہیں اور پھر کہانی پر فلسفیانہ رنگ غالب آنے لگتا ہے جس کے ثبوت کے طور پر افسانے کا اختتامی حصہ حاضر ہے:

''شہنائیوں کی دُھن سے میرا وجود سن ہوتا جارہا ہے۔

چہرے کے علاوہ مرا باقی جسم پتھر ہوگیا ہے۔

میری دائیں طرف وہ لمحہ کھڑا ہے جس میں میں نے اپنے اور اس کے بچپن میں پانی میں آگ کا کھیل کھیلا تھا۔وہ ابھی تک پانی میں آگ کو دیکھنے کے بعد مجھے حیرت سے دیکھ رہی ہے۔

میری دائیں طرف وہ لمحہ کھڑا ہے جب روشنیاں اور خوشبوئیں اس کی آنکھوں اور جسم سے اُتر کر میری روح میں رقص کرنے لگی تھیں۔

اس کی ڈولی روانہ ہونے والی ہے اور میں اپنے کہے لفظوں کی تردید کرتا ہوں:

''اس نے سچ کہا تھا۔ہم سب مردہ کیڑے ہیں جو قسمت کے جادوئی پنکھے کی ہوا کی زد میں متحرک ہونے کے سبب زندہ معلوم پڑتے ہیں۔''

اب مجھے اس کی انجانی اداسی کا راز بھی معلوم ہوتا ہے۔

میرا چہرہ بھی پتھر ہونے لگتا ہے۔

لیکن اس سے پہلے کہ میرا سارا چہرہ پتھر ہوجائے اس کے جسم سے میری روح میں اترنے والی خوشبوئیں میری سانسوں میں جم کر مشک کافور کی کئی ٹکیاں سی بن جاتی ہیں۔اس کی غزالی آنکھوں سے طلوع ہونے والی روشنیوں سے ان میں آگ لگتی ہے اور پھر میری آنکھوں کے پانی میں آگ تیرنے لگتی ہے۔اور میں اس پانی میں ڈوب کر اور اس آگ میں جل کر خود کو مکمل پتھر ہونے سے بچانے کی آخری کوشش کرنے لگتا ہوں۔تاکہ زندگی کا کچھ تو بھرم رہ جائے!''

حیدرقریشی ایک ایسے تخلیق کار ہیں جن کے یہاں موضوعات کا تنوع اور رنگارنگی ہے۔وہ نظم و نثر دونوں پر یکساں تخلیقی قدرت رکھتے ہیں۔ بقول دیوندراسر

''حیدرقریشی کی کہانیوں کی دنیا ایسے کرداروں سے آباد ہے،سچائی کا المیہ جن کی قسمت بن چکا ہے۔ایسی کہانیوں میں اس نوع کا سچ نہیں جسے اکثر ہم مجسم سچ،کائناتی سچ،سماجی سچ یا نام نہاد بھوگا ہوا سچ کہتے ہیں کیونکہ ایسی کہانیوں میں دل کا بے انت پاتال ہے،روح کا سارا آکاش ہے،جسم کی حدوں کو توڑتا ہوا تفکر اور قوت متخیلہ ہے''

حیدرقریشی ایک بے حد فعال اور Dynamic تخلیق کار ہیں۔یہی سبب ہے کہ ان کی تخلیقات میں اسلوب اور پیرایۂ اظہار مسلسل ارتقا پذیر رہتا ہے،جو ان کی تخلیقی توانائیوں کی ضمانت ہے۔



''مجھے ان کی ساری تحریریں اچھی لگی ہیں،ان کے خاکوں اور ماہیوں نے براہ راست متاثر کیا۔ان کی تحریروں میں اور بالخصوص افسانوں میں جہاں صوفیانہ ٹچ آتا ہے وہاں ان کا فن اپنے کمال پر ہوتا ہے۔''

(**رضیہ اسماعیل**،برمنگھم،انگلینڈ بحوالہ **انٹرویوز مرتب : سعید شباب** ص۱۴۲)

منشا یاد (اسلام آباد)

''میری محبتیں''

خاکہ نگاری ایک اہم اور دیگر نثری اصناف سے الگ صنفِ ادب ہے جو کم سے کم الفاظ میں کسی حقیقی شخصیت کے نمایاں اوصاف اجاگر کرنے کا فن ہے۔ خاکہ نگار کو اس کے لئے کسی ایسی شخصیت کا انتخاب ہی کرنا چاہئے جس سے اس کا قریبی تعلق ہو اور جس کی عادات واطوار، سوچ اور رویوں سے وہ پوری طرح آگاہ ہو اور اس سے بھی اہم تر بات یہ ہے کہ اس میں دوسروں کی دلچسپی کا کوئی پہلو موجود ہو یا خاکہ نگار دریافت کرنے میں کامیاب ہو جائے۔

حیدر قریشی کے لکھے ہوئے خاکوں پر مشتمل مجموعہ ''میری محبتیں (خاکے اور یادیں)'' سات آٹھ برس پہلے معیار پبلی کیشنز دہلی نے شائع کیا تھا۔اس کے پہلے حصے میں ''اول خویش'' کے عنوان سے اپنے عزیزوں کے دس اور دوسرے حصے میں بھی ''بعد درویش'' کے عنوان سے ادیبوں اور دوستوں کے اتنے ہی خاکے شامل ہیں۔ چونکہ یہ قریبی عزیزوں اور دوستوں پر لکھے ہوئے خاکے ہیں اس لئے خاکہ نگاری کی اوپر دی گئی تعریف پر پورا اترتے ہیں۔سوائے دو تین خاکوں کے جیسے فیض احمد فیض کا خاکہ،جن سے حیدر قریشی کی کم ملاقاتیں ہوئیں اور بے تکلفی کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا۔مگر خوبی یہ ہے کہ انہوں نے نہایت دیانتداری سے جتنا تعلق تھا اتنا ہی بیان کیا ہے اور اپنے پاس سے کچھ شامل کرنے کی،جس کی بہت گنجائش تھی،کوئی کوشش نہیں کی بلکہ وہ اعتراف کرتے ہیں کہ وہ فیض مرحوم کو دور سے دیکھنے والوں میں سے ہیں۔حیدر قریشی نے دانشمندی سے کام لیتے ہوئے خاکوں کے ساتھ یادوں کا اضافہ بھی کر دیا اس لئے اگر کوئی خاکہ فنی یا تکنیکی اعتبار سے خاکہ نگاری کی تعریف پر پورا نہیں اترتا جیسے پرانے ادبی احباب یا زندگی کا تسلسل وغیرہ جو ایک سے زیادہ لوگوں کے بارے میں سرسری معلومات فراہم کرتے ہیں تو '' یادوں'' میں ان کی گنجائش موجود ہے۔

اس سے پہلے میں اپنے دوست اور معروف شاعر اور انشائیہ نگار اکبر حمیدی کے خوبصورت خاکوں کی کتابیں ''قدِ آدم'' اور چھوٹی دنیا بڑے لوگ'' پڑھ چکا ہوں جو ان کے ادیب دوستوں اور عزیزوں

کے بارے میں ہیں ۔حیدر قریشی نے ''بلند قامت ادیب'' کے عنوان سے اکبر حمیدی کا خاکہ بھی لکھا اور بتایا ہے کہ ان کے ساتھ ان کی بہت سی مماثلتیں ہیں۔ بچوں کی پیدائش اور ناموں سے لے کر مختلف اصنافِ ادب سے دلچسپی اور دوستوں کے انتخاب تک مگر تین اہم باتوں میں حیدر قریشی آگے نکل گئے ہیں۔ایک تو حیدر قریشی ہمیشہ سے مدیرانہ صلاحیتوں کا اظہار کرتے رہے ہیں یعنی ان کا مزاج لڑکپن سے ایڈیٹرانہ ہے۔جس میں انٹرنیٹ کی وجہ سے اور وسعت آ گئی ہے۔کبھی آپ ان کی اور ان کے زیرِ اثر بہت سی انٹرنیٹ سائٹس کھول کر دیکھیں تو آپ کو اس میدان میں ان کی مہارت اور صلاحیتوں کا اندازہ ہوگا۔ ہمارے بہت سے شاعر اور ادیب دوستوں کو تو کمپیوٹر کھولنا اور ای میل بھیجنا بھی نہیں آتا مگر وہ دنیا بھر کے ادیبوں شاعروں سے رابطے میں رہتے اور امریکہ، جرمنی، پاکستان اور ترکی میں مقیم ادیب دوستوں سے انٹرنیٹ کانفرنسنگ کرتے رہتے ہیں۔دوسرا شعبہ جس میں وہ اکبر حمیدی کے مقابلے میں آگے ہیں وہ (اللہ انہیں سلامت رکھے) بچوں کی تعداد ہے اور تیسرے وہ خانپور سے جرمنی پہنچ گئے اور نہ صرف ان کی اولاد بلکہ وہ خود بھی ذہنی اور اقتصادی طور پر ترقی کر گئے لیکن اکبر حمیدی نے اپنی ان کمیوں کو تخلیقی کاموں اور کتابوں سے پورا کیا۔یعنی اگر ان کے بچوں کی تعداد کم ہے تو معنوی اولاد نے یہ کمی پوری کر دی ہے مگر مجھے حیدر قریشی کی بہت بڑی خوبی یہ معلوم ہوئی کہ وہ یورپ پہنچ کر بھی جہاں زندگی کے مشاغل اور دلچسپیوں کی نوعیت تبدیل ہوسکتی تھی شاعر،ادیب اور ادبی مدیر بلکہ دوستوں کے دوست رہے اور نہ صرف ''جدید ادب'' کے ذریعے بلکہ اپنے زیر اثر تمام ویب سائیٹس پر اکبر حمیدی اور دیگر پرانے دوستوں کو یاد رکھا اور ان کی تحریروں اور کتابوں کو پروموٹ کرتے رہتے ہیں۔

یوں تو ان کے اکثر خاکوں کے عنوانات بہت خوب اور ہر شخصیت کے عین مطابق ہیں لیکن برگد کا پیڑ (والد)' مائے نی میں کنوں آکھاں (والدہ)' پسلی کی ٹیڑھ (بیوی)' ڈاچی والیا موڑ مہار وے (دادا جی)' اور مظلوم متشدد (نانا جی) بہت ہی موزوں ترعنوانات ہیں۔ دیگر خویشوں یعنی عزیز واقارب کے خاکوں میں' مصری کی مٹھاس اور کالی مرچ کا ذائقہ' (تایا جی)، رانجھے کے ماموں (ناصر ماموں)، محبت کی نمناک خوشبو (آپی)، اجلے دل والا (چھوٹا بھائی طاہر) شامل ہیں۔ پانچوں بچے ایک ہاتھ کی انگلیوں کی طرح ایک ہی مٹھی بعنوان ''زندگی کا تسلسل'' میں بند ہیں۔اسی طرح ادیبوں شاعروں میں، ہم کہ ٹھہرے اجنبی (فیض)' بلند قامت ادیب (اکبر حمیدی)' عہد ساز شخصیت (ڈاکٹر وزیر آغا)' میرا فیاٹ غورث (طاہر احمد)' دوستی کا کمبل (سعید شباب) بہت عمدہ عنوانات ہیں۔اور اگرچہ خان پور کے پرانے ادبی احباب کو ایک ہی مضمون میں بھگتا دیا گیا ہے لیکن اس کے باوجود ان کی ایک ایک پیراگراف میں پوری پوری تصویر اتار کر رکھ دی ہے۔

خاکہ نگاری میں عنوان بہت اہمیت رکھتا ہے کیونکہ یہ عام طور پر کسی شخصیت کی کلید ہوتی ہے جس سے وہ آپ پر منکشف ہوسکتی ہے۔بعض لوگوں کی خوبیاں اور خرابیاں تو سامنے دھری ہوتی ہیں اور ہر کوئی انہیں اس حوالے سے جاننے پہچاننے لگتا ہے جیسے فیض صاحب کی ترقی پسندی اور اعلیٰ درجے کی غزل گوئی، ڈاکٹر وزیر آغا کی علم دوستی اور تخلیقی اور تنقیدی صلاحیتیں اور میرزا ادیب کی سادہ لوحی وغیرہ لیکن بعض لوگوں کے بارے میں بہت غور کرنے پر بھی پتہ نہیں چلتا کہ آخر انہیں کس مقصد کے لئے پیدا کیا گیا اور اللہ میاں کو انہیں دنیا میں بھیجنے کی کیا ضرورت تھی مگر اللہ کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی حکمت ضرور پوشیدہ ہوتی ہے اور ادیب کا کام ہے کہ اسے تلاش کرے کیونکہ کوئی بھی چیز نکمی نہیں زمانے میں اور پھر ادب تو زندگی اور انسان سے محبت سکھاتا ہے اور ایک اچھا ادیب ہر انسان میں خواہ وہ کتنا ہی گرا پڑا اور مردود کیوں نہ ہو کوئی نہ کوئی خوبی یا معنویت تلاش کر لیتا ہے۔ جبکہ حیدر قریشی نے تو زیادہ تر انتخاب ہی ایسے لوگوں کا کیا ہے جن سے ان کا خون کا رشتہ یا کوئی دلی یا جذباتی تعلق ہے اور جنہوں نے عام طور پر بامقصد زندگی گزاری۔

ادیبوں میں اکبر حمیدی کے علاوہ ڈاکٹر وزیر آغا، غلام جیلانی اصغر اور میرزا ادیب کے خاکے بہت عمدہ اور بھرپور ہیں اور اگرچہ انہوں نے غلام جیلانی اصغر کے خاکے پر خود عدم اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے اسے ایک ادھورا خاکہ قرار دیا ہے لیکن اختصار کے باوجود یہ خاکہ پروفیسر غلام جیلانی کے کردار اور شخصیت کو سمجھنے میں بہت مدد دیتا ہے اور یہ اس قدر دلچسپ ہے کہ پہلے جملے ہی سے پڑھنے والے کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے کہتے ہیں:

''پروفیسر غلام جیلانی اصغر سے میری پہلی ملاقات اس زمانے میں ہوئی جب وہ بھرپور جوانی گزار کے لڑکپن کی حدود میں داخل ہو چکے تھے''

میرزا ادیب واقعی بہت اچھے، محبت کرنے والے اور سادہ مزاج انسان تھے۔ حیرت ہوتی ہے کہ اتنی سادگی کے ساتھ وہ ایسے عمدہ افسانے کیسے لکھ لیتے تھے کیونکہ میرے خیال میں افسانہ نگار کو تھوڑا ہوشیار بلکہ چالاک ہونا چاہئے۔حیدر قریشی نے ایک چھوٹی سی بات لکھ کر ان کی سادگی کا پورا نقشہ کھینچ دیا ہے:

''میرزا ادیب نے چولستان کے سحر انگیز واقعات سنے تو بے حد حیران ہوئے پھر معصومیت کے ساتھ کہنے لگے کبھی موقعہ ملا تو میں آؤں گا مجھے چولستان کی سیر ضرور کرانا۔ حالانکہ اگر میرزا ادیب چاہتے تو اپنی حیرت کو اس خیال سے ہی چھپا لیتے کہ یہ نوجوان ادیب کیا سوچیں گے کہ ''صحرا نورد کے خطوط'' اور ''صحرا نورد کے رومان'' لکھ ڈالے مگر صحرا کی شکل تک نہیں دیکھی۔ سادگی اور معصومیت کے یہ انداز اب ادیبوں میں کہاں ملتے ہیں۔ اب تو ہر شخص تیز تلوار ہے اور موقعہ کی تاک میں!''

میرے خیال میں حصہ اول کے خاکے نسبتاً زیادہ پراثر اور دلچسپ ہیں اور ان میں مصنف ہر شخصیت کی کلید دریافت کرنے میں کامیاب ہوگیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں خاکہ نگاری کی ایک اور خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس کی بنیاد سچائی پر استوار ہو اور اس میں فکشن کی ملاوٹ نہ ہو اور یہ بھی کہ شخصیت کی خوبیوں کے ساتھ خرابیاں بھی بتائی جائیں مگر ایسے طریقے اور سلیقے سے کہ کسی کی دل آزاری نہ ہو۔اپنے عزیز و اقارب کے خاکے لکھتے ہوئے دراصل آپ اپنا خاکہ بھی لکھ رہے ہوتے ہیں۔اس لئے اگر اس میں مبالغہ، خود پسندی، تصنع اور فکشن شامل کریں گے تو وہ صاف نظر آ جائے گی اور آپ کی تحریر کو اپنے درجے سے گرا دے گی۔ مگر حیدر قریشی نے سچ کا دامن کہیں نہیں چھوڑا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریر میں متاثر کرنے کی قوت ہے۔ان کے خوبصورت اندازِ تحریر نے اسے اور بھی دلنشین بنا دیا ہے۔

اولاد کے لئے باپ ایک گھنے اور سایہ دار درخت کی مانند ہوتا ہے۔ خاقان خاور مرحوم نے کیا خوب کہا تھا: '' سارے جہاں کی دھوپ مرے گھر میں آ گئی ۔ مجھ پہ تھا جس درخت کا سایہ وہ کٹ گیا''۔اس لئے والد کے خاکے کا عنوان برگد کا پیڑ سے بہتر کیا ہوسکتا ہے۔حیدر قریشی اپنے برگد کے پیڑ کا تعارف اس طریقے سے کراتے ہیں کہ ان کی ظاہری و باطنی شخصیت آنکھوں میں گھوم جاتی ہے:

''ابا جی وضع دار انسان تھے۔ روایات سے محبت رکھتے تھے مگر زمانے کے ارتقا کی سچائی کو مانتے تھے۔1960ء تک پھندنے والی رومی ٹوپی پہنتے رہے۔اس ٹوپی کو تر کی ٹوپی بھی کہتے تھے۔ پھر کلاہ کے ساتھ لنگی باندھنی شروع کی اور جناح کیپ بھی استعمال کرتے رہے۔ آج ابا جی کی ساری زندگی کی طرف نظر دوڑاتا ہوں تو مجھے ان کے اندر بیک وقت ایک دراوڑ، ایک آریا اور ایک عرب بیٹھا نظر آتا ہے''

آگے چل کر وہ ان کی بعض دوسری عادتوں اور خوبیوں کا ذکر کرتے اور بتاتے ہیں کہ دیگر بزرگوں کے برعکس انہیں موسیقی سے رغبت نہیں تھی۔ لیکن اسے شجرِ ممنوعہ بھی نہیں سمجھتے تھے۔لوک گیت اور صوفیانہ کلام سن کر جھومنے لگتے۔ اپنے والد کے بارے میں انہوں نے ایک اور دلچسپ اور راز کی بات بتائی ہے کہ انہوں نے دو شادیاں کی تھیں۔ پہلی نے اس الزام کی بنیاد پر عدالت کے ذریعے طلاق لے لی کی یہ شخص اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں۔ پھر ان کی شادی حیدر قریشی کی والدہ سے ہوئی تو یکے بعد دیگرے دس بچے پیدا ہوئے۔ اور مطلقہ بیوی دوسری جگہ شادی کر کے بھی اولاد سے محروم رہی۔ مگر اپنے ابا کے ساتھ ساتھ وہ اپنے بارے میں بھی کچھ چھپا کر نہیں رکھتے اور اپنے بچپن کے حالات بھی اسی سچائی اور دیانتداری سے بیان کرتے ہیں جو ان کے خاکوں کی اصل خوبی اور کامیابی کا راز ہے:

''یوں تو ہر انسان اپنے بچپن میں فطرت سے بہت قریب ہوتا ہے لیکن مجھے بچپن میں فطرت سے کچھ زیادہ ہی پیار تھا چنانچہ جیسے ہی موقع ملتا الاسٹک والی نیکر اور بٹن بٹنوں والی شرٹ اتار کر فطری لباس

میں گھومتا رہتا۔ایک بار اسی لباس میں گلیوں میں گھومتا پھرتا بہت دور نکل گیا۔وہاں ابا جی اپنے دوست کی دکان پر کھڑے تھے۔ میں جا کر'ابوا' کہتے ہوئے ان کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔وہ سمجھے کوئی اور بچہ ہے جوخواہ مخواہ ان سے چمٹ گیا ہے۔انہوں نے مجھے پرے دھکیل دیا مگر میں پھر لپٹ گیا۔وہ میری طرف غور سے دیکھے بغیر دھکیلتے اور میں بار بار چمٹتا رہا۔اتنے میں ان کے دوست کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔اس نے کہا ''قریشی صاحب یہ تو حیدر ہے''

اپنے والد کی عادات،مزاج اور ہر طرح کی مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کا احوال انہوں نے خوب تفصیل سے بتایا ہے۔اوراس خوبی سے کہ وہ جانے پہچانے اوراپنے اپنے سے لگنے لگتے ہیں۔ان کی وفات کے بعد انہوں نے ایک روحانی کرامت کا ذکر بھی کیا ہے۔اور حالانکہ ان کی زندگی میں ان کی والدہ نے کبھی انہیں بزرگ تسلیم نہ کیا تھا مگر اب وہ بھی حیران تھیں۔حیدرقریشی بتاتے ہیں کہ وفات کے تیئسویں دن،رات نو بجے کے بعد اس کمرے کی کھڑکی سے گلاب کی خوشبو کی تیز لپٹیں اٹھنے لگیں جوان کے اباجی کا ذاتی کمرہ تھا۔ یہ خوشبو پہلے ان کی والدہ نے محسوس کی اورانہیں کمرے میں بلایا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی انہیں بھی گلاب کی تیز خوشبو کا احساس ہوا۔ میں حیدرقریشی کا یہ بیان پڑھ کر تھوڑا سا پریشان ہوگیا اور سوچ میں پڑ گیا کہ میں تو انہیں نہایت عقلی، ریشنل اور سائنسی سوچ کا حامل سمجھتا تھا یہ انہوں نے کرامتوں اور معجزوں کی کیا باتیں شروع کردی ہیں مگر جونہی میں نے آخری جملہ پڑھا،اطمینان کا ایک لمبا سانس لیا۔لکھا تھا:۔۔۔۔۔''یہ خوشبو کیا تھی؟اتنی سی بات ہی کچھ سمجھ میں آتی ہے کہ اگر آنکھ خواب تخلیق کرسکتی ہے تو قوتِ شامہ بھی خوشبو تخلیق کرسکتی ہے''

اپنی والدہ کا خاکہ بھی انہوں نے نہایت ڈوب کر لکھا ہے اور بعض ایسے دلچسپ واقعات کا تذکرہ کیا ہے جس سے نہ صرف والدہ کی سیرت وکردار پر روشنی پڑتی ہے بلکہ ان کا اپنا بچپن بھی نگاہوں میں گھوم جاتا ہے۔ایک بار انہوں نے کسی لڑکے کو گالی دیتے ہوئے سنا جو انہیں بہت پسند آئی اور انہوں نے بھی ارشاد فرمادی۔ان کی والدہ کو پتہ چلا تو ان کی خوب مرمت کی۔اس کے بعد وہ ہمیشہ کے لئے گالی دینا بھول گئے۔ایک اور دلچسپ واقعہ انہی کی زبان سے سنئے:

''بچپن میں امی جی نے ایک دفعہ میری شرارتوں سے تنگ آکر مجھے اباجی کے ساتھ دکان پر بھجوادیا۔اباجی نے وہاں سزا کے طور پر میری ٹنڈ کرادی۔میں خوشی سے چھلانگیں مارتا ہوا گھر آیا اور امی جی سے کہا:امی جی،امی جی میں بھی ابو کی طرح ہوگیا ہوں۔اب میں بھی ابو بن جاؤں گا اور پھر اپنے بچوں کو ڈانٹا کروں گا''

مائیں تو محبت اور مامتا کے سمندر ہوتی ہی ہیں لیکن بہنیں اور بیٹیاں بھی تو محبت کی جھیلیں ہوتی

ہیں جو ہمارے جذبوں کی تہذیب وتطہیر کرتی اور ہماری وحشتوں اور وحشی پن کو کم کرتی ہیں۔انہوں نے والدہ اور بڑی بہن کے بہت اچھے خاکے لکھے۔مگر بیٹوں بیٹیوں کے الگ خاکے نہیں لکھے تاہم سب کا تفصیل اور محبت سے ذکر ضرور کیا۔بلکہ عزیز واقربا کے خاکوں پر مشتمل یہ پوری کتاب رضوانہ اور درثمین بیٹیوں کے نام کردی اور ایک چھوٹی سی نظم (ماہیا) کے ذریعے کیا خوبصورت انتساب اور اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔بیٹیوں کو ہم چڑیاں تو کہتے ہی ہیں جنہوں نے ایک روز بابل کی چھتری سے اڑ جانا ہوتا ہے مگر حیدرقریشی نے کیا خوب کہا:

: مری چڑیوں کی جوڑی ہے/اک پہلوٹھی کی/اک پیٹ کھروڑی ہے

اور اگر مائیں سمندر اور بیٹیاں جھیلیں ہوتی ہیں تو بیٹے بھی تو دریا ہوتے ہیں جو ہمارے حال اور مستقبل کی زمینوں کو سیراب کرتے،آباد اور ہرا بھرا رکھتے ہیں۔بیٹوں کے بارے میں بھی کیا خوب کہا ہے: دریا کی روانی ہے/اب میرے بیٹوں میں/مری گزری جوانی ہے

ان کے دادا جی کا خاکہ پڑھتے ہوئے ان کی پوری شخصیت،ان کا عہد،لوگوں کی سادگی اور اعتقادات سب کچھ زندہ ہوجاتا ہے۔لیکن ایک بار ان کے دادا جی سچ مچ مر کر زندہ ہوگئے تھے۔ہوا یوں کہ ان کے دادا جی معمولی سے بیمار ہوئے اور فوت ہوگئے۔گھر میں عزیز واقارب جمع ہوگئے۔دادا جی کو غسل دے دیا گیا مگر وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔وفات کی خبر سن کر آئے ہوئے سارے لوگ خوفزدہ ہوگئے۔کچھ چیختے چلاتے گھر سے نکل بھاگے،ایک دو عزیز دہشت سے بے ہوش ہوگئے۔دادا جی اٹھ کر بیٹھ گئے اور کہنے لگے کہ دوسری گلی سے ان کے ہم نام اللہ رکھا کمہار کا پتہ کراؤ۔وہاں سے پتہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ ابھی ابھی فوت ہوگیا ہے۔یہ سب دراصل ناموں کے مغالطے سے ہوا تھا۔موت کے فرشتوں کو عالمِ بالا میں جاکر اپنی غلطی کا علم ہوا تو وہ ان کے دادا جی اللہ رکھا قریشی کو پھر اس دنیا میں واپس چھوڑ گئے اور اسی وقت اللہ رکھا کمہار کو لے گئے۔حیدرقریشی اپنے بزرگوں کی کسی بات کو جھٹلاتے یا رد تو نہیں کرتے مگر اس ساری صورتِ حال پہ مختصر سا تبصرہ کردیتے ہیں جس سے ان کی سوچ اور موقف کا پوری طرح اندازہ ہوجاتا ہے کہتے ہیں:''اس قصے کا اصل بھید کیا تھا؟یہ تو شاید کوہِ ندا کے دوسری سمت جاکر ہی معلوم ہوسکے۔مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ سفید کپڑوں والے سارے فرشتے سرائیکی زبان بول رہے تھے۔ظاہر ہے انہیں علم تھا کہ ہمارے دادا جی صرف سرائیکی زبان ہی جانتے ہیں''

ان کے دادا جی تو ایک سادہ اور کسی قدر درویش منش انسان تھے۔کسی سائل کو خالی ہاتھ نہ لوٹاتے تھے ایک روز ان کے پاس کچھ بھی نہیں تھا ایک سائل آگیا تو اسے اپنی قمیص اتار کردے دی۔لیکن اس کے برعکس نانا جی زبردست شخصیت کے مالک تھے۔اور''مظلوم متشدد'' کا عنوان ان کی شخصیت

کوکوزے میں دریا بند کرنے کے مترادف ہے۔ وہ ان کی تشدد پسندی کی وجوہات بھی بتاتے ہیں کہ نوعمری میں انہوں نے اپنا مسلک تبدیل کرلیا تھا جس کی وجہ سے ان کے بڑے بھائیوں نے ان پر بے پناہ تشدد کیا تھا جس کے ردعمل میں ان کا مزاج بھی متشددانہ ہو گیا۔ یوں بھی ہر سیلف میڈ انسان تھوڑا بہت متشدد ہوتا ہے مگر ان میں حسِ مزاح بھی تھی اور آخری عمر میں مزاج میں نرمی آ گئی تھی۔ وہ حکمت بھی کرتے تھے اور انہوں نے اپنی دوائیوں کے نام بھی خود ہی بنا رکھے تھے مثلاً قبض کشا گولیوں کا نام تھا ''پیٹ کا جھاڑو''۔ اسی طرح مردانہ کمزوری کے ایک نسخے کا نام ایٹم بم تھا اور دوسرے نسخے کا نام تھا ہائیڈروجن بم عرف مردہ کو زندہ کرنا۔ حیدر قریشی نے خلقِ خدا کی بھلائی کے لئے ان کا ایک نسخہ جوں کا توں درج بھی کر دیا ہے۔ مگر کسی گارنٹی کے بغیر:

''مستگی رومی ایک تولہ، دودھ برگد ایک تولہ، شنگرف رومی ایک ماشہ، انڈے کی زردی ایک عدد، افیون تین ماشے، سم الفار ایک ماشہ، تمام چیزوں کو کونڈی میں ڈال کر خوب رگڑیں۔ چنے کے برابر گولی بنائیں۔ ایک گولی کے ساتھ ایک چھٹانک دیسی گھی یا آدھ کلو دودھ لیں۔ فراغت کے لئے نمک چاٹنا ضروری ہے۔ اس نسخے کو آزمانے والے اپنی ذمہ داری پر آزمائیں البتہ گولیاں مفید ثابت ہوں تو مجھے بھی پندرہ بیس گولیاں ضرور بھیج دیں''

حیدر قریشی اپنے نانا جی کے بارے میں اور بہت سے دلچسپ واقعات سناتے ہیں:

☆ نانا جی نہانے سے سخت پرہیز کرتے تھے۔ صرف عید کی عید نہاتے۔ ایک دفعہ کہنے لگے'' نلکا چلاؤ میں نے وضو کرنا ہے۔ نانا جی نے اس وقت صرف چادر اور واسکٹ پہنی ہوئی تھی۔ میں نے نلکا چلانا روک کر کہا'' نانا جی نہا کیوں نہیں لیتے؟'' مسکرا کر میری طرف دیکھا اور کہنے لگے:'' بیٹے جب سے تمہاری نانی مری ہے مجھے نہانے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ چلو تم نلکا چلاؤ اور وضو کراؤ''

☆ ایک بار شرط لگائی تو دس کلو گوشت کھا گئے اور ایک دفعہ گنے کے رس کی پوری بالٹی پی گئے۔

☆ کبھی ہم پوچھتے کہ نانا جی آپ کہاں تک پڑھے ہیں؟ پنجابی لہجے میں اس طرح کہتے ایویں پاس ہوں کہ لگتا کہہ رہے ہیں ایم۔ اے پاس ہوں

حیدر قریشی کی زیرک نگاہی بے معنویت میں بھی معنویت دریافت کر لیتی ہے جیسے انہوں نے اپنے تایا جی کی زندگی کے معنی تلاش کر لئے جو دنیاوی طور پر ایک طرح سے ناکام زندگی گزار کر بے اولاد فوت ہوئے۔ انہوں نے دو شادیاں کیں مگر دونوں ناکام ہو گئیں۔ پہلی کے ساتھ وہ زیادتیاں کرتے رہے دوسری نے ان کے ساتھ زیادتی کی اور ان کے راستے الگ ہو گئے۔ ہر سادہ لوح اور نیک دل شخص کی طرح آپ بھی ''لائی لگ'' تھے اور آپ کو مٹی سے اتنی محبت تھی کہ گھر اور گھر سے باہر کچی زمین پر آلتی پالتی

مار کے بیٹھتے بلکہ بعض اوقات اسی طرح زمین پر دراز بھی ہو جاتے۔ مجھے ان کا خاکہ پڑھ کر ان کی سادگی پر بہت پیار آیا۔ شاید اس لئے کہ میرے اپنے تایا جی بھی ایسے ہی سادہ شخص تھے اور حیدر قریشی کے بابا جی کی طرح موسیقی سے ان کو بھی بہت لگاؤ تھا۔ حیدر قریشی کے تایا جی نے اپنی جائداد اپنی زندگی ہی میں بھائی بھتیجوں کے حوالے کر دی۔ ایسے جی دار، زندہ دل، اور معصوم فطرت لوگ اب کہاں ملتے ہیں۔ آیئے بابا جی (تایا جی) سے ملتے اور حیدر قریشی سے ان کے بارے میں مزید کچھ معلوم کرتے ہیں:

☆'' ابا جی نے زندگی ایک مقالہ نگار کی طرح بسر کی تو بابا جی نے انشائیہ نگار کی طرح گزاری۔ بابا جی نے بھرپور جوانی بسر کی۔ ابا جی اور بابا جی دونوں ایک دوسرے کے نیگیٹوز تھے۔ ابا جی کے مزاج کے برعکس بابا جی خواتین کی محفلوں میں بیٹھ کر ہمیشہ خوش ہوتے۔ نماز کے قریب نہیں پھٹکتے تھے۔ کبھی زور لگا کر فجر کی نماز پڑھا دی تو سارا دن بہانے بنا بنا کر لڑتے۔ جمعہ کا دن آتا تو صبح سویرے ہی ان کی طبیعت خراب ہو جاتی اور عید کے موقعوں پر تو احتیاطاً ایک دن پہلے ہی بیمار ہو جاتے۔ روزوں کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ ایک دفعہ میں نے انہیں کہا'' بابا جی تین دن بعد رمضان شریف کے روزے شروع ہو رہے ہیں'' بابا جی میری شرارت کو بھانپ گئے۔ پورے اعتماد کے ساتھ بولے:'' اللہ کے نیک بندے روزے رکھیں گے۔ ہم تو بڑے گنہگار ہیں''

☆ ٹی وی پر نور جہاں اور مسرت نذیر کے نغمے بڑے شوق سے سنتے بلکہ دیکھتے۔ نظر کمزور ہو گئی تو ٹی وی دیکھنا چھوڑ دیا مگر بابا جی کے ''حسنِ نظر'' میں کمی نہیں آئی۔ ایک بار ٹی وی والے کمرے تک پہنچتے پہنچتے نور جہاں کا گانا ختم ہو گیا اور بابا جی الٹے پاؤں یوں لوٹ گئے جیسے ملکہ ترنم سے کہہ رہے ہوں ''اچھا اگلی بقر عید پر سہی''

حیدر قریشی شاعر، افسانہ نگار اور انشائیہ نگار بھی ہیں اور ان کی یہ تینوں خصوصیات ان خاکوں میں جمع ہو گئی ہیں۔ ان میں جا بجا بہت سے چھوٹے چھوٹے خوبصورت اور خیال انگیز افسانے بھی مل جاتے ہیں جیسے انہوں نے اپنے ماموں ناصر کا واقعہ لکھا ہے کہ وہ کہیں بھی ہوتے ہر سال بہار کے دنوں میں انہیں ڈسنے کے لئے ایک ناگن آیا کرتی تھی جس کے محبوب کو ان کے ملازموں نے ہلاک کر دیا تھا۔ یوں بھی اس واقعہ میں بلا کی افسانویت تھی مگر ان کے اندازِ نگارش نے اسے اور بھی دل آویز بنا دیا ہے۔ ایک شاعر کی حیثیت سے انہوں نے کثرت سے شعروں کا موزوں اور برمحل استعمال کیا ہے اور ہر خاکے یا مضمون کے آغاز میں ان کا اپنا ایک شعر درج ہے۔ پھر والدہ کے خاکے میں انہوں نے ایک ساتھ تین نظمیں شامل کی ہیں۔ ایک انشائیہ نگار کے طور پر ان کے خاکوں میں بہت سے انشائی ٹکڑے موجود ہیں۔ بلکہ یہ خاکے ان کے شوخ اور شگفتہ جملوں سے ہی دلچسپ بنے ہیں لیکن مجھے لگتا ہے حیدر قریشی کو شوخی اور

لطافتِ بیان کا ذوق اپنے ناناجی سے ورثے میں ملا ہے۔ان گنت شوخ اور پر لطف جملے ان کی پوری کتاب میں جابجا بکھرے پڑے ہیں۔ان کے چند ایسے ہی شوخ اور شرارت آمیز جملے ملاحظہ کیجئے:

☆میری زندگی میں اتوار کو بڑی اہمیت حاصل ہے میری اور مبارکہ کی پیدائش اتوار کو ہوئی۔ ہمارا نکاح بھی اتوار کو ہوا۔پہلی بیٹی رضوانہ بھی اتوار کے دن پیدا ہوئی ۔ پہلا بیٹا شعیب بھی اتوار کے دن پیدا ہوا ۔آخر حکومت نے تنگ آکر اتوار کی سرکاری چھٹی ختم کر دی اور چھٹی کے لئے جمعہ کا دن مقرر کر دیا گیا۔

☆جب میں چھ برس کا تھا اور مبارکہ دو سال کی تھی کسی تقریب میں سب جمع تھے بڑی ممانی نے لاڈ سے پوچھا کہ کس سے شادی کرو گے۔ میں نے بڑے اعتماد کے ساتھ مبارکہ کی طرف اشارہ کر دیا۔بچپن کے اس واقعہ کے حوالے سے میں نے ایک دفعہ مبارکہ سے کہا ’’بچپن کی معمولی سی غلطی کی کتنی بڑی سزا ملی ہے‘‘اس نے فوراً کہا ’’غلطی آپ کی تھی ،سزا میں بھگت رہی ہوں‘‘

☆’’بعض والدین کی اولاد نالائق ہوتی ہے۔میں وہ خوش نصیب ہوں جو پانچ اچھے بچوں کا نالائق باپ ہوں‘‘

☆داداجی کے بارے میں مشہور تھا کہ کسی سائل کو خالی ہاتھ نہ جانے دیتے تھے۔اباجی نے بتایا تھا کہ ایک دفعہ داداجی کے پاس کچھ بھی نہیں تھا کہ ایک سائل آ گیا۔داداجی نے کچھ سوچا اور پھر اپنی قمیص اتار کر اسے دے دی۔خدا کا شکر ہے کہ اس کے فوراً بعد کوئی اور سائل نہیں آ گیا کیونکہ اس وقت داداجی کے جسم پر صرف ایک چادر تھی جو انہوں نے نیچے باندھی ہوئی تھی اور یہ تو طے ہے کہ انہوں نے سائل کو بہر حال خالی ہاتھ نہیں جانے دینا تھا۔

☆ایک صاحب اپنے دوست سے شکایت کر رہے تھے کہ میرا بیٹا پڑھائی کی طرف بالکل توجہ نہیں دے رہا۔زیادہ تر یونیورسٹی کی لڑکیوں کے ساتھ گھومتا رہتا ہے۔کبھی یونیورسٹی کے لان میں،کبھی کنٹین میں،حتیٰ کہ یونیورسٹی سے باہر بھی۔اگر مجھے علم ہوتا کہ یونیورسٹی میں یہی کچھ ہوتا ہے تو اسے دوکان پر بٹھا کر بزنس میں لگا دیتا اور خود یونیورسٹی میں داخلہ لے لیتا۔

ایسے ہی شوخ اور شگفتہ جملوں میں وہ بہت گہری اور فکری باتیں بھی کہہ جاتے ہیں۔اپنے ماموں کے خاکہ میں عالمی سیاست کے حوالے سے کہتے ہیں:

☆اس وقت عالمی امن کی خرابی میں سارا قصور ان بڑے ملکوں کا ہے جو خواہ مخواہ ’ہیر کے مامے‘ بنے پھرتے ہیں جبکہ دنیا کو اس وقت خاص طور پر رانجھے کے ماموؤں کی ضرورت ہے۔یعنی ماموں ناصر جیسے لوگوں کی ضرورت ہے۔

حیدر قریشی نے خاکہ نگاری کے فن کو محض شوخی ،شگفتگی اور تعارف وتبصرہ تک محدود نہیں

رکھا۔ان میں نہایت سنجیدہ معاملات اور دانشورانہ نکتے بھی پیدا کئے ہیں۔اپنے چھوٹے بیٹے کے بچپن کے احوال میں وہ اس کے معصومانہ تجسس کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

’’کوئی زیادہ سے زیادہ کتنا بڑا ہو سکتا ہے اور اس لحاظ سے اللہ میاں کتنا بڑا ہے، یہ جاننے کے لئے ٹیپو نے اپنے دونوں بازو کھولے اور انہیں جس حد تک پیچھے لے جا سکتا تھا، لے جا کر پوچھا ’’کیا اللہ میاں اتنے بڑے ہیں؟بس اسی لمحے میں مختلف مذاہب اور فرقوں کے خدا کے بارے میں عقائد اور تصورات مجھ پر آئینہ ہو گئے۔مجھے محسوس ہوا کہ سارے مذہبی لوگ ننھے منے معصوم بچوں کی طرح اپنی اپنی بانہیں پھیلائے کھڑے ہیں۔جس کی بانہیں جہاں تک جا سکی ہیں اس نے اسی حد تک خدا کو بڑا سمجھ رکھا ہے کیونکہ اس سے زیادہ بڑائی اس کی سمجھ میں ہی نہیں آ سکتی۔تاہم اس سے مجھے تمام مذاہب کی خدا کے معاملے میں سچی جستجو اور محبت کا احساس ضرور ہوا۔یہ الگ بات کہ اس کی ہستی کسی بھی عقیدے اور تصور سے بڑھ کر ہے‘‘

اس میں ایک تو بچے کے متجسسانہ ذہن‘ مزاج اور عادت کے بارے میں پتہ چلتا ہے کہ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات اور دوسرے اس میں خدا کو سمجھنے کے بارے میں مختلف مذاہب کے لوگوں کے حوالے سے ایک گہری بات کہی گئی ہے۔یہ ایک ایسا فکری نکتہ ہے جو بہت سی بحثوں اور دلائل کے انبار پر بھاری ہے۔اس سے میرے دل میں فکری حوالے سے ان کی توقیر میں مزید اضافہ ہوا ہے۔میں سمجھتا ہوں کہ ان سب خصوصیات کی روشنی میں میری محبتیں‘‘ خاکوں کا ایک بہت ہی خوبصورت اور خیال انگیز مجموعہ اور خاکہ نگاری کے فن میں ایک اہم اضافہ ہے۔☆☆

آپ کی بھیجی ہوئی ’’میری محبتیں‘‘ مجھے مل گئی ہے۔یقیناً یہ کتاب کا کمال ہے کہ اسے پڑھنا شروع کیا تو پڑھتا ہی گیا۔اور اس وقت تک کسی اور طرف توجہ دینے کا ہوش ہی نہ رہا جب تک کہ وہ ختم نہ ہو گئی۔آپ کی ’’محبتیں‘‘ پڑھی تو آپ کے قلم اور مشاہدہ کا قائل ہونا پڑا۔**محمود ہاشمی** (برمنگھم،انگلینڈ)

(مکتوب مطبوعہ **حیدر قریشی کی ادبی خدمات** مرتب پروفیسر نذر خلیق ص ۲۲۰)

آپ کی کتاب ’’میری محبتیں‘‘ دیکھنی شروع کی ہے۔لگتا ہے آپ کے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے۔کہہ سکتے ہیں اور کہنے کا یارا بھی ہے۔میرا دل چاہا کہ آپ کو بتاؤں کہ جو پڑھا ہے‘پسند آیا۔آپ نے بڑی مشکل باتیں بڑی آسانی سے لکھ دی ہیں‘ آپ کو اس کی داد ملے گی۔۔۔۔ بڑی بے ساختگی ہے،روانی ہے اور گندھی ہوئی خوشگواریت لاجواب ہے۔۔۔آپ کی نثر میں شاعروں سے اچھی اور زیادہ شعریت ہے۔

مقصود الٰہی شیخ (بریڈفورڈ،انگلینڈ) نذر خلیق اور وسیم انجم کی کتابوں سے دو اقتباس

فاروق شکیل (حیدرآباد،دکن)

’’میری محبتیں‘‘۔محبت بھری بیاض

محبت ایسا پھول ہے جب دلوں میں کھلتا ہے تو احساسات کو معطر کر دیتا ہے،فکر کے زاویوں کو روشن کر دیتا ہے۔محبت چاند ہے،نغمہ ہے،شعر ہے،سمندر ہے۔محبت کے ساز پر جب زندگی نغمہ سرا ہوتی ہے تو وجود مسحور ہو جاتا ہے اور جب محبتوں کی خوشبو قرطاس پر پھیلتی ہے تو ’’میری محبتیں‘‘ ہو جاتی ہیں۔یہ محبتیں دیارِ غیر کی خوبصورت نامور شخصیت حیدر قریشی کی ہیں جو اپنے وجود میں خاکوں اور یادوں کی خوشبو بکھیر رہی ہیں۔دیارِ غیر میں اردو کی آبیاری کرنے والوں میں حیدر قریشی ایک اہم نام ہے،جو نہ صرف سخن کے پھول کھلاتے ہیں بلکہ نثر کی خوشبو سے بھی اردو کی وادیوں کو مہکاتے ہیں۔’’میری محبتیں‘‘ان کے خاکوں اور یادوں کی خوشبو بھری بیاض ہے۔حسین سرورق پر گلاب اور دوسرے پھولوں کی تصویروں ہی سے درون کتاب کی مہک آتی ہے۔اس کتاب میں حیدر قریشی کی ذات وشخصیت سے وابستہ و پیوستہ شخصیتوں کی محبتیں مسکراتی ہیں۔ترتیب فہرست میں بعنوان ’’اوّل خویش‘‘ کے تحت ماں،باپ،دادا،نانا، تایا،ماموں،بہن،چھوٹا بھائی اور ان کے اپنے بچوں پر خاکے ہیں۔دوسرا باب ’’بعد درویش‘‘ کے تحت ادبی شخصیتوں پر تحریریں ہیں جن میں میرزا ادیب،فیض احمد فیض،ڈاکٹر وزیر آغا،غلام جیلانی اصغر،اکبر حمیدی،عذرا اصغر،سعید شباب،محمد اعجاز اکبر،طاہر احمد اور خانپور کے احباب شامل ہیں۔

پشت ورق پر اشفاق احمد اور جوگندر پال کے تاثرات ہیں۔اشفاق احمد نے لکھا ہے:

’’ولایتی زبانوں میں ایسے اسکیچ اپنے اپنے انداز میں بہت ملتے
ہیں لیکن اردو میں ’’میری محبتیں‘‘ اپنی نوعیت کی واحد کتاب ہے‘‘

جوگندر پال رقمطراز ہیں:

’’حیدر قریشی کا ذہن زرخیز ہے اور منہ کھٹی میٹھی باتوں سے لبریز۔حیدر قریشی چونکہ پورا منہ کھول کر جی جان سے بات کرتا ہے اس لیے اس کی تحریر برجستہ اور غیر مبہم ہوتی ہے اور قاری اس میں شامل ہو کر محسوس کرنے لگتا ہے کہ اس کے خاکے میں ممدوح اسی کی جان پہچان والوں میں سے ہے‘‘

جوگندر پال نے حیدر قریشی کے فن کی سچی عکاسی کی ہے۔کتاب کے مطالعہ نے واضح کر دیا کہ حیدر قریشی کے قلم سے محبتیں ٹپکتی ہیں اور محبتوں کی بارش میں بھیگ کر قارئین کے احساسات بھی حیدر قریشی کے پیکر میں ضم ہو جاتے ہیں،گویا قاری خود کو حیدر قریشی تصور کرنے لگتا ہے۔

حیدر قریشی کی تحریر میں مقناطیسی کیفیت ہے جو قارئین کو پیار کی ڈور سے باندھے ہوئے ان بستیوں میں لے جاتی ہے جہاں کی مٹی میں مہر و وفا کی مہک ہے اور وہ کردار ہیں جو ابا جی،امی جی،دادا جی،نانا جی،تایا جی،ماموں ناصر،آپی،مبارکہ،چھوٹے بھائی طاہر اور بچوں کی صورتوں میں نظر آتے ہیں۔ ان تمام سے مل کر اپنائیت کا ایسا احساس جاگتا ہے جیسے وہ سب ہمارے اپنے ہی ہیں۔حیدر قریشی کی تحریریں جہاں رس بھری لگتی ہیں وہیں تیکھا اور کھرا انداز بھی جاذبیت رکھتا ہے۔امی جی کے خاکے کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو جس میں حیدر قریشی کے کمال فن کا جادو نظر آتا ہے۔

’’امی جی فوت ہوئیں تو میں ساکت ہو گیا۔آنکھیں ڈبڈبا گئیں مگر ساون بھادوں کی وہ برسات نہ ہوئی جو دو سال پہلے ابا جی کی وفات پر ہوئی تھی۔اس بارے میں مجھے ابھی تک ایک مجرمانہ سا احساس ہے۔کبھی سوچتا ہوں ابا جی کو امی جی کی ہم سے زیادہ ضرورت تھی۔شاید اسی لئے موسلا دھار بارش نہیں ہوئی۔کبھی خیال آتا ہے کہ میں تو امی جی کے حصے کا بھی ابا جی کی وفات پر ہی رو چکا ہوں کیونکہ امی جی تو ابا جی کی وفات کے ساتھ ہی فوت ہو گئیں تھیں۔وہ تو صرف دعاؤں کا ایک مجسمہ تھا جو ہمارے ساتھ تھا،اب وہ بھی نہیں رہا۔لیکن کبھی کبھی جب ماں کے سمندر وجود اور اپنے جزیرے پن کا احساس جاگتا ہے تو مجرمانہ احساس جیسے زائل ہونے لگتا ہے۔‘‘

’’بعد درویش‘‘میں اردو کی نامور شخصیتوں اور احباب کے خاکے ہیں جن سے حیدر قریشی کی ذہنی،قلبی یا قلمی وابستگی رہی ہے۔ان خاکوں میں بھی ان کے تخلیقی جوہر چمکتے نظر آتے ہیں جو قارئین کے ذہنوں کے کینوس پر ابھر کر حیدر قریشی کی محبت بھری یادوں کے نقوش ثبت کرتے ہیں۔

بے شک ’’میری محبتیں‘‘اردو پرستاروں کے لیے محبتوں کی حسین سوغات ہے۔☆☆

معاصر اردو ادب کی بہت سی شخصیات اپنی داخلیت زدگی کی وجہ سے اپنے عہد کے تجربہ کردہ انسانوں کے مسائل کو گرفت میں لانے سے قاصر رہی ہیں۔حیدر قریشی نے اپنی نثری اور شعری تخلیقات میں ذات اور سماج کے معاملات کو یکجا کرنے کے لئے جدید اسالیبی تنوع سے بھرپور کام لیا ہے۔ان کا ادبی کام باسی کڑھی میں ابال کی مثال نہیں ہے۔حیدر قریشی نے جدید اردو نثر کو تازہ کاری کی ایک پُر تاثیر لہر سے آشنا کیا ہے(تاثرات **ڈاکٹر سعادت سعید** بحوالہ ’’حیدر قریشی سے لیے گئے انٹرویوز‘‘ص ۱۲۸)

سلطان جمیل نسیم (کینیڈا)

کھٹی میٹھی یادیں

ہفتہ بھر پہلے کی بات ہے حیدر قریشی صاحب کی ای میل موصول ہوئی جس میں یہ حکم دیا گیا کہ میں ''کھٹی میٹھی یادیں'' پڑھ ڈالوں....تو بغیر کوئی وجہ معلوم کئے میں نے پڑھنا شروع کر دیا،اس لئے کہ سبق یہی ملا ہے کہ اچھی باتیں سننے اور اچھی چیزیں پڑھنے میں ذرا تاخیر نہیں کرنا چاہیئے کہ اِن سے ذہنی پراگندگی دور ہوتی ہے،اور دل و دماغ بہجت آمیز روشنی سے منور ہو جاتے ہیں چنانچہ میں کبھی بھی پڑھنے کے ایسے سنہری مواقع ضائع نہیں کرتا ہوں۔

اپنی کھٹی میٹھی یادوں کو حیدر قریشی نے عنوانات کے خوش رنگ اور مختلف پیمانوں میں بھر دیا ہے کہ ادب کا کوئی پیاسا جس پیمانے کی پیاس محسوس کرے پہلی سانس میں اُسی کو پی لے۔میں بھی چاہتا تو یہی تھا کہ جس ترتیب سے ''کھٹی میٹھی یادیں'' کا میخانہ سجا ہے اُسی ترتیب سے میں بھی اپنی تشنگی دور کروں،لیکن میں نے مروجہ طریقہ اختیار کرنے کے بجائے سب سے پہلے آخری پیمانے کو اٹھا لیا۔جس پر لکھا تھا،''میری عمر کا ایک سال'' اس ایک پیمانے نے تو چکرا کے رکھ دیا۔حیدر قریشی نے صرف ایک برس میں جو کام کئے وہ پڑھنے سے میری تو سانس پھول گئی،یہ آدمی ہے یا جن ہے۔میں ہفتہ عشرے میں دو چار صفحات لکھ لوں،تو سرشار سا ہو جاتا ہوں۔اور حیدر قریشی نے تو ادب کے ساتھ انٹرنیٹ اور جدید ادب کی ادارت کا بھی بوجھ اٹھا رکھا ہے اور اپنے گھر کے ایک کمرے کو بیوی کے لئے سوکن کا کمرہ بنا رکھا ہے۔

ویسے کتاب کا اور بیوی کا تعلق سوکن جیسا ہی ہوتا ہے۔لیکن کچھ لوگ ایسے ہوشیار ہوتے ہیں کہ بیوی کو شیشے میں اتار لیتے ہیں کہ وہ اکراہِ دلی کے ساتھ سہی شوہر اور کتاب کو ساتھ ساتھ دیکھنے کی عادی ہو جاتی ہے۔خواتین عام طور سے مادیت پسند.. یا مادیت پرست ہوتی ہیں۔دولت کمانے کے لئے مرد کو پردیس تو بھیج دیتی ہیں لیکن کتاب کے ساتھ اکیلا چھوڑنا گوارا نہیں کرتی ہیں۔حیدر قریشی نے خدا جانے اپنی بیگم پر کیا جادو کیا ہے جو اپنے گھر میں اُس نیک بی بی نے ''سوکن'' کا کمرہ بنوا رکھا ہے اور میاں کے لئے چائے پانی بھی وہاں بھیجتی رہتی ہیں۔

کھٹی میٹھی یادیں'' کے تعلق سے میں نے ایک بات یہ لکھی ہے کہ قریشی صاحب نے اپنی سب یادوں کو اُن کے تلخ اور شیریں ذائقے کے حساب سے مختلف پیمانوں میں ڈھال رکھا ہے۔اس کا ایک فائدہ لکھنے والے کو یہ ہوتا ہے کہ وہ عنوان کے رنگ سے مطابقت رکھتی ہوئی یادوں کو کسی دوسرے پیمانے میں نہیں ڈالتا۔یوں ہر پیمانے کی شراب خالص ہوتی ہے۔کاک ٹیل نہیں بن جاتی۔ اِن خوش رنگ پیمانوں ہی کی وجہ سے یادوں کا ذائقہ کھٹا میٹھا بھی ہو گیا ہے اور ایک ساتھ پی جانے کا احتمال بھی ختم ہو گیا ہے،پھر اِن ذائقوں کی وجہ سے یہ خوبی بھی پیدا ہو گئی ہے کہ ہر پیمانے کے ساتھ ساتھ پڑھنے والے کو اپنی یادوں کے میخانے بھی یاد آجاتے ہیں اور وہ حیدر قریشی کی کھٹی میٹھی یادیں پڑھتے پڑھتے اپنی تلخ و ترش یادوں کا ذائقہ بھی چکھنے لگتا ہے....جیسے میں....میرے ساتھ تو یہ ہوا کہ تقریباً ہر پیراگراف پڑھنے کے بعد ذہن کے اندھیرے میں پڑی ہوئی اپنی کوئی بھولی بسری یاد،یکا یک جگمگ کرتی ہوئی سامنے آتی رہی ہے۔لیکن اِس کے باوجود حیدر قریشی صاحب کی ایک برس کی ادبی کارگزاریوں کی روداد پڑھ کر پسینہ بھی آیا رشک بھی۔

۱۳/جنوری ۲۰۰۳ سے ۱۳/جنوری ۲۰۰۴ تک حیدر قریشی نے جہاں اور بہت سے کام سرانجام دیئے وہاں ایک بڑا کام یہ کیا کہ اپنی بارہ کتابوں پر مشتمل کلیات کی پروف ریڈنگ مکمل کی۔اِس مشکل کا احساس مجھے یوں ہوا کہ میں اپنی کوئی تحریر دو چار بار لکھنے کے بعد ہی اشاعت کے لئے دیتا ہوں۔پھر کسی رسالے یا کتاب میں شامل ہونے کے بعد محض پروف ریڈنگ کے لئے پڑھنا میرے بس کی بات نہیں،اور حیدر قریشی نے اپنی ایک دو کتابوں کی نہیں بلکہ پوری ایک درجن کتابوں میں شامل تمام تحریروں کی پروف ریڈنگ کی....شاباش لڑکے تو جواں مردوں سے بازی لے گیا!اس اہم کام کے علاوہ،نہ صرف حج کیا بلکہ حج کی روداد بھی تحریر کی۔۔تین غزلیں اور تین نظمیں کہیں۔۔(جبکہ چند نظمیں اور افسانے بھی لکھے اور جب وہ اپنے معیار کے مطابق نظر نہیں آئے تو اُن کو تلف کر دیا) اپنے لکھے پر ایسی تنقیدی نظر ڈالنا بھی ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں....میر نے تو اپنے سارے دیوان محفوظ رکھے جبکہ غالب نے اپنے اردو کلام کا کڑا انتخاب کیا۔حیدر قریشی صاحب نے تخلیقی کام کے ساتھ تنقیدی کام یہ کئے کہ ساختیات اور ماہیا پر مباحث آغاز کرنے کے ساتھ چھ کتابوں پر تبصرے لکھے۔اور دو کام جو خاصے مشکل تھے وہ بھی کر ڈالے....یعنی اپنی عادت میں تبدیلی۔مثلاً کتاب یا رسالہ پڑھتے وقت اگلے صفحہ کو انگلیوں سے پکڑے رہنا کہ فوراً ہی ورق پلٹ سکیں،یہ ان کی پڑھ لینے کے علاوہ کسی کام کو التوا میں نہ ڈالنے کی عادت بھی کہی جا سکتی ہے،میرے نزدیک یہ ایک خوبی ہے جو ادب سے تعلق رکھنے والے حضرات میں کم ہی پائی جاتی ہے،اور دوسری عادت جو شرمیلے پن سے متعلق ہے،جس پر ایک دوست نے ٹوکا بھی۔۔یعنی یہ آنکھ

ملا کے بات نہیں کرتے تھے۔ اِس عادت سے مجھے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی آنکھ میں لحاظ اور مروت بہت ہے، اب اگر اس عادت کو اہل مغرب پسند نہیں کرتے، تو یہ اُن کے مزاج کی بات ہے۔ مغرب کی بے حجابانہ تہذیب کی بہت سی باتیں تو مشرقی ماحول سے لگّا ہی نہیں کھاتی ہیں۔ البتہ عادتوں کے بارے میں یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ حیدرقریشی نے اُن عادتوں کو چھوڑ دیا۔ یا۔ وہ اب تک ساتھ لگی ہوئی ہیں اندازہ یہی ہے کہ جدید ادب کے مدیر ہونے کے باوجود اپنی تہذیبی روایات سے وابستگی اور مشرقی تمدن تو گھٹی میں پڑا ہے۔ اس لئے وہ عادتیں اب تک ساتھ ہونگی۔

اُس ایک سال کے عرصے میں جو سب سے بڑا کام انجام دیا وہ یہ ہے کہ باونویں سال سے چھلانگ لگا کر ترپین (۵۳) برس کی عمر میں پہنچ گئے۔ (اور اب جنوری ۲۰۰۵ کی تیرہویں کو چوّن سال کے ہوگئے۔) عمر کی بات نکلی ہے تو یہ عرض کردوں حیدرقریشی مجھ سے سولہ سال عمر میں چھوٹے لیکن لکھنے پڑھنے، لوگوں سے مراسم قائم رکھنے اور صاحبِ تصانیف ہونے کے معاملے میں مجھ سے سولہ برس نہیں بلکہ ایک سو سولہ سال بڑے ہیں۔

کھٹی میٹھی یادیں۔ کے بارے میں یہ بھی عرض کرنا ہے کہ ان سوانحی یادوں میں اپنے بزرگوں کے لئے احترام، ہم عمروں کے محبت اور چھوٹوں کے لئے شفقت و پیار کا اظہار نہایت خلوص کے ساتھ ملتا ہے۔ اور یہ بھی پتا چلتا ہے کہ قریشی صاحب کو روحانیت سے بھی لگاؤ ہے۔ اپنی اس بات کے ثبوت میں ''کھٹی میٹھی یادیں'' میں سے وہ پہلا جام اٹھالیں جس پر ''بزمِ جاں'' کا لیبل لگا ہوا ہے۔

آخری بات کے طور پر یہی کہوں گا کہ رواں دواں اندازِ تحریر نے بھی ان یادوں کو پڑھنے کے قابل ایسا بنادیا ہے کہ بقول حضرتِ صبا اکبرآبادی ؎ سارے میخانے کو اک سانس میں کیسے پی لوں

اب حیدرقریشی صاحب کے تعلق سے مجھے دو باتیں اور کہنی ہیں۔ ایک اُس دھندلے سے نقش کو اجاگر کرتے ہوئے، جب اِن سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ اب سنہ تو یاد نہیں ہے لیکن اندازہ یہ ہے کہ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب وہ کراچی آئے اور اپنے ماموں کوثر کے ساتھ افسانہ نگار فردوس حیدر سے ملنے گئے تھے۔ حیدرقریشی کی یاد اللہ ریڈیو پاکستان والے جمیل زبیری سے تھی۔ کب سے اور کہاں سے؟ یہ حیدرقریشی کو معلوم ہوگا۔ کراچی میں جمیل زبیری صاحب عالمی سروس میں ڈپٹی کنٹرولر تھے اور انھوں نے مختلف پروگراموں کے تعلق سے بہت سارے ادیبوں کو جمع کر رکھا تھا، جن میں انجم اعظمی، امراؤ طارق، زاہدہ حنا، عائشہ خان، محمد فائق کے ساتھ راقم بھی شامل تھا۔ ایک روز زبیری صاحب نے فون کیا، دن اور وقت بتانے کے ساتھ یہ اطلاع بھی دی کہ رحیم یار خاں سے حیدرقریشی آئے ہوئے ہیں، یہ نشست اُن کے اعزاز میں منعقد ہورہی ہے۔

جمیل زبیری نے ایک انجمن ''ہمعصر'' کے نام سے قائم کی تھی جس کی ماہانہ محفلیں اُن کے گھر باقاعدگی سے منعقد ہوتی تھیں، ان محفلوں کی خصوصیت یہ تھی کی ابتدا میں دوتین افسانے پڑھے جاتے اور پھر موجود شاعروں سے اُن کا کلام سنا جاتا تھا۔ تنقید کا تکلف بالکل نہیں تھا۔ اب اگر کراچی سے باہر کا کوئی شاعر یا ادیب کراچی آیا ہوتا تو اُس کے لئے ایک خاص محفل ترتیب دے لی جاتی....ایسی ہی تقریب حیدرقریشی صاحب کے لئے بھی منعقد ہونا طے ہوئی۔ اب خاص بات یہ ہوئی کہ مقررہ دن پر جمیل زبیری صاحب کو کہیں اور جانے کی مجبوری لاحق ہوگئی، انھوں نے مجھے فون کیا اور کہا کہ اس نشست کو وہ میرے گھر منتقل کر رہے ہیں اور تمام مدعوئین کو بھی اس تبدیلی کی اطلاع دیدیں گے۔ جہاں تک مجھے یاد آتا ہے۔ صبح یہ فیصلہ ہوا اور شام کو نشست تھی۔ بہرحال سب سے پہلے میرے غریب خانے پر پہنچنے والوں میں حیدرقریشی صاحب تھے۔۔۔۔ ابھی میں نے ان کی اور اپنی عمروں کا تفاوت بیان کیا ہے۔ میں ایک نوجوان کا استقبال کر کے دروازے سے نشست گاہ تک لایا....دوسرے لوگوں کی آمد سے پہلے حیدرقریشی سے کچھ باتیں ہوئیں....اُس کے بعد....پل کے نیچے سے بہت پانی بہہ گیا....

سنہ ۲۰۰۰ کا اختتام تھا یا سنہ ۲۰۰۱ کی ابتدا، مجھے دلی سے بھیجا ہوا حیدرقریشی کے افسانوں کا مجموعہ موصول ہوا۔ معلوم ہوا کہ حیدرقریشی ٹوٹے دھاگے جوڑنا جانتا ہے ۲۰۰۱ء کے اکتوبر میں تقدیر مجھے کناڈا لے آئی۔ سال بھر کے بعد کراچی سے میرے افسانوں کا مجموعہ ''میں آئینہ ہوں'' شائع ہوا، جب وہ مجھے کناڈا میں موصول ہوا تو یہاں سے میں نے اپنے جن دو چار احباب کی خدمت میں ارسال کیا اُن میں حیدر قریشی بھی شامل تھے....وصولیابی کا ٹیلیفون آیا....رابطہ بحال ہوگیا۔ صرف رابطہ بحال نہیں ہوا بلکہ حیدر قریشی نے میرا تعارف ''ان پیج'' سے کرایا۔۔ جو بات بھی سمجھ میں نہیں آئی وہ ای میل سے پوچھ لی۔ یوں حیدرقریشی نے میرے لئے ایک ''استاذ'' کا مرتبہ حاصل کرلیا۔

وقت کے دریا کے ساتھ بھاگتے بھاگتے اور کچھ ہو یا نہ ہو تھکان بہت ہوجاتی ہے۔ بہت سے لوگ اس تھکان کو بیماری کہتے اور جانتے ہیں اور اس کا علاج کرتے ہیں، اتفاق یہ ہے کہ ایسے لوگوں کی اکثریت ہے، اقلیت جو سوچنے سمجھنے والوں کی ہے وہ کہتے ہیں ''آگے چلیں گے دم لے کر'' اور اِس وقفہ میں وہ اپنے سفر کی روداد لکھتے ہیں۔ اِس روداد کے مختلف نام ہیں، ہمارے حیدرقریشی نے اپنے ادبی سفر کی روداد کا نام ''کھٹی میٹھی یادیں'' رکھا ہے۔ یہ ''کھٹی میٹھی یادیں'' جن میں دوسروں کو سمجھنے کی کوشش کے ساتھ خود کو بھی پہچاننے کا جذبہ موجود ہے۔۔ کہیں دعاؤں کی قبولیت کی صورت میں کہیں ''بے اثری'' کے انداز میں لیکن تحریر کی روانی سُرور کی ہلکی ہلکی لہروں کی طرح ایک ایک سطر میں موجود ہے۔ ثبوت کے طور پر بغیر کسی حاشیہ آرائی کے یہ چند اقتباسات دیکھئے:

میں ''کثرتِ نظّارہ'' سے ایسے رُک رُک جاتا تھا جیسے شہر کے چوراہے پر ''گواچی گاں'' کھڑی ہوتی ہے۔پہلی بار ایک مارکیٹ میں داخل ہونا تھا۔میں دروازے کے قریب پہنچا تو آٹو میٹک دروازہ اپنے آپ کھل گیا اور میرا منہ حیرت سے کھل گیا۔امی جی سے سنی ہوئی ''علی بابا اور چالیس چور'' والی کہانی یاد آ گئی۔اُس کہانی میں ''کھل جا سم سم'' کہنے سے دروازہ کھلتا تھا۔یہاں تو مجھے ''کھل جا سم سم'' کہنے کی ضرورت ہی نہیں پیش آئی۔دروازہ اپنے آپ کھل گیا۔(**بزمِ جاں**)

اپنے ہاں تو غالبؔ اُس چار گرہ کپڑے کا افسوس کرتے رہے جس کی قسمت میں عاشق کا گریباں ہونا لکھا ہوتا ہے۔اِدھر مغرب میں اُس تین گرہ کپڑے کی قسمت پر رشک آتا ہے جو گرمیوں میں حسینانِ مغرب نے زیب تن کر رکھا ہوتا ہے۔(**بزمِ جاں**)

بُوا لال خاتوں پہلی بار لاہور گئیں۔ایک تو لاہور ریلوے اسٹیشن کی پُر شکوہ عمارت' پھر ہجومِ خلق۔ اور اس ہجوم میں سُرخ وردی میں ملبوس قلیوں کی فوج ظفر موج۔اوپر سے قلیوں کا 'فرطِ محبت' سے سامان اُٹھانے میں سبقت لے جانے کی کوشش' اور اس کوشش میں سامان کی کھینچا تانی۔۔۔بُوا لال خاتوں نے سمجھا ڈاکوؤں نے ہلّہ بول دیا ہے۔چنانچہ انہوں نے بچاؤ۔۔۔بچاؤ۔۔۔کا شور مچا دیا۔

(ددھیال کے رشتہ دار)

یہ وہ زمانہ تھا جب ہم لوگ بے حد بھیانک غربت کی زد میں آئے ہوئے تھے۔سردیوں کے دن آ رہے تھے اور میرے پَیروں میں ہوائی چپّل تھی۔تب خالہ حبیبہ نے اپنے پرانے ''کوٹ شوز'' مجھے دے دیئے۔خالہ حبیبہ کے پاؤں ہمیشہ سے چھوٹے رہے ہیں۔اسی لئے مجھے وہ ''کوٹ شوز'' پورے آ گئے اور میری سردیاں آرام سے گزر گئیں۔اسکول کے بعض لڑکوں نے میرا مذاق بھی اڑایا لیکن اس مذاق کی تکلیف سردیوں میں ہوائی چپل پہننے کی تکلیف سے کم تھی۔اس لئے اسے برداشت کرلیا۔برداشت نہ بھی کرتا تو کیا کرلیتا۔(**پڑھنے سے پڑھانے تک**)

دسویں کا رزلٹ آنے سے پہلے میں من ہی من میں ارادہ بنایا کرتا تھا کہ نوکری کے ساتھ پڑھائی کروں گا۔یا تو گریجوایشن کے بعد مقابلے کے امتحان میں بیٹھوں گا اور ایک دن ڈپٹی کمشنر بنوں گا' یا پھر وٹرنری ڈاکٹر بن جاؤں گا۔ڈپٹی کمشنر بننے کی آرزو تو پھر بھی ممکنات میں سے تھی لیکن وٹرنری ڈاکٹر بننا تو ممکن ہی نہیں تھا۔دسویں میں میرے مضامین آرٹس گروپ کے تھے۔اس میں جنرل سائنس کا مضمون بھی میں نے مر مر کر پاس کیا تھا۔وٹرنری ڈاکٹر بننے کے لئے تو ایف ایس سی کرنا پہلی سیڑھی تھی جو میرے لئے بذریعہ تانگہ جرمنی جانے سے زیادہ مشکل تھی۔بہر حال شوگر مل کی نوکری کے پہلے دن جب مجھے لیبارٹری کی کھڑکیوں کے شیشوں اور فرش کی صفائی کرنا پڑی تو میرے اندر کے ڈپٹی کمشنر اور وٹرنری ڈاکٹر دونوں کی

موت واقع ہوگئی۔صفائی کرتے ہوئے' اپنے دوسرے ساتھیوں سے منہ چھُپا کر میں ان دونوں کی موت پر با قاعدہ آنسوؤں سے روتا رہا۔ (**بندۂ مزدور کی اوقات**)

جب ہمارے حالات قدرے بہتر ہونے لگے تو باباجی ایک سیکنڈ ہینڈ بلکہ تھرڈ یا فورتھ ہینڈ ریڈیو ٹرانزسٹر لے آئے۔ہر سیٹ کی طرح اس سیٹ پر بھی دائیں بائیں KC--MC-MW-SW کے حروف لکھے ہوئے تھے۔میڈیم ویو یا شارٹ ویو پروگراموں کی فریکوئنسی تلاش کرنے کے لئے ان سے راہنمائی ملتی ہے۔اکبر تب چھٹی جماعت میں تھا۔نئی نئی اے بی سی سیکھی تھی۔چنانچہ وہ انہیں بڑی روانی سے ساتھ مئو، سئو، کک، مک پڑھتا تھا۔ریڈیو کے پیچھے کا کور جب چاہتے کھول لیتے بلکہ اکثر کھلا ہی رکھتے۔پرزوں کے اصل نام تو خدا جانے کیا ہوں گے۔دیسی حساب سے بیشتر پرزوں کے نام ہمیں یاد ہو گئے تھے۔کسی تار کا ٹانکا ٹوٹ جاتا تو باباجی خود ہی ٹانکا لگا لیتے تھے،ایک بار ریڈیو کے سپیکر سے منسلک تار کا ٹانکا ٹوٹ گیا۔باباجی گھر پر نہیں تھے۔مجھے پریشانی یہ تھی کہ میں نے آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس سے پروگرام ''یک رنگ'' سننا تھا۔یہ پروگرام مجھے ویسے بھی اچھا لگتا تھا لیکن اس دن یک رنگ کا الوداعی پروگرام تھا۔یک رنگ۔۔۔یک رنگ کے نام تھا۔تب میں نے تار کا ننگا حصہ اسپیکر کی متعلقہ جگہ پر انگلی کے ساتھ مسلسل چپکائے رکھا اور یوں وہ سارا پروگرام سنا۔(**گراموفون سے سی ڈی تک**)

ڈاکٹر وزیر آغا ایک بار اپنے صاحبزادے سلیم آغا کے ساتھ لندن کی سیاحت کیلئے گئے تھے۔ان کی واپسی پر میں اور ڈاکٹر پرویز پروازی ان سے ملنے کے لئے ان کے گاؤں وزیر کوٹ گئے۔وزیر آغا اور سلیم لندن کے احوال بتا رہے تھے پرویز پروازی،ڈاکٹر وزیر آغا کے ایج گروپ کے ہیں، ان کے دوست بھی ہیں،سو سلیم آغا ان کا بزرگوں کی طرح احترام کرتے ہیں یکا یک پرویز پروازی نے سلیم آغا سے ایک شریر سا سوال پوچھ لیا۔۔سنا ہے کہ اصل انگلش نسل خواتین کا Bottom بندر کے Bottom جیسا ہوتا ہے۔آپ کا تجربہ کیا کہتا ہے؟ سلیم آغا کا مزاج بھی اس انداز کی باتوں والا نہیں ہے، چنانچہ اس اچانک اور بے باک سوال پر وہ شرما کر رہ گئے۔لیکن ڈاکٹر وزیر آغا نے بڑی ہی برجستہ معصومیت کے ساتھ کہا: جس نے بندر کا Bottom ہی کبھی نہیں دیکھا، وہ اس بارے میں کیا بتا سکتا ہے۔

(اخلاقی قدریں اور ویاگرا)

اپنے ذاتی تجربہ نہیں' پیہم تجربات کی بنیاد پر میں دعا کا ایک مسنون نسخہ سارے دوستوں کے لئے یہاں بیان کئے دیتا ہوں۔جمعہ کے دن فجر کی نماز کے بعد سورۃ یاسین اور سورۃ صافات پڑھ کر دعا کے لئے ہاتھ اُٹھا لیں اور خدا سے کوئی ایک (صرف ایک) دلی مُراد مانگیں۔جائز مُراد ہونے کی صورت میں ایک دو جمعوں میں ہی مُراد پوری ہو جاتی ہے۔کوئی بہت ہی مشکل قسم کا کام ہو تو اس کی مشکل کے

مطابق وقت زیادہ بھی لگ سکتا ہے۔لیکن ثابت قدمی سے اور باقاعدگی سے یہ وظیفہ جاری رکھنا ضروری ہے۔(**دعائیں اور قسمت**)

بچپن اور لڑکپن میں میرا سب سے پسندیدہ کھیل ''گُلّی ڈنڈا'' تھا۔گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ میں بھی یہ کھیل کھیلنے کا اپنا ہی مزہ تھا۔تھوڑی سی کرکٹ بھی کھیلے تھے لیکن ہماری کرکٹ کے قواعد ہمارے اپنے تھے۔کپڑے کی کترنوں کو مِلا جُلا کر گیند تیار کی جاتی۔اسے پنجابی میں ''کھِدّو'' کہتے ہیں۔تختی سے بیٹ کا کام لیتے۔وکٹوں کی جگہ اینٹیں سجائی جاتیں تا کہ وکٹ گرنے کی نوبت ہی نہ آئے۔بیٹس مین شاٹ کھیلنے کے بعد جتنی چاہے رنز بنا سکتا تھا۔''کھِدّو'' کبھی قریبی جھاڑیوں میں گُم ہو جاتا تو بیٹس مین کے وارے نیارے ہو جاتے۔ایسے ہی ایک موقعہ پر میں نے مسلسل پندرہ رنز بنائے تھے۔پھر تھک گیا تھا اس لئے مزید رنز نہیں بنائے۔وگرنہ ایک شاٹ پر سنچری ہوسکتی تھی کیونکہ گیند جھاڑیوں سے ملی ہی نہیں تھی۔

(**شوخیاں،بچپنا**)

اندھیرا ہو یا اجالا۔۔۔۔میں تنہائی سے ڈرتا اور گھبراتا تھا۔ایک عمر کے بعد معلوم ہوا کہ گیان کی روشنی اسی تنہائی سے نصیب ہوتی ہے۔پُر خوف اور گناہ کے مرحلوں سے گزرنے کے بعد یہ منزل نصیب ہوتی ہے۔میں بھی گیان کی منزل کا راہی ہوں لیکن ابھی رستے میں ہوں اور شاید جان بُوجھ کر رستے میں ہوں کہ رستوں کا'سفر کا اور سفر کی چھوٹی چھوٹی منزلوں کا اپنا مزہ ہوتا ہے۔(**علتیں،علالتیں**)

مجھے تو بالکل ہی بھول گیا تھا لیکن اب نذر خلیق صاحب نے یاد دلایا ہے کہ میں نے ایک بار ایک فلمی رسالہ''سنگیت'' خانپور سے شروع کیا تھا۔یہ ۱۹۷۷ء کی بات ہے۔تب میں نے جن دوستوں کی ٹیم بنا کر یہ فلمی رسالہ شروع کیا ان میں نذر خلیق بھی شامل تھے۔اس کا صرف ایک ہی شمارہ نکل سکا۔۱۹۷۸ء میں پھر میں نے خانپور سے ''جدید ادب'' جاری کیا۔اس کی ٹیم میں صفدر صدیق رضی اور فرحت نواز (اب رحیم یار خان میں انگلش کی پروفیسر ہیں) موثر پارٹنر تھے۔رضی صرف دو،ڈھائی سال تک دوستی نبھا سکے۔اور پھر وہ ''جدید ادب'' کی ادارت میں شامل نہ رہے۔البتہ فرحت نواز رسالہ کی ادارت میں آخر دَم تک شامل رہیں۔(**ابتدائی ادبی زمانہ**)

مجھے تو چھوٹے بڑے لگے ہوئے ہر لیبل کی شراب میں نشہ اپنی مختلف کیفیات کے ساتھ محسوس ہوا ہے۔اپنی اس تحریر کی تفسیر،اختصار کے ساتھ بیان کرنے کے لئے حضرت صبا کی دوابیات کا سہارا لے رہا ہوں کہ جہاں نثر کے طویل جملے درکار ہوں وہاں شاعری کا ایجاز و اختصار ہی کام آتا ہے۔۔پھر یہ بھی ہے کہ حیدر قریشی نثر نگار ہونے کے ساتھ ایک کامیاب شاعر بھی ہیں،سو اِن ابیات کے ذریعہ اُن کی شاعری میں چھپی ہوئی کھٹی میٹھی یادیں بھی نمایاں ہو جائیں گی۔

لفظ مے بھی ہے،سبو بھی،جام بھی،مینا بھی ہے   لفظ ہی روحِ عنب ہے، ساغرِ صہبا بھی ہے
لفظ کی عینک لگا کر ایک دنیا دیکھ لی   لفظ کے ذرّے میں ہم نے روحِ صحرا دیکھ لی

حیدر قریشی نے بھی اپنی یادوں کو کھٹا اور میٹھا کرنے کے لئے الفاظ کی مٹھاس اور کھٹاس استعمال کی ہے لیکن مجھے اِن کے الفاظ میں غیروں کے لئے اور اُن لوگوں کے لئے بھی خاص طور سے جنھوں اِن کے ساتھ مناسب اور اچھا سلوک نہیں کیا تلخی اور ترشی کم ہی محسوس ہوئی ہے۔۔۔۔شاید لفظوں کا احترام کرنے والوں کا یہی شیوہ ہے۔

☆☆

(**نوٹ از ادارہ**: سلطان جمیل نسیم صاحب کی طرف سے یہ مضمون تیرہ اگست ۲۰۰۵ء کو موصول ہوا تھا)

ریفرنڈم سے کچھ روز پہلے میرے پاس حیدر قریشی کا خط آیا تھا جس میں لکھا تھا کہ میں سولہ دسمبر کو کراچی آ رہا ہوں۔حیدر قریشی ملک کے جانے پہچانے ادیب ہیں اور اُس زمانے میں رحیم یار خان میں سکونت پذیر تھے وہ جدید ادب کے نام سے ایک سہ ماہی رسالہ نکالا کرتے تھے۔اتنے چھوٹے اور عام دھارے سے الگ شہر میں بیٹھ کر ادب کی آبیاری کرنا اور نہایت معیاری رسالہ نکالنا انہی کا کام تھا۔ان سے کچھ عرصہ سے میری خط و کتابت تھی۔ان کے خطوط سے ہی میں نے ان کے خلوص کا اندازہ لگا لیا تھا انہیں لکھا بھی تھا کہ وہ کراچی آئیں اور مجھے اپنی میزبانی کا شرف بخشیں مگر انہوں نے اپنے آنے کی ایک ایسی تاریخ لکھی جو شاید میری زندگی کے سب سے مصروف دن تھے۔میں نے انہیں خط لکھ دیا تھا اور ان سے درخواست کی تھی کہ وہ اپنی آمد کی تاریخ بدل لیں۔مگر شاید انہیں کراچی میں انہی تاریخوں میں کچھ اور کام بھی تھا اور وہ تاریخ نہیں بدل سکے۔

میں اپنے کام میں ہمہ تن مشغول تھا ہر منٹ پر ٹیلیفون کی گھنٹی بج رہی تھی۔پروڈیوسر دوڑ رہے تھے اسی دوران میں میری نظر اٹھی تو دیکھا کہ ایک صاحب جنہیں میں نے کبھی پہلے نہیں دیکھا تھا ایک کرسی پر بیٹھے تھے۔فون رکھ کر میں ان کی طرف متوجہ ہوا اور پوچھا''جی فرمایئے''وہ بڑی خوبصورتی سے مسکرائے اور آہستہ سے بولے''حیدر قریشی''میں بالکل سٹ پٹا گیا۔کھڑے ہو کر ان سے گلے ملا۔ان کے لئے چائے منگوائی۔وہ چائے پیتے رہے میں کام میں مشغول رہا۔سلطان جمیل نسیم کو اپنی مصروفیت کا حال بتا کر ان سے درخواست کی کہ وہ اپنے گھر پر حیدر قریشی کے ساتھ ایک ادبی نشست کا بندوبست کر لیں اور ٹیلیفون کر کے کچھ دوستوں کو مدعو کر لیں انہوں نے میری لاج رکھ لی جب مغرب ہوگئی اور کام کا بوجھ کچھ ہلکا ہوا تو میں سلطان جمیل کے گھر کا ٹیلیفون نمبر اپنے پروڈیوسر کو دے کر اور حیدر قریشی کو ساتھ لے کر ان کے گھر چلا گیا۔'' (**یاد خزانہ** تصنیف **جمیل زبیری** ص ۳۴۳۔۳۴۴)

پروفیسر اکبر حمیدی (اسلام آباد)

حیدر قریشی سوئے حجاز

حیدر قریشی میرا اتنا قدیم اور قریبی دوست ہے کہ مَیں اس کے بارے میں ہر بات حتمی طور پر کہہ سکتا ہوں۔مَیں جانتا ہوں کہ وہ جس طرف بھی رُخ کرتا ہے پورے خلوص۔نیک نیتی اور پوری قوت سے کرتا ہے اور اُس رُخ کے تمام رُخ دیکھے بغیر کسی اور طرف رُخ نہیں کرتا۔اس نے تعلیم کی طرف رُخ کیا تو اردو ادبیات میں ماسٹر کیے بغیر نہ چھوڑا۔خانپور سے نکلنے کا ''رُخ'' کیا تو پھر وہاں ٹھہرنے کو کبھی تیار نہ ہوا اور پاکستان کے مختلف شہروں کی طرف رُخ کرتا ہوا اور پھر رُخ بدلتا ہوا......آخر جرمنی کا رُخ کیا اور وہاں پہنچے بغیر رختِ سفر نہ اُتارا۔ادب کی طرف رُخ کیا تو ادب کی متعدد اصناف میں پھول کھلاتا ہوا......ماہیا کی طرف آیا تو تحقیق وتخلیق کے دریا بہادیئے اور ماہیا کی تاریخ میں شاید سب سے نمایاں کام کر کے دکھایا۔رسالہ ''جدید ادب'' کا آغاز کیا تو اپنے محدود وسائل کے باوجود نہ صرف ''جدید ادب'' کو عالمی سطح پر شائع کیا بلکہ بلا قیمت اہلِ قلم کو اور قارئینِ ادب کو پیش کیا۔یہ ایک غیر معمولی اور واحد مثال ہے کہ اتنا اعلیٰ درجے کا ادبی رسالہ بلا قیمت دستیاب ہے۔

جرمنی جا کر اس کے مزاج کے کئی اور رُخ بھی سامنے آئے۔مَیں جانتا ہوں مذہب سے اُسے شروع سے ہی مخلصانہ وابستگی رہی ہے اور جرمنی جا کر تو یہ وابستگی اور بھی کُھل کر سامنے آئی۔انہی دنوں اس کی طبیعت کا ایک نیا رنگ تو نہیں......مگر ایک قدیمی اور بنیادی رنگ نئے رُخ سے سفر نامۂ حجاز کی شکل میں ''سوئے حجاز'' کے نام سے سامنے آیا۔یہ سفر نامہ سات عمروں اور ایک حجِ بیت اللہ کے مبارک سفروں کی داستان ہے۔جسے نہایت عقیدت اور والہانہ انداز میں دل کی ہی نہیں......روح کی گہرائیوں سے لکھا گیا ہے۔یہ سفر نامہ پڑھ کر مجھے مولانا حالی کا یہ شعر یاد آ گیا۔

حاجیو ہم کو ہے گھر والے سے کام
گھر کے محراب و ستوں سے کیا غرض

''سوئے حجاز'' کے سفر نامے پڑھ کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے گھر والا اپنے محراب وستوں سمیت حیدر قریشی کے دل ودماغ کی گہرائیوں میں اُتر گیا ہے۔یہ ایک سفر نامہ سات عمروں اور ایک حج

کی رُوداد پر مشتمل ہے۔ہر سفر جہاں مصنف کی دلی کیفیتوں کی آئینہ داری کرتا ہے وہاں حجاز کے مقاماتِ مقدسہ کی تاریخ بھی بیان کرتا چلا جاتا ہے۔کتاب مکمل کرنے کے بعد مَیں نے محسوس کیا جیسے مَیں نے بھی حیدر قریشی کے ہمراہ ان مقدماتِ مقدسہ کی زیارت کر لی ہے اور ان مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کی برکات سے اسی طرح فیض یاب ہوا ہوں جیسے حیدر قریشی۔ظاہر ہے یہ تمام تاثر حیدر قریشی کی دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی اس تحریر کا نتیجہ ہے جو اس کتاب کے ہر صفحے پر قیمتی موتیوں کی طرح پروئی گئی ہے۔مجھے حیدر قریشی کے طبعی اخلاص سے ایسی ہی تحریر کی توقع تھی۔میری ان معروضات کی تائید حیدر قریشی کے لکھے ہوئے ابتدائیے سے ہی ہو جاتی ہے۔ملاحظہ ہو:

''میرا قطعاً کوئی ارادہ نہ تھا کہ مَیں کوئی سفر نامہ لکھوں گا۔مَیں اس سفر کو اپنی ذات اور اپنے احباب تک ہی محدود رکھنا چاہتا تھا لیکن یہ سفر میرے لیے صرف ایک سفر اور مذہبی فریضے کی ادائیگی نہ رہا۔مَیں نے اپنے جسم کے ساتھ اپنے دل، اپنے ذہن اور اپنی روح کو پے در پے انوکھے تجربوں سے گزرتے دیکھا۔مَیں نے جسمانی طور پر سفر کرنے کے ساتھ فکری اور روحانی طور پر بھی سفر کیا......پھر اس مختلف الجہات سفر کو کسی ایک نقطے پر یک جا ہوتے بھی محسوس کیا۔سو یہ اس روحانی تجربے کی شدت تھی جس نے مجھے یہ سفر نامہ لکھنے پر مجبور کیا۔''(صفحہ ۷)

''روحانی تجربے کی شدت'' کی جھلکیاں پوری کتاب میں بار بار اپنی چھب دکھاتی ہیں۔ایک جھلک آغاز میں ہی دکھائی دیتی ہے جس سے حیدر قریشی کی والہانہ عقیدت کا اندازہ ہوتا ہے۔دیکھیے:

''روانگی سے پہلے میرے ذہن میں یہ تاثر تھا کہ مکہ میں جلالی شان کا سامنا ہوگا۔وہاں شاید مَیں زیادہ دیر تک ٹِک نہیں پاؤں گا اور مدینہ کی جمالی شان میں زیادہ مزہ آئے گا۔اس میں کوئی شک نہیں کہ مدینہ کی جمالی شان میں بھی بہت مزہ آیا لیکن کعبہ شریف نے تو جیسے مجھے باندھ لیا تھا محبت کی،عقیدت کی عجیب سی ڈور تھی۔''(ص۱۰)

حیدر قریشی کے اس تجربے کا ذکر مختلف الفاظ میں اور مختلف رنگوں میں مَیں نے اور حجاج کرام سے بھی سنا ہے۔جس میں یہ کہا گیا کہ کعبۃ اللہ کی پہلی جھلک انسان کو مبہوت کر دیتی ہے۔میرے خیال میں یہ جلالِ خداوندی کی ایک جھلک ہے جسے سنبھالنا انسانی حواس کے بس میں نہیں۔

حیدر قریشی کی دلی کیفیت کا ایک اور منظر دیکھیے:

''مجھے درِ کعبہ کے وا ہونے کا ظاہری طور پر کوئی انتظار نہیں تھا کہ میرے باطن میں کعبہ کا دروازہ آہستہ آہستہ وا ہونے لگا تھا۔(ص۳۱)

ایک اور روحانی تجربہ دیکھیے:

''یکا یک مجھ پر منکشف ہوا کہ...... یہ سامنے والی دیوار تو صرف ظاہری پردہ ہے۔ وگرنہ مَیں جو حطیم میں بیٹھا ہوا ہوں۔ درحقیقت خانۂ کعبہ کے اندر ہی بیٹھا ہوا ہوں۔ عجیب لذت آفریں اسرار تھا کہ مَیں بیک وقت کعبہ کے اندر بھی تھا اور باہر بھی......اس انوکھے تجربے نے مجھے احساس دلایا کہ ہمارا باہر بھی ہمارے اندر کا حصہ ہے۔لیکن پھر اس بھید کا ایک اور مرحلہ بھی مجھ پر منکشف ہوا۔''

کچھ مزید کیفیات:

''گویا تھوڑے فاصلے سے کعبہ کے گرد چکر لگا کر دیکھیں تو جلووں کی کثرت ہی کثرت ہے لیکن یہ کثرت وحدت کی علمبردار ہے۔''(ص۵۵)

''ویسے سچی بات یہ ہے کہ کل کے تجربے کے باعث مجھ پر خوف سا طاری ہو گیا تھا۔آج تینوں شیطانوں کو پتھر مارنے ہیں۔ پتہ نہیں وہاں سے زندہ واپسی ہوتی ہے یا نہیں۔''(ص۱۲۲)

ان تمام عمروں اور حج کے سفروں میں حیدر قریشی اکیلے نہیں تھے بلکہ ان کی بیگم بھی شریک سفر تھیں اور قدرتی بات ہے اتنے پُر ہجوم سفر میں ایسے حالات میں کچھ مسائل بھی پیش آتے ہیں جن میں سے کچھ اپنی فروگذاشتوں کے باعث ہوتے ہیں۔ کچھ ایسے بڑے اجتماع کے باعث اور کچھ وہاں کی انتظامی خرابیوں کے باعث۔ کچھ باتیں اس سفر نامے میں مجھے بہت نمایاں دکھائی دیں جن کا مختصر اظہار درج ذیل ہے:

1۔ یہ سفر نامے حیدر قریشی کے ظاہری ہی نہیں باطنی اور روحانی سفر نامے بھی ہیں۔

2۔ ان سفر ناموں میں ان کیفیات کا والہانہ اظہار ہے جو اس دوران حیدر قریشی صاحب کو محسوس ہوتی رہیں۔

3۔ ان سفر ناموں میں ان مقامات کے تاریخی پس منظر بھی بیان کیے گئے ہیں جو مصنف کے مشاہدے میں آئے یا جہاں جہاں سے وہ عمرہ اور حج کی ادائیگی کے دوران گزرتے رہے۔ یہ تاریخی پس منظر محض مذہبی نقطۂ نظر ہی نہیں رکھتے بلکہ تاریخی اور جغرافیائی حوالے بھی بنتے دکھائی دیتے ہیں جن کی اس لیے بھی خاص اہمیت ہے کہ جو لوگ مسلمان نہیں ہیں وہ بھی علمی سطح پر ان معلومات سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ یوں یہ

سفر نامہ محض مذہبی حیثیت ہی نہیں رکھتا جو ہمارے نزدیک نہایت قابلِ قدر ہے بلکہ ایک تاریخی اور علمی حیثیت بھی رکھتا ہے جو ان لوگوں کے لیے بھی ہے جو مذہبِ اسلام سے تعلق نہیں رکھتے جنہیں مذہب سے زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔

4۔ اس سفر نامے میں ان مشکلات کا بھی ذکر ہے جو دورانِ حج یا عمرہ کے دوران حجاج کرام کو یا زائرین کو پیش آتی ہیں یا پیش آ سکتی ہیں۔اس سفر نامے کے ذریعے وہ ان متوقع مشکلات کی پیش بندی کا اہتمام بھی کر سکتے ہیں۔

5۔اس سفر نامے میں مقامی انتظامیہ کی ان غفلتوں کا بھی ذکر ہے جن کے باعث زائرین کو مسائل کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔اس ضمن میں ان کمپنیوں کے رویّوں کا بھی ذکر ملتا ہے جنہیں دورانِ حج مختلف طرح کے کام تفویض کیے جاتے ہیں اس سفر نامے سے اندازہ ہوتا ہے کہ بعض کام خوش اسلوبی سے بھی سرانجام دیئے جاتے ہیں اور بعض غفلت کے باعث حجاج کرام کی مشکلات میں اضافے کا باعث بنتے ہیں۔

6۔ اس سفر نامے سے زائرین کو رہنمائی بھی ملتی ہے کہ ایسا سفر آغاز کرنے سے قبل انہیں کن کن باتوں کو اور کن کن التزامات کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے۔ یوں یہ سفر نامہ ایک مخصوص افادیت کا حامل بن جاتا ہے جس کا مطالعہ زائرین کے لیے بیحد مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

7۔ تاریخی اعتبار سے یہ سفر نامہ معلومات کا خزانہ ہے جس کے گہرے مطالعے سے وہاں کے اہم مقامات کے بارے میں قیمتی تاریخی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

8۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان مقدس مقامات اور ماحول میں کیا کیا تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں ان سے بخوبی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ان میں بعض تبدیلیاں تکلیف دہ بھی ہیں۔

9۔ یہ سفر نامہ ایک روحانی سیر ہے مگر اسلوب اور ناقدانہ نظر ایک باشعور ادیب کے ہیں۔ یہ ادبی زبان میں لکھا ہوا روحانی سفر نامہ ہے جس میں وہاں کی انتظامی خامیوں پر تنقید بھی کی گئی ہے جو حجاج کرام کے لیے پریشانی کا باعث ہے۔

10۔اس سفر نامے میں موضوعات کی رنگارنگی اور اندازِ بیان کا بہت لطف شامل ہیں۔

11۔ یہ سفر نامہ اپنے اندر جہاں تاریخی حقائق رکھتا ہے وہاں جذبوں کے ایسے مناظر بھی ملتے ہیں جو پڑھنے والے کو اپنی رو میں بہالے جاتے ہیں اور پڑھنے والا محسوس کرنے لگتا ہے جیسے وہ خود بھی حیدر قریشی کے ساتھ اس مبارک سفر میں شریک ہے۔

12۔ یہ سفر نامہ اپنے صفحات کے لحاظ سے طویل نہیں مگر معنی، معلومات، کیفیات، تاریخی تعارفات اور پیش آمدہ مسائل و معاملات نیز مشاہدات کے باعث بہت بسیط ہے۔ دیوانِ غالبؔ کی طرح جو حجم میں قلیل

ہے مگر معنی میں طویل۔

13۔میری رائے میں حیدر قریشی کا یہ سفرنامہ اردو میں لکھے ہوئے حج کے سفرناموں میں ایک بہت نمایاں اور ممتاز مقام کا حامل ہے اور سفرناموں کے ضمن میں ایک قیمتی اضافہ جو آئندہ چل کر بہت سے نقطہ ہائے نظر سے تاریخی حوالہ جات کا کام دے گا۔

14۔یہ سفرنامہ بے شک بڑی عقیدت سے لکھا گیا ہے جس میں مصنف کے انتہائی والہانہ عقیدتی جذبات کا اظہار ہوتا ہے......مگر مصنّف بنیادی طور پر ادیب اور شاعر ہے۔اس لیے اس نے یہ سفرنامہ کھلی آنکھوں سے اپنے ماحول کو دیکھ کر ایک ادیب کے ذہن سے سوچ کر ایک شاعر کے قلم سے لکھا ہے۔جسے پڑھ کر بار بار شاعرانہ شعور کا احساس ہوتا ہے۔مصنف نے اپنی عقیدت کو اپنی ذات تک محدود رکھا ہے اور تاریخی واقعات اور مشاہدات کو قطعاً علمی اور فکری تجربات کے ساتھ قلم بند کیا ہے۔یہ گویا قعرِ دریا میں اتر کر دامن خشک رکھنے والی بات ہے جس کا حافظ نے ذکر کیا تھا۔

15۔حیدر قریشی کا سفرنامہ ''سوئے حجاز'' پڑھتے ہوئے اس موضوع کا کوئی بھی سفرنامہ یاد نہیں آتا۔اس کی وجہ حیدر قریشی کا منفرد اندازِ فکر اور منفرد اسلوبِ تحریر ہے۔حیدر قریشی کا یہ امتیاز بہت نمایاں ہے کہ وہ قاری کی تمام تر توجہ اپنی جانب اس طور باندھ رکھتا ہے کہ پڑھنے والے کو کہیں اِدھر اُدھر کی نہ تو فرصت ملتی ہے اور نہ ہی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔وہ حیدر قریشی کے تخلیقی سحر میں سرتاپا شرابور ہوتا چلا جاتا ہے۔

مَیں اپنے عزیز دوست کو اس شاہکار سفرنامے پر مبارکباد دیتا ہوں۔☆☆

☆☆☆''**سوئے حجاز** میرے لئے ایک انمول تحفہ ہے۔یوں لگا گویا میں آپ دونوں کے ساتھ سفر کر رہا ہوں۔مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ کے سارے متبرک مناظر اور شب و روز مجھے یاد آئے۔''

(خط **افتخار امام صدیقی** مدیر ماہنامہ **شاعر** بمبئی، بنام حیدر قریشی ١٣/جولائی ٢٠٠٥ء)

☆☆☆سفرنامہ ''سوئے حجاز'' جہاں حیدر قریشی کے احساسات اور خیالات کی بہترین ترجمانی کرتا ہے، وہاں اپنے قارئین کے لیے نہایت اہم تاریخی اور مذہبی معلومات کا خزینہ بھی ہے------

حیدر قریشی نے اپنے سفرنامہ ''سوئے حجاز'' میں جگہ جگہ مختلف پیغمبروں اور نبیوں کے فرمودات، واقعات اور قرآنی حوالے پیش کیے ہیں، جن سے اُن کے وسیع دینی علم کا پتا چلتا ہے۔

(**منزہ یاسمین** کے مقالہ **حیدر قریشی شخصیت اور فن** سے اقتباسات۔ص١٤٤اور ص١٤٦)

خاور اعجاز (ملتان)

حیدر قریشی کے انشائیے

حیدر قریشی گزشتہ ربع صدی میں ابھرنے والے ایسے قلمکاروں میں سے ہیں جنھوں نے کئی ایک اصنافِ ادب میں اپنے نقوش مرتب کیے ہیں۔غزل ہو یا نظم، ماہیا ہو یا ہائیکو، یادنگاری ہو یا انشائیہ وہ سب میں مٹرگشت کرتے نظر آتے ہیں۔اردو ادب میں انہیں کس حیثیت سے یاد رکھا جائے گا یہ تو وقت ہی بتائے گا لیکن ماہیے کے ضمن میں ان کا کام اتنا قابلِ اعتنا ہے کہ آنے والے کئی سالوں تک حوالہ رہے گا۔

گزشتہ ربع صدی میں ایک نئے عروج سے آشنا ہونے والی صنفِ ادب ''انشائیہ'' میں بھی انہوں نے اپنی تخلیقی اپج کے کچھ نمونے پیش کیے ہیں۔یوں تو یہ بات سبھی اصنافِ ادب پر صادق آتی ہے لیکن انشائیہ جیسی نازک خیالی پر مشتمل صنفِ ادب کے سلسلے میں لکھاری کی چشمِ تصور کا پوری طرح وا ہونا اپنے اندر معانی کی ایک اور ہی پرت رکھتا ہے جس سے ایک اچھا انشائیہ نگار یا انشائیہ کا ایک خوش نظر قاری ہی واقف ہوسکتا ہے۔حیدر قریشی نہ صرف ایک دوربین چشمِ تصور کے مالک انشائیہ نگار ہیں بلکہ ان کے انشائیے ایک اور صفت سے بھی متصف نظر آتے ہیں جسے عرفِ عام میں چیزوں کی دوسری جانب کے مناظر دیکھنے کی صلاحیت پر محمول کیا جاتا ہے۔یہ صلاحیت تخیل کو عمومی زاویوں سے ہٹ کر بروئے کار لانے کے نتیجے میں نمودار ہوتی ہے اور ایک خاص سحر کار فضاء کے جلو میں چلنے سے پھولتی پھلتی ہے اور مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی ہے کہ یہ دونوں خوبیاں حیدر قریشی میں بدرجہء اتم موجود ہیں۔ایک اچھا انشائیہ نگار ایک اچھا شاعر ثابت ہوسکتا ہے یا نہیں لیکن حیدر قریشی کو دیکھتے ہوئے یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ ایک اچھا شاعر اگر انشائیے کی طرف مائل ہوجائے تو نتائج یقیناً حوصلہ افزا نکلتے ہیں۔

حیدر قریشی کا فکری اور فنی سفر تقریباً تین دہائیوں پر محیط ہے۔انہوں نے اس عرصہ میں خود کو انتہائی فعال رکھا ہے۔اردو ادب کی بہت سی لہروں کے ساتھ سفر کیا ہے اور بدلتے ہوئے رویوں اور دھاروں کا ساتھ دیا ہے مگر اپنے تشخص کو مجروح نہیں ہونے دیا۔یہی انداز ان کے انشائیوں میں بھی پایا جاتا ہے۔اپنی ادبی اور عملی زندگی کے لمحوں کو، چاہے وہ کتنے ہی کربناک کیوں نہ رہے ہوں، انہوں نے

ایک خوشگوار اسلوب میں پرو کر پڑھنے والوں کے لیے سامانِ تفریح بھی مہیا کیا ہے اور لمحہء فکریہ بھی۔اپنے لاشعور میں پرورش پاتے ہوئے کبھی مبہم اور کبھی واضح کرداروں سے انہوں نے طرح طرح کے دلچسپ پہلو نکالے ہیں اور سادہ و پرکار جذبات نگاری کے ساتھ ساتھ کردار نگاری کے انشائی پہلوؤں کو بھی خوب خوب اجاگر کیا ہے۔اپنی کیفیات کے ہمراہ قاری کی کیفیات کا بھی لحاظ رکھا ہے۔یہی وجہ ہے کہ پڑھنے والا بھی ان کے تاثرات کو قبول کرتا چلا جاتا ہے اور اسی کشتی میں بہنے لگتا ہے جس میں خود مصنف سوار ہے۔اس طرح ان کے انشائیوں کا مطالعہ ایک رسمی مطالعہ نہیں رہا بلکہ حیدر قریشی کے ذہنی اور ادبی ارتقاء پر اثر انداز ہونے والے عوامل کا مطالعہ بھی بن گیا ہے۔

حیدر قریشی کے انشائیوں میں ان کی ذاتی زندگی کی جھلکیاں ان کی فتوحات اور شکستوں کے ساتھ موجود ہیں جو ان کے انشائیوں میں کہیں خاکہ نگاری کا رنگ بکھیر دیتی ہیں اور کہیں یاد نگاری کا،مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ ان ساری کیفیات کے پردے سے ایک انشائیہ ابھار لینے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ان کے انشائیوں میں انکساری اور عاجزی بھی نظر آتی ہے لیکن ان دوخوردبینوں کے ذریعے انہوں نے اپنے ارد گرد کے چھوٹے چھوٹے اور معمولی واقعات کو Magnify کر کے دکھایا ہے،اس طرح سے کہ ان کے سامنے خود ان کی انکساری اور عاجزی بڑی دکھائی دینے لگتی ہے۔

حیدر قریشی ان لوگوں میں سے ہیں جنہیں اپنی صلاحیتوں کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے اور جو یہ بھی جانتے ہوتے ہیں کہ انہیں کس شعبہء ادب کا انتخاب کرنا ہے اور کب کرنا ہے۔انشائیہ کے حوالے سے انہوں نے جو کام کیا ہے وہ اس صنف میں چند قابلِ قدر انشائیوں کے اضافے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ان کے انشائیوں کا مخصوص اسلوبِ نگارش ان کی وہ بے تکلفی ہے جو عمومی طور پر پنجاب کے دیہاتوں میں ملتی ہے اور زمینی تشبیہات کے جلو میں سفر کرتی ہے۔چند ملی جلی مثالیں ملاحظہ ہوں:

نقاب معلوم کے جہنم اور نامعلوم کی جنت کے درمیان عالمِ برزخ ہے۔(**نقاب**)

وِگ کا سر پر سجانا تھا کہ میکدے سے میری جوانی خود ہی اٹھ کر میرے پاس آ گئی۔(**وِگ**)

قربت آتشِ نمرود یا آتشِ محبت میں بے خطر کود پڑنے کا نام ہے جبکہ فاصلہ ہمیشہ محوِ تماشائے لبِ بام رہتا ہے بلکہ بعض اوقات لبِ بام سے بھی پرے کھڑا ہوتا ہے۔اگر فاصلہ بھی اس آتش میں کود پڑے تو پھر فرقِ من و تو ختم ہو جائے گا۔(**فاصلے ، قربتیں**)

بڑھاپا بارش کے بعد قوس قزح کا منظر پیش کرتا ہے۔زندگی کے تجربوں کی دھوپ سے ہفت رنگ عکس ابھرتا ہے اور ایک حسین منظر بن جاتا ہے۔(**بڑھاپے کی حمایت میں**)

کامل اطاعت کے وصف سے محروم لوگوں کو بھیڑوں، بکریوں کے گلوں سے سبق سیکھنا چاہیے

اور سوچنا چاہیے کہ اشرف المخلوقات کا لقب تو بھیڑ بکریوں کو ملنا چاہیے جن کے ہاں سرِ تسلیم خم کرنے بلکہ قلم کرانے کا وصف پیدائشی ہوتا ہے۔(**اطاعت گزاری**)

گرگٹ بیچارے کو ہر کوئی لعن طعن کرتا ہے جبکہ اس کا گناہ اس سے زیادہ نہیں کہ آئینے اور پانی کی طرح یہ بھی جہاں سے گزرتا ہے اسی رنگ میں رنگین نظر آنے لگتا ہے۔۔آئینہ، پانی اور گرگٹ تینوں اپنی اپنی جگہ سچے ہیں۔(**اپنا اپنا سچ**)

ان جملوں کی ساخت پر حیدر قریشی کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔تکرار و اعادہ سے دامن بچا کر وہ اپنے اسلوب کی شگفتگی کے ہمراہ سفر کرتے ہیں۔انشائیے کے عنوان سے جڑا ہوا شعر نہ صرف عنوان کو نکھار دیتا ہے بلکہ انشائیے کے مندرجات میں قاری کی دلچسپی کو بھی بڑھا دیتا ہے۔کوئی بات کہنے سے پیشتر اکثر مقامات پر ان کی باندھی ہوئی تمہید پڑھنے والے کی انگلی تھام لیتی ہے۔

حیدر قریشی کی انشائیہ نگاری کی صلاحیتوں کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے دوسرے انشائیہ نگاروں سے ہٹ کر موضوعات کا انتخاب کیا ہے اور پھر موضوع کے اعتبار سے ان پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے جو عام قاری کی نظر میں نہیں آ سکتے۔ایک اچھے انشائیہ نگار کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ ان اشیاء، مظاہر اور ان کے چھپے ہوئے گوشوں کو سامنے لائے جو بآسانی دکھائی نہ دے سکتے ہوں۔حیدر قریشی کی انفرادیت کا ثبوت ان کے زاویہء نگاہ میں مضمر ہے جو یہ واضح کرتا ہے کہ بیشتر نظر آنے والی چیزیں ویسی نہیں ہوتیں جیسی دکھائی دیتی ہیں بلکہ بعض اوقات متضاد اور انتہائی مختلف بھی ہو سکتی ہیں۔حیدر قریشی بعض پیچیدگیوں کو اس فنکارانہ مہارت سے پیش کرتے ہیں کہ فلسفہ اور نفسیات کی گتھیاں کھلتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں البتہ کہیں کہیں بات سے بات نکالتے ہوئے درمیانی کڑیاں ان کے ہاتھ سے نکل جاتی ہیں اور ایک خلاء در آنے کے سبب روانی متاثر ہوتی ہے تاہم یہ کوئی خامی یا سقم نہیں بس یہ ہے کہ ایک بات چلتے چلتے نیا رخ اختیار کرنے سے پہلے ہی ختم ہو جاتی ہے اور تسلسل قائم نہیں رہ پاتا۔

حیدر قریشی کے انشائیوں میں حیرت آمیز تجسس کی فضاء ہمیشہ موجود رہتی ہے اور پڑھنے والا ایک چوٹی یا عروج سے گزر کر نئی چوٹی کے نظارے میں گم ہو جاتا ہے۔اگرچہ ایک خاص موڑ پر انشائیہ کا اختتام پذیر ہو جانا کوئی نئی بات نہیں رہی لیکن حیدر قریشی اب بھی اپنے انشائیوں کو ایک خوبصورت موڑ دے کر ختم کرنے میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں جیسے ستارہ ٹوٹتے ہوئے خوب روشنی دیتا ہے۔حیدر قریشی کے بیشتر انشائیوں کے اختتام پر دور تک جاتی ہوئی فکر کی ایک لہر مجھے اسی روشنی کے مترادف دکھائی دیتی ہے جس کے ہمراہ آپ ان سمتوں میں نکل سکتے ہیں جس طرف مصنف کا وجدان آپ کی رہنمائی کرتا ہے۔

☆☆

ناصر نظامی (ہالینڈ)

منظر اور پس منظر

حیدر قریشی کی پہچان اس عہد کے ایک اہم شاعر اور ادیب کی ہے۔وہ کئی اصنافِ ادب میں تخلیق کے گلہائے رنگا رنگ کھلا چکے ہیں۔غزل،آزاد نظم،ماہیا،افسانہ،خاکہ،انشائیہ،سفرنامہ،یادیں،تحقیق، تنقید،غرض ان تمام اصناف میں حیدر قریشی کے معیاری کام کے گہرے نقش ثبت ہیں۔امریکہ میں گیارہ ستمبر کے حادثہ کے بعد دنیا اور خاص طور پر اسلامی دنیا کے حالات میں جو تبدیلیاں آئیں،ان کے نتیجہ میں حیدر قریشی نے ''منظر اور پس منظر'' کے عنوان سے کالم لکھنے شروع کئے۔یہ کالم ایک ویب سائٹ اردوستان ڈاٹ کام پر ۱۵/اپریل ۲۰۰۲ء سے لے کر ۱۸/نومبر ۲۰۰۳ء تک وقتاً فوقتاً چھپتے رہے۔بعد میں حیدر قریشی نے اپنے ۲۵ کالموں کو کتابی صورت میں شائع کر دیا۔یہی کتاب اس وقت میرے پیشِ نظر ہے۔پروفیسر نذر خلیق صاحب کے ساتھ ایک مکالمہ میں ادب سے کالم نگاری کی طرف آنے کی وجہ پوچھنے پر حیدر قریشی نے اپنے موقف کی وضاحت کچھ اس طرح کی ہے۔

''**نذر خلیق:** آپ نے گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ء کے بعد کے حالات کے پیش نظر **منظر اور پس منظر** عنوان کے ساتھ کالم نگاری کا سلسلہ شروع کیا۔کیا ادب سے کالم نگاری کی طرف سفر کرنا ترقیٔ معکوس نہیں لگتا؟

حیدر قریشی: پاکستانیوں کی ایک بڑی تعداد اور تیسری دنیا کے عوام کی اکثریت کی طرح نائن الیون کے بعد امریکی کاروائیوں پر میرے بھی وہی احساسات تھے جو دوسروں کے تھے۔لیکن مجھے یہ سب دیکھ کر چپ رہتے ہوئے شدید گھٹن ہونے لگی تھی۔میں نے بحیثیت شاعر اور ادیب کچھ لکھا لیکن مجھے وہ سب کچھ ادبی سطح پر اچھا نہیں لگا۔دکھ اور غصہ کی شدت ان میں غالب تھی۔چنانچہ میں نے ایسی ساری چیزیں ضائع کر دیں۔پھر اظہار کے نئے رستے سوچتا رہا۔اسی دوران کالم لکھنے کا خیال آیا اور ۲۵ کالم لکھ کر مجھے جیسے سکون آ گیا۔میں اسے ترقیٔ معکوس نہیں سمجھتا۔ترقیٔ معکوس تب ہوتی کہ میں ادب کو صحافت کی جگہ لے آتا۔میں اس سے بچ گیا۔اس کی بجائے میں نے صحافت کے ذریعہ کو اس کے باوقار مقام پر اختیار کیا۔یہی وجہ ہے کہ میں اپنے کالموں کے مجموعہ کی اشاعت سے خوش ہوں۔یہ بنیادی طور پر

میرے صحافتی کالم ہیں لیکن مجھے لگتا ہے کہ ان کی دیرپا حیثیت بنے گی۔آنے والے وقت میں میرے اس لکھے کو شاید زیادہ بہتر طور پر سمجھا جا سکے گا۔اگر میں سنجیدگی سے کالم لکھنے کی بجائے افسانوں اور شاعری میں للکارتا رہتا تو شاید وہ ادبی لحاظ سے ترقیٔ معکوس ہوتی۔''

میں نے **منظر اور پس منظر** کو پڑھتے ہوئے محسوس کیا ہے کہ وہ موجودہ عالمی صورتحال کو کسی مخصوص عینک سے دیکھنے کی بجائے مختلف پہلوؤں اور زاویوں سے دیکھتے ہیں۔تہذیبی حوالوں سے،مذہبی حوالوں سے،جغرافیائی حوالوں سے،تاریخی حوالوں سے،سیاسی حوالوں سے،نفسیاتی حوالوں سے لے کر مذہبی پیشینگوئیوں تک کے حوالوں سے انہوں نے موجودہ صورتحال کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ان کی ہمدردیاں اپنے لوگوں سے بھی ہیں لیکن وہ اپنے لوگوں کے ساتھ پوری انسانیت کی بقا کے خواہشمند ہیں۔

اگر اس کتاب کے خیالات کو نہایت اختصار کے ساتھ پوائنٹس کی صورت میں یہاں بیان کر دوں تو اس سے کتاب کے بارے میں بہتر معلومات مل سکے گی۔

☆ حیدر قریشی نے سب سے پہلے من حیث القوم مسلمانوں اور پاکستانیوں کی غلطیوں کی طرف توجہ دلائی ہے۔اس کے مطابق مسلمان ملکوں کا عالمی سطح پر باہمی انتشار،مسلمان فرقوں کی باہمی نفرتیں اور دوسروں کے عقائد میں عدم برداشت سب سے بڑا گناہ ہے۔

☆ گزشتہ پچاس سالوں میں مسلمانوں کا سوویت یونین کے خلاف غیر ضروری نفرت انگیز رویہ اور امریکہ سے حد سے زیادہ ''لوافیئر'' ایک اور بڑا گناہ ہے اور یہ گناہ اس وقت انتہا کو پہنچ گیا جب پاکستان اور دوسرے مسلمان ملکوں نے افغانستان میں سوویت یونین کی مداخلت پر امریکہ کی جنگ کو جہاد کا نام دے کر لڑنا شروع کر دیا۔یہ قطعاً جہاد نہ تھا بلکہ امریکہ اور سوویت یونین کی محاذ آرائی تھی،اس جنگ میں امریکہ کا ساتھ دینے کی سزا اب سارے مسلمان ملک بھگت رہے ہیں۔

☆ اسلامی جہاد کو جس طرح مغربی میڈیا غلط رنگ دے رہا ہے اس پر حیدر قریشی کا کالم ''جہاد اور بعض اہم مذاہب کی تعلیمات'' علمی لحاظ سے بہت عمدہ جواب ہے۔اس میں عیسائیوں،یہودیوں اور ہندوؤں کے عقائد ان کی اپنی ایمانی کتابوں سے بیان کر کے اسلامی جہاد کے بارے میں پروپیگنڈہ کو زائل کرنے کی کوشش کی ہے۔

☆ ٹریڈ سنٹر کی عمارتوں پر حملہ کرنے والے حقیقتاً کون تھے؟۔۔۔حیدر قریشی عام مغربی پروپیگنڈہ کورد کرتے ہوئے اس کے لئے جو واقعاتی ثبوت پیش کرتے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس سازش کے پیچھے کچھ اور لوگ ہیں۔انہوں نے کافی واضح اشاروں سے ان سازشی عناصر کی نشاندہی کر دی ہے۔انہوں

نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر واقعی کوئی القاعدہ اتنا بڑا اور خطرناک کام کرگئی ہے تو اس کے ایسے ثبوت پیش کئے جائیں جنہیں خود امریکی عدالتیں قبول کرتی ہوں۔

☆ افغانستان اور عراق پر امریکی حملوں کے پس منظر میں حیدر قریشی صرف کوئی ایک مقصد کارفرما نہیں دیکھتے بلکہ ان کے نزدیک امریکہ ایک تیر سے کئی شکار کر کے کئی مقاصد حاصل کر رہا ہے۔اپنے پرانے وفادار جہادیوں اور موجودہ باغیوں کی سرکوبی،تیل کے ذخائر تک رسائی،تہذیبوں کی جنگ،صلیبی جنگ،عربوں پر اسرائیل کی بالا دستی،اور باقی ساری دنیا پر اپنے خوفناک اسلحہ کا رعب جمانا۔یہ سارے مقاصد حاصل کرنا امریکی پالیسی ہے۔

☆ امریکہ اور یورپ میں کس حد تک مفاہمت ہے اور کس حد تک ان میں اختلافات ہیں،اس موضوع کو امریکہ اور یورپ کے درمیان پائے جانے والے ثقافتی اور سیاسی فرق اور ہم آہنگی دونوں حوالوں سے دیکھا گیا ہے۔

☆ پاکستان کی داخلی سیاست کے سلسلے میں وہ جنرل پرویز مشرف کی اقتدار پر آمد میں انہیں ذمہ دار قرار نہیں دیتے،اور اس لحاظ سے ان کی آمد کو جائز قرار دیتے ہیں،لیکن ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ بے نظیر بھٹو اور نواز شریف کو نہ صرف ملک میں واپس آنے دیا جائے بلکہ ان کی عوامی تائید کو ملک کی بقا اور ترقی کے لئے سود مند بنایا جائے۔

☆ بھارت کے ساتھ تعلقات میں حیدر قریشی دوستی کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہیں۔انہوں نے جولائی ۲۰۰۲ء میں انڈو پاک تعلقات کو بہتر بنانے اور سارک یونین کو یورپی یونین کے انداز میں ترقی دینے کا مشورہ دیا تھا۔یہ ایسا وقت تھا جب پاکستان اور ہندوستان دونوں ایٹمی ملکوں کے تعلقات انتہائی کشیدہ تھے اور دونوں طرف کے صحافیوں اور سیاستدانوں میں سے کوئی بھی صلح صفائی کی بات سننے کا بھی روادار نہیں تھا۔بعد میں حالات تبدیل ہوئے تو محترمہ بے نظیر بھٹو صاحبہ کی طرف سے ایسی تجویز سامنے آئی اور مشاہد حسین اور ارشاد احمد حقانی جیسے جید صحافیوں نے بھی پاک بھارت تعلقات کو کنفیڈریشن کی سطح تک لانے کی پرانی تجاویز کا تفصیلی ذکر کیا۔

☆ حیدر قریشی کے نزدیک پاکستان اور ہندوستان کے تعلقات کو بہتر بنانے کی راہ میں دونوں طرف کے مذہبی انتہا پسند رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔

☆ اسلامی دنیا کے حوالے سے انہوں نے سعودی عرب اور پاکستان کی مثالوں سے اسلامی دنیا کا نقشہ کھول کر بیان کیا ہے۔دونوں ملکوں کی پولیس عوام کی خدمت اور قانون کے نفاذ سے زیادہ اپنے حکمرانوں کے اقتدار کے تحفظ پر توجہ دیتی ہے اور اپنے عوام کو ذلیل کرتی ہے۔اسی طرح دونوں ملکوں کا

ٹریفک کا نظام مسلمان حکومتوں کے پورے سسٹم کی بد نظمی کو ظاہر کرتا ہے۔

☆ موضع میر والا کی مظلوم خاتون مختاراں مائی کے بارے کالم لکھتے ہوئے بھی اور عمران خان کے خلاف چلائی جانے والی گمنام فحش پوسٹر بازی کی مذمت کرتے ہوئے بھی انہوں نے ان رویوں کو مسلمان ملکوں کے المیوں کے طور پر پیش کیا ہے۔یہاں ان دونوں کالموں کے اختتامی حصوں کے اقتباس درج کر دیتا ہوں۔

☆☆ ’’مجھے ایسے لگا ہے جیسے مختاراں بی بی ہی فلسطین اور عراق ہے،اور مختاراں بی بی ہی کشمیر اور افغانستان ہے۔۔۔۔امریکہ اور اس کے سارے حلیفوں نے ،اسرائیل اور ہندوستان نے۔۔۔سب نے مل کر چاروں اطراف سے مختاراں بی بی پر حملہ کر دیا ہے۔فلسطین،عراق،کشمیر،افغانستان سب لٹ گئے ہیں۔۔۔۔مختاراں بی بی لٹ گئی ہے۔
آیئے ہم سب مل کر مختاراں بی بی کے لئے روئیں!‘‘

☆☆ ’’ مجھے لگتا ہے عمران خان کے خلاف چلائی جانے والی گندی مہم ہمارے جس قومی اخلاقی زوال کی نشانی ہے،وہ زوال پورے عالم اسلام میں نفوذ کر چکا ہے۔عالمِ اسلام عمومی طور پر اپنی بیشتر سماجی اور سیاسی سطحوں پر اس وقت انتہائی خود غرضی اور مفاد پرستی کی دلدل میں دھنس چکا ہے،اس دلدل سے بچ نکلنے والوں کے لئے آگے امریکی صدر بش اور ان کے مشیروں کی بنائی ہوئی دلدل موجود ہے۔‘‘

حیدر قریشی نے اپنے کالموں کے ذریعے سب سے پہلے گریٹر اسرائیل منصوبے کے بارے میں بتایا کہ مکہ اور مدینہ کو بھی اسرائیل کا حصہ بنایا جانا ہے۔ان کے کالم کی اشاعت کے بعد ٹی وی اور اخبارات میں اس سنگین مسئلہ کا کافی چرچا ہوا۔بعض علماء نے بھی کہا کہ ہم نے گریٹر اسرائیل کا نقشہ منگا کر دیکھا ہے واقعی اس میں مکہ اور مدینہ کو اسرائیل کا حصہ دکھایا گیا ہے۔لیکن چند دنوں کی تشویش اور گفتگو کے بعد بقول حیدر قریشی سارے ٹی وی چینل،اخبارات اور قومی رہنما ’’پھر خوابِ خرگوش میں چلے گئے‘‘۔

ایک اور کام جو حیدر قریشی کا منفرد انداز کہا جا سکتا ہے انہوں نے آج کے حالات کو مذہبی پیشین گوئیوں کے حوالے سے بھی دیکھا۔انہوں نے ایک کالم میں پیشگوئی کا ذکر کیا تو اس سے عین اگلے روز اے آر وائی چینل کے معروف سیاسی دانشور ڈاکٹر شاہد مسعود نے اپنے پروگرام میں اسی حوالے سے ڈاکٹر اسرار احمد کے ساتھ پورا پروگرام پیش کر دیا۔لیکن حیدر قریشی نے دیکھا کہ وہ پروگرام کسی ہوم ورک کے بغیر جلدی میں پیش کیا گیا تھا اسی لئے اس میں کام کی باتیں ہو نہیں سکیں۔اس کے نتیجہ میں حیدر قریشی نے پھر ایک تفصیلی کالم لکھا جس میں وہ بیشتر پیشگوئیاں درج کر دیں جو آج کے حالات کی سنگینی کی نشاندہی کرتی تھیں۔گریٹر اسرائیل اور مذہبی پیشگوئیوں کے سلسلے میں حیدر قریشی کے بنیادی کام کے ذکر پر جب

پروفیسر نذر خلیق نے ان سے سوال کیا تو ان کا سوال اور جواب خود ہی پڑھ لیجئے۔

''**نذر خلیق:** کیا ٹی وی چینل والوں نے کہیں آپ کا حوالہ دیا ہے؟

حیدر قریشی: میرے بھائی ملک کے مقتدر طبقوں کی طرح ہمارے اس نوعیت کے دانشور بھی کسی دوسرے کے کام کا اعتراف کرنا اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ یہ تو ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے دستیاب وسائل کی بنیاد پر میری تضحیک کا سامان کر دیں لیکن یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ میرے کام کی بنیادی اہمیت کو کسی رنگ میں بھی سامنے آنے دیتے۔ الکٹرانک میڈیا بے شک بہت موثر ہے لیکن ہم جیسے گنہگار اسی طرح تاریخ میں اپنا بیان محفوظ کر لیتے ہیں۔ اگر ہمارے مقتدر طبقوں کی یہ ''میں'' حائل نہ ہوتی تو عالمِ اسلام اس عبرتناک حال کو کیوں پہنچتا۔''

اردوستان ڈاٹ کام کے ایڈیٹر کاشف الہدیٰ (مقیم امریکہ) نے حیدر قریشی کی کالم نگاری کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''حیدر قریشی صاحب کو اپنی قوم اور ملک سے بے حد محبت ہے۔ جو بھی لکھتے ہیں، سوچ سمجھ کر لکھتے ہیں۔ بات کی تہہ تک پہنچ جانا اور پھر قاری کو اپنا موقف اس طرح سمجھاتے ہیں کہ ان سے اتفاق رائے کرنا ہی پڑتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ان کے کالم کا نام ''منظر اور پس منظر'' ہے، اور واقعی وہ منظر کا پس منظر یوں بیان کرتے ہیں کہ قاری حیران ہو جاتا ہے۔''

میرے نزدیک حیدر قریشی کے کالموں کا مجموعہ ''منظر اور پس منظر'' ہماری مقامی صورتحال سے لے کر عالمی صورتحال تک کو گہری نظر سے دیکھنے والی بڑی فکر انگیز کتاب ہے۔ اس میں لکھی ہوئی بعض باتیں آنے والے وقت میں اس کتاب کی اہمیت کا احساس دلائیں گی۔

☆☆

''حیدر قریشی کی کالم نگاری اپنے عہد کے تکلیف دہ عالمی حالات کو اس کے تاریخی پس منظر سے سمجھنے کی ایک کاوش ہیں، ایسی کاوش جس میں انسانیت کے بہتر مستقبل کے لئے نئی راہوں کے لئے اشارے بھی دیئے گئے ہیں۔ حیدر قریشی نے اپنے کالموں سے اپنی سیاسی بصیرت کا ثبوت دینے کے ساتھ یہ باور کرایا ہے کہ ادیب اپنے سماج سے لاتعلق نہیں ہوتا اور یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ خالص ادب اور صحافت ایک دوسرے سے قریب تو ہیں لیکن دونوں الگ الگ میدان ہیں۔''

(**پروفیسر نذر خلیق** کے مضمون ''**حیدر قریشی بحیثیت کالم نگار**'' سے اقتباس

بحوالہ کتاب ''حیدر قریشی کی ادبی خدمات'' مرتب پروفیسر نذر خلیق۔ ص ۲۶۲)

ناصر عباس نیر (لاہور)

حیدر قریشی کے انٹرویوز

حیدر قریشی کا تعلق ستر کی دہائی میں سامنے آنے اردو ادبا کی نسل سے ہے۔ اس دہائی میں اردو ادب میں جدیدیت کا غلغلہ بے حد بلند تھا۔ جدیدیت بلاشبہ ہمارے یہاں مغرب سے آئی تھی، مگر مغرب میں جدیدیت کو جس طور تخلیقی، فلسفیانہ اور تنقیدی سطح پر برتا گیا تھا اور وہاں فکشن میں بالخصوص جدیدیت کے زیرِ اثر جو نمونے سامنے آئے تھے (''یولیسس'' سے لے کر ''میٹامارفوسس'' تک) ہمارے یہاں جدیدیت کو نہ اس طور برتا جا سکا ہے اور نہ جدید فکشن میں کوئی بڑا کام سامنے آسکا ہے، جسے جدید عالمی ادب کے سامنے اعتماد سے پیش کیا جا سکے۔ ہمارے یہاں جو نام جدید فکشن کے بنیاد گذار کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں ان کا فن دراصل بعض پرانی بیانیہ روایات کے احیا سے عبارت ہے۔ جب کہ جدید اپنی روح کے اعتبار سے تاریخی عدم تسلسل اور ایک منفرد، یکسر نئی شناخت اور انفرادی جمالیات کی تشکیل کرتا ہے۔ پرانی روایت کو نئے، عصری محاورے میں پیش کرنا جدت کہلا سکتا ہے جدید نہیں۔ (جدت اور جدیدیت کے فرق کو عموماً نظر انداز کیا گیا ہے)۔ دوسری طرف جن لوگوں نے جدید کا مطلب ایک یکسر نئی جمالیات کی تشکیل لیا وہ اس تخلیقی صلاحیت سے محروم تھے جو قدیم کے انہدام اور نئے کی تعمیر کے لیے ضروری ہے۔ یعنی یہ انہدام تو کرتے تھے مگر ایک ایسی نئی تعمیر سے قاصر تھے جو قدیم کا متبادل ہو اور اس سے پیدا ہونے والی خالی جگہ کو پر کرتی ہو۔ چناں چہ یہ لوگ اپنی ساری قوت ہئیتی سطح کے بے ثمر تجربات میں صرف کرنے لگے۔ نتیجہ معلوم!

ستر کی دہائی میں آنے والی نسل کے سامنے یہ سب ہو رہا تھا۔ اسے اب اپنی شناخت بنانی تھی۔ ہر نسل اپنے ابتدائی سفر میں اپنی پیش رو نسل سے اثر پذیر ہوتی، مگر پھر وہ اپنی جداگانہ شناخت کی خاطر پیش رووں کا تجزیہ اور محاسبہ کرتی ہے۔ ستر کی دہائی والی نسل نے بھی اولاً جدیدیت کے اثرات قبول کیے اور بعد ازاں اس جدیدیت کا محاسبہ کیا۔ محاسبے کی تحریک دراصل جدیدیوں کی بعض انتہا پسندانہ روشوں اور جدیدیت کو سطحی طور پر لینے کا ردعمل تھی۔ یہ محاسبہ کرنے والوں میں حیدر قریشی بھی شامل ہیں۔ دوسرے لفظوں میں حیدر قریشی نے اپنی ادبی شناخت اپنے پیشرووں کے تخلیقی رویوں کے تجزیے

کے نتیجے میں قائم کی ہے۔انہوں نے اپنے مقالات اورانٹرویوز میں متعدد مقامات پراردو جدیدیت کے جعلی رویوں پر گرفت کی ہے۔اور یہ موقف اختیار کیا ہے کہ ان کے معاصرین اپنے پیش رووں کی مانند پلاننگ کر کے نہیں لکھتے بلکہ تخلیقی انداز میں اپنے اندر کی آواز پر لکھتے ہیں۔حیدرقریشی نے جدیدیوں کے ساتھ ساتھ ان ترقی پسندوں سے بھی اپنی برات کا اعلان کیا ہے جوادب کوایک نعرے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔انہیں احساس ہے کہ ان کی تحریریں سماجی زندگی کے ٹھوس تجربات سے اپنا بنیادی مواد اخذ کرتی ہیں اور وہ ایک خاص مفہوم میں ترقی پسند ہیں۔مگر وہ تجربے کواپنی روح میں حل کرنے اور پھر ایک فطری اور تخلیقی انداز سے تجربے کے اظہار کے قائل ہیں۔اس اعتبار سے ان کی بنیادی شناخت (اپنے بیشتر معاصرین کی مانند) اپنے عہد کی دو بڑی تحریکوں (جدیدیت اور ترقی پسندی) سے ہٹ کر ایک اپنا راستا اختیار کرنے میں ہے۔وہ اسے کوئی خاص نام دینے کی کوشش نہیں کرتے۔گوپی چند نارنگ صاحب اس نسل کے تخلیقی رویوں کو مابعد جدیدیت سے موسوم کرتے ہیں۔لیکن مابعد جدیدیت سے جوتصورات وابستہ ہیں وہ اس نسل کے تخلیق کردہ ادب میں بالعموم نہیں پائے جاتے۔اس نسل کی شناخت کے لیے اگر اسے کوئی نام دینا ضروری بھی ہوتو اسے ''آزاد تخلیقی رویہ'' کہنا مناسب ہے۔

حیدرقریشی کی فکر ہر چند وزیر آغا کے ادبی نظریے سے مستنیر ہوئی ہے اوراس امر کے اعتراف میں انہیں کبھی تامل نہیں ہوا،مگرانہوں نے اپنی مسلسل محنت، جاں کاہی اور ریاضت سے ایک اپنا مقام پیدا کیا ہے،اوراس کے لیے وہ کسی کے مرہونِ منت نہیں ہیں۔وزیر آغا سے انہوں نے یہ نکتہ لیا ہے کہ ادب کی تخلیق ایک بے ریا عمل ہے۔اندر کی آواز سب سے مستند ہے،اگر یہ آواز تخلیق کار کو سنائی دے رہی ہے تو اسے کسی سے سند لینے کی ضرورت نہیں۔اس نظریے کواپنی گرہ میں باندھ کر حیدرقریشی نے جومتعدد سمتوں میں قابلِ قدر کام کیا ہے،اس پر حیدرقریشی کی انفرادیت کی مہر ثبت ہے۔

حیدرقریشی نے غزل،نظم،افسانہ،انشائیہ،خاکہ،آپ بیتی،سفرنامہ،تنقید،تحقیق لکھی ہے۔رسالہ ''جدید ادب'' کے مدیر ہیں۔اور ماہیے کے سلسلے میں ان کی خدمات اس قدر زیادہ اوراہم ہیں کہ ماہیے کے ساتھ ان کا نام اسی طرح وابستہ ہے جس طرح مثنوی کے ساتھ مولانا روم کا،مغربی انشائیے کا ساتھ مونتین کا اور اردو انشائیے کے ساتھ وزیر آغا کا۔حقیقت یہ بھی ہے کہ انہیں غیر معمولی شہرت اور اہمیت ماہیے کی وجہ سے ہی ملی ہے۔کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ ان کی دوسری حیثیتیں ثانوی ہیں یا کم اہم ہیں۔ہرگز نہیں۔شہرت انہیں پہلے بھی حاصل تھی اوران کی شاعری اور افسانہ اہم سمجھے گئے تھے۔لیکن ان کے نام کا ڈنکا ماہیے کے فروغ کے ضمن میں ہی بجا ہے۔اوران پر جوتنقیدی کام ہوا ہے وہ نوے کی دہائی کے بعد ہی ہوا ہے،جب ماہیے کے حوالے سے انہیں قبولیت واسترداد کے عمل سے گذرنا پڑا۔جب ماہیے کے

سلسلے میں ان کی آرا کواہم گردانا جانے لگا تو ان کے خیالات جاننے کی جستجو بھی کی جانے لگی۔غالباً جبھی ان کے انٹرویو کیے جانے لگے۔(جوگندر پال والا انٹرویو اس سے پہلے کا لگتا ہے)۔

جب کسی ادیب کے انٹرویو تواتر سے کیے جانے لگتے ہیں اورانہیں کتابی صورت میں بھی یکجا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ ادیب خصوصی اہمیت اختیار کر گیا ہے اوراس کے خیالات وزنی سمجھے جانے لگے اور اس کی آرا اہم گردانی جانے لگی ہیں۔اس کتاب میں یوں تو رسمی،غیر رسمی،سرسری،مفصل ہر قسم کے انٹرویو شامل ہیں۔بعض انٹرویو ایسے بھی ہیں جو دو دانشوروں کے درمیان مکالمے کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔تاہم بیشتر انٹرویوز میں حیدرقریشی کی آرا اور خیالات جاننے اوران کی ذاتی اورادبی زندگی سے متعلق معلومات حاصل کرنے کی جستجو کی گئی ہے۔گویا ان کی ذاتی اورادبی زندگی کی اہمیت کے پیشِ نظر یہ انٹرویو کیے گئے ہیں۔

جیسا کہ ابھی ذکر ہوا کتاب میں ہمہ قسم کے انٹرویوز شامل ہیں۔یہ تمام انٹرویو حیدرقریشی کی پوری شخصیت کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔یعنی حیدرقریشی کی سوانح،ان کی ابتدائی تعلیم،ملازمت،شادی، ادبی زندگی کا آغاز،ان کے شخصی میلانات،ان کے حلقہ احباب،ان کے مذہبی میلانات،ان کے ادبی نظریات،ان کی ادبی فتوحات،اوران کی تخلیقات کے امتیازات۔۔۔۔سب باتوں کو ان انٹرویوز کے ذریعے سے سمجھا جا سکتا ہے۔بہت سی باتیں انہوں نے خود کہی ہیں اور بعض باتیں ان کے احباب اور اعزا نے کہہ دی ہیں۔اس زاویے سے تو تمام انٹرویو اچھے اور اہم ہیں،لیکن اگر انٹرویو سے مراد محض نجی اور سوانحی معلومات سے بڑھ کر دو اشخاص کے درمیان ایک فکری مکالمہ لیا جائے،ایک یا چند موضوعات پر دو مشاہیر کا تبادلہ خیالات لیا جائے،ایک دوسرے کے فکری باطن کو کریدا جانا مقصود ہو تو اس کتاب میں تین ایسے انٹرویو بھی موجود ہیں۔جو جوگندر پال،اختر رضا سلیمی اور نذر خلیق نے لیے ہیں۔

ہر انٹرویو میں انٹرویو کے دونوں فریق آزمائش میں ہوتے ہیں۔انٹرویو لینے والے کی آزمائش یہ ہے کہ وہ کہاں تک سامنے بیٹھے ہوئے ہوئے شخص کی ذات کو کریدنے اوراس کے باطن کے چھپے گوشوں کو منظرِ عام پر لانے میں کامیاب ہوتا ہے اور انٹرویو دینے والے کی آزمائش یہ ہے کہ وہ سوالات کے برمحل،برجستہ جوابات دینے میں کہاں تک کامیاب ہوتا ہے۔ سوائے مذکورہ تین انٹرویوز کے باقی ہر انٹرویو میں حیدرقریشی سے انٹرویو کرنے والے آزمائش میں محسوس ہوتے ہیں۔ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ بعض انٹرویو تحریری اور انٹرنیٹ کے ذریعے لیے گئے ہیں جن میں سوال اندر سوال اٹھانے کی سہولت نہیں ہوتی۔ تمام انٹرویوز میں حیدرقریشی نے جوابات برمحل،بے ساختہ،دلچپ اور برجستہ دیے ہیں۔ حیدرقریشی کے ان انٹرویوز کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے موقف کو کسی مصلحت کو ملحوظ رکھے بغیر پیش

کرتے ہیں۔مثلاً وہ مغرب میں رہتے ہوئے وہاں کے اردو ادبا سے متعلق اپنے خیالات بے باکانہ انداز میں ظاہر کرتے ہیں۔یہ خیالات چشم کشا ہیں۔جو حضرات امریکا اور یورپ کو اردو کی نئی بستیاں قرار دے رہے ہیں ان کو یہ انٹرویوز ضرور پڑھنے چاہییں۔۔۔۔اوپر جن تین انٹرویوز کا ذکر ہوا ان میں حیدر قریشی کو واقعی آزمایش میں ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ان سے سرسری سوالات کے جوابات نہیں طلب کے گئے، بلکہ ان سے مکالمہ کیا گیا ہے۔ان کے فکری اور تخلیقی باطن کو کھنگالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ان میں حیدر قریشی نے جدیدیت، جدید افسانہ، ساختیات، اپنے نظریہ ادب، ماہیے کے فنی مسایل پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ماہیے کے سلسلے میں ان کی وضاحتوں سے کئی غلط فہمیاں دور ہوتی ہیں۔اور ان انٹرویوز کی افادیت دوچند ہو جاتی ہے۔

اپنے انٹرویوز میں حیدر قریشی نے کئی اہم نکات بھی اٹھائے ہیں جن پر بحث ہو سکتی ہے۔مثلاً انہوں نے ڈاکٹر صابر آفاقی کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا ہے:''ماہیا اردو میں ایسے وقت میں مقبول ہوا جب جدید شاعری کے نام پر انتہا پسند تجربوں کے ذریعے ہمارے انتہا پسند تخلیق کاروں نے شاعری کا رشتہ معنویت کی بجائے لایعنیت سے جوڑ لیا تھا۔'' گویا ان کے خیال میں جدید شاعری میں زمینی رشتوں کا احساس نہیں تھا۔ماہیا اپنی شعریات کی رو سے زمین سے مربوط ہوتا ہے۔یہ ایک خیال انگیز نکتہ ہے جس پر مزید گفتگو کی جانی چاہیے۔اسی طرح انہوں نے سلطانہ مہر کو انٹرویو دیتے ہوئے اردو میں مغرب کی طرح ناول کے فروغ نہ پانے کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے اور کہا ہے''جز میں کل کو دیکھنے کے مشرقی مزاج کے باعث ہمارے ہاں افسانہ نگاری زیادہ مقبول ہوئی اور ناول کی طرف رجحان کم ہوا۔ناول کا انداز بنیادی طور پر مغربی مزاج سے میل کھاتا ہے۔'' یہ نقطۂ نظر بھی خیال انگیز ہے اور بحث طلب بھی!

شاید قریشی صاحب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ناول میں جو تجزیاتی انداز اختیار کیا جاتا ہے وہ ہمارے مزاج کا اس طرح حصہ نہیں بنا جس طرح اہلِ مغرب کے ثقافتی مزاج کا حصہ ہے۔لیکن اردو میں اچھی خاصی تعداد میں ناول لکھے گئے ہیں۔اور ان میں خاصے ضخیم بھی ہیں اور معیاری بھی۔افتخار امام صدیقی کو انٹرویو دیتے ہوئے انہوں نے مابعد جدیدیت کے حوالے سے جمیل جالبی کی رائے دہرائی ہے کہ یہ یہودی سازش ہے۔یہ رائے بھی گفتگو کو دعوت دیتی ہے۔کیا علمی نظریات اور تنقیدی تصورات کے پس منظر میں سیاسی سازشیں کارفرما ہوتی ہیں؟ سوال یہ بھی ہے کہ جمیل جالبی کو آرنلڈ اور ایلیٹ تک تو سازش نظر نہیں آتی مگر بارت، دریدا، ٹیری ایگلٹن، جیمی سن وغیرہ کے یہاں سازش نظر آنے لگتی ہے۔

بہر کیف حیدر قریشی کے انٹرویوز میں متعدد ایسے نکات ظاہر ہوئے ہیں، جو قاری کو غور و فکر اور بحث مباحثے کی دعوت دیتے ہیں۔اور ایک اچھے انٹرویو کی خوبی یہ ہے کہ وہ ایک مخصوص شخصیت کے

نقطۂ نظر کے حوالے سے قاری کے بعض سوالات کے جوابات دے تو اس کے اندر بعض نئے سوالات بھی ابھارے یا سوالات پر نئے زاویوں سے تامل کرنے پر اسے مائل کرے اور اسے فکری سطح پر متحرک کرے۔اس اعتبار سے یہ کتاب بے حد کامیاب ہے!! ☆☆

(یہ مضمون کتاب **انٹرویوز** میں بطور پیش لفظ شامل ہے)

اس کتاب میں دو طرح کے انٹرویوز شامل ہیں۔ایک تو وہ انٹرویوز جو حیدر قریشی سے وقتاً فوقتاً لئے گئے۔دوسرے وہ انٹرویوز جو اسلامیہ یونیورسٹی بھاولپور کی طالبہ منزہ یاسمین نے اپنے تحقیقی مقالہ کے لئے سوالنامے کے طور پر کئے تھے۔یہ سوالنامہ حیدر قریشی کے بعض عزیز و اقارب اور ادبی دوستوں کو بھیجا گیا۔ان کی طرف سے جو جواب موصول ہوئے ان کی ایک اہمیت ہے۔تحقیقی مقالہ میں سارے جوابات سے استفادہ نہیں کیا جا سکا تھا۔اس کی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔تحقیقی ضرورت کے مطابق زیادہ اہم حصوں کو لے لیا گیا۔اسی طرح بعض جوابات لکھے گئے اور منزہ یاسمین کو بھیج دیئے گئے لیکن قدرے تاخیر سے ملنے کی وجہ سے وہ ان جوابوں سے استفادہ نہ کر سکیں۔ لیکن ان کے سوالنامہ کی بنیاد پر جن لوگوں نے جواب لکھے تھے ان سب کی اہمیت کے پیش نظر ان سارے سوالوں اور جوابوں کو ''انٹرویوز'' کے دوسرے حصے میں شامل کر لیا ہے۔اس لحاظ سے انٹرویوز کا یہ مجموعہ ایسے دو طرح کے انٹرویوز کی وجہ سے ایک منفرد رنگ اختیار کر گیا ہے۔حیدر قریشی کے انٹرویوز سے ان کے ادبی خیالات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور ان کی تحریروں کے بارے میں بہتر واقفیت ہوتی ہے۔اس بارے میں ناصر عباس نیر کے سیر حاصل پیش لفظ کے بعد میرے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ان کے قریبی رشتہ داروں کے انٹرویوز سے بہت سی دلچسپ باتیں سامنے آئی ہیں لیکن میں ایک ایسی اہم بات یہاں بیان کروں گا جو ان کے رشتہ داروں میں سے کسی نے کسی رنگ میں نہیں بتائی۔جب حیدر قریشی خانپور میں تھے تب وہ اردو میں دستخط کیا کرتے تھے۔بنک اکاؤنٹ ہو یا کوئی سرکاری دستاویز، ہر جگہ انہوں نے اردو میں دستخط کئے۔میرا خیال تھا کہ جرمنی میں جا کر انہوں نے اردو میں دستخط کرنا ترک کر دیا ہو گا لیکن ایک بار میرے استفسار پر انہوں نے بتایا کہ میں یہاں بھی ہر سرکاری یا غیر سرکاری کاغذ پر اردو میں ہی دستخط کرتا ہوں ۔جرمن پاسپورٹ پر بھی اردو میں دستخط کئے ہیں۔یہ کوئی ایسی بڑی خبر نہیں ہے۔لیکن اس سے حیدر قریشی کی افتادِ طبع کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

(کتاب **حیدر قریشی سے لیے گئے انٹرویوز** کے مرتب **سعید شباب** کے''عرضِ مرتب'' سے اقتباس)

اسلم رسولپوری (جام پور)

حیدرقریشی کے انٹرویوز

جناب سعید شباب کی مرتب کردہ کتاب (حیدرقریشی سے لئے گئے) **انٹرویوز** ابھی ابھی پڑھ کر میں نے ختم کی ہے اوراس کا فوری تاثر میرے ذہن پر باقی ہے، میرا خیال ہے اسے فوری طور پر لکھ دینا زیادہ غیر جانب دارانہ ہوگا۔ یہ انٹرویوز دو قسم کے ہیں ایک تو وہ انٹرویوز ہیں جو حیدرقریشی سے لئے گئے ہیں اور دوسرے وہ ہیں جو حیدرقریشی کے بارے میں لئے گئے ہیں۔جن میں کچھ ایم۔اے کی ایک طالبہ منزہ یاسمین نے اپنے تھیسس کے لئے، لئے ہیں جو وہ جناب حیدرقریشی پر لکھ رہی تھیں۔

آغاز میں ان انٹرویوز سے کرنا چاہوں گا جن کا تعلق حیدرقریشی کی ذات سے ہے کیونکہ میرے اپنے نکتہ نظر کے مطابق اگر ہم کسی تخلیق کار کی ذات کے اندر جھانک سکتے ہیں تو یہ اس کی تخلیقات کو سمجھنے میں مدد دے گا۔ایسے انٹرویوز میں دو اہم ہیں۔ایک تو فرحت نواز شیخ کا اور دوسرا حیدرقریشی کی بیگم صاحبہ کا۔فرحت نواز شیخ ان کی دوست اور بہت ہی قریب سے جاننے والی ہیں۔انہوں نے حیدر کے بارے میں بتانے سے کچھ کنجوسی سے کام لیا ہے اگر وہ ان کی درویشانہ بددعاؤں سے خوف زدہ نہ ہوتیں تو ہمیں حیدرقریشی کی اندر کی دنیا کو سمجھنے میں مدد ملتی جس کی آواز پر وہ لکھتے ہیں اوراس طرح یہ انٹرویو ہمیں زیادہ کچھ دے سکنے کے باوجود نہ دے سکا۔

جہاں تک ان کی بیگم صاحبہ کے انٹرویو کا تعلق ہے۔اس سے ہمیں یہ سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ ایک اہل قلم کی مصروفیات کس طرح ان کی بیویوں کے لئے سوکن کا کام دیتی ہیں۔اس انٹرویو سے ہمیں حیدر قریشی کی بے پناہ ادبی مصروفیات کا اندازہ بھی ہوتا ہے کہ وہ اس کام کے لئے وقت کی کتنی قربانی دیتے ہیں۔ جہاں تک حیدرقریشی سے لئے گئے انٹرویوز کا تعلق ہے تو ہم ان میں سے ان حصوں کو ترک کر رہے ہیں۔ جو ان کی تاریخ پیدائش، تعلیم، شادی، بچوں اور نوکری وغیرہ جیسے سوالات سے تعلق رکھتے ہیں۔

ان انٹرویوز میں کئی جگہ تخلیقی عمل جیسے بنیادی سوال بھی سامنے آئے ہیں۔ان کے نزدیک تخلیقی عمل اندر کی آواز کا محتاج ہوتا ہے۔وہ سلطانہ مہر کو انٹرویو دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ میرے نزدیک بنیادی اہمیت اندر کی آواز کو ہے۔اسی طرح ثریا شہاب کو انٹرویو دیتے ہوئے کہتے ہیں۔اقبال اور فیض دو انتہاؤں کے

نظریات رکھنے والے شاعر تھے لیکن دونوں نے زیادہ تر اپنے باطن کی آواز پر لکھا اس لئے وہ اعلا شاعر تھے۔حیدر صاحب نے اپنے تخلیقی تجربے کی شدت اور اذیت کو بھی بیان کیا ہے۔نذر خلیق صاحب سے انٹرویو کے دوران انہوں نے بتایا کہ انہوں دو ایسی کہانیاں لکھیں جن کے لکھنے کے بعد وہ جی بھر کر روئے۔اپنے لکھنے کے محرک کے بارے میں انہوں نے بتایا کہ محبت کا جذبہ میرے لئے لکھنے کا سب سے بڑا محرک ہوتا ہے۔اور شاید اسلئے شاعری ان کی پہلی ترجیح رہی ہے

حیدرقریشی نے بہت سی اصناف میں قابل قدر کام کیا ہے لیکن انہوں نے نذر خلیق کو یہ بھی بتایا کہ جب تک مجھے اندر اور باہر سے بیک وقت لکھنے کی تحریک نہیں ہوتی تو اس وقت تک میں نہیں لکھتا۔انہوں نے مختلف اصناف پر اپنے لکھنے کے عمل کے بارے میں کہا کہ جو اصناف میرے مزاج سے قریب تھیں میں نے ان میں تخلیقی کام کیا۔اور انہوں نے ان مختلف اصناف میں لکھنے کے عمل کو مختلف پڑاؤ کا نام دیا۔حیدرقریشی صاحب کے انٹرویوز کے حوالے یہ سب کچھ میں نے اس لئے آپ کے سامنے پیش کیا ہے کہ آپ ان کے تخلیق کار ہونے کے بارے میں خود فیصلہ کر سکیں کہ وہ رولاں بارت کی ادیبوں کی تقسیم کے کس درجے میں آتے ہیں۔آیا وہ Ecrivant یعنی وہ منشی قسم کے ادیب ہیں یا Ecrivain یعنی تخلیقی قسم کے ادیب۔اگر آپ نے ان کی کوئی تخلیق نہیں بھی پڑھی تو بھی میرا خیال ہے کہ ان کے ان نظریات کی روشنی میں بھی آپ یہ سمجھ سکتے ہیں کہ جو شخص تخلیق کے عمل اور تقاضوں کو سمجھتا ہے وہ ایک حقیقی اور سچا تخلیق کار ہے۔حیدرقریشی کا تخلیقی، تحقیقی اور تنقیدی کام ناقابل یقین حد تک زیادہ ہے بعض میدانوں میں ان کا کوئی ہمسر نہیں ہے جیسے ماہیے کا میدان۔اس میں ان کا تخلیقی، تحقیقی اور تنقیدی کام اتنا زیادہ ہے کہ شاید کوئی دوسرا عمر بھر نہ کر سکے۔ان سے لئے گئے تقریبا ہر انٹرویو میں ماہیے پر بات ہوئی ہے لیکن اختر رضا سلیمی کے لئے گئے انٹرویو میں تو تمام گفتگو ہی ماہیے پر ہوئی ہے، جس سے یہ ظاہر ہوتا کہ انہوں نے تخلیقی۔تحقیقی۔اور تنقیدی کام ہی نہیں کیا بلکہ ماہیے کی بقا کے لئے ایک جنگ بھی لڑی ہے اور بہت سی دوستیاں بھی گنوائی ہیں۔انہوں نے ماہیے کے سلسلے میں پنجابی ماہیے کا ذکر کیا ہے لیکن سرائیکی ماہیے کو بھول گئے ہیں حالانکہ سرائیکی ان کی اپنی زبان ہے اور سرائیکی میں جتنا ماہیا ہے وہ پنجابی میں شاید ہو۔اور سرئیکی علاقے میں کوئی بھی بستی ایسی نہ ہوگی جہاں لوگ ماہیا نہ گاتے ہوں۔اردو شاعری کے بارے میں کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس میں دھرتی کی خوشبو اور مہک نہیں ہوتی، حیدرقریشی نے ان کا یہ شکوہ ماہیے کی صنف کے ذریعے ہمیشہ کے لئے دور کر دیا ہے۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ حیدرقریشی ایک شاعر، افسانہ نگار، محقق، نقاد یا انشائیہ نگار اور سفر نامہ نگار ہیں، لیکن یہ بات شاید کچھ لوگوں کے علم میں نہ ہو کہ وہ ایک سیاسی کالم نگار بھی ہیں اور انہوں نے اپنے

سیاسی کالموں میں جو اہم تجاویز دیں یا اپنی سیاسی بصیرت کی بنیاد پر کچھ پیشین گوئیاں کیں وہ بعد میں کس طرح حقیقت کا روپ دھار گئیں۔حیدر قریشی کے ان کالموں پر مشتمل کتاب ،منظر اور پس منظر، کے نام سے چھپی ہوئی ہے۔جس میں سارک کے قیام سے پہلے جنوبی ایشیا میں یورپی یونین کی طرز پر ایک تنظیم کی ضرورت پر زور دیا گیا تھا۔اس طرح انہوں نے گریٹر اسرائیل کے اسرائیلی منصوبے کی بھی نشاندہی کی تھی ،جس کو بعد میں مولانا شاہ احمد نورانی نے بھی تسلیم کیا تھا اور اس پر ٹی ۔وی پروگرامز میں بھی بحثیں ہوئیں مگر کسی نے اس بات کا حوالہ نہ دیا کہ اس منصوبے کے بارے میں سب سے پہلے کس نے لکھا ہے۔میں نے کہیں پڑھا تھا کہ بڑے ناول یا کہانیوں میں مستقبل کی پیشین گوئیاں ہوتی ہیں اگر یہ بات درست ہے تو پھر حیدر قریشی کی کہانی ،حوا کی تلاش، دنیا کی ایک ایسی ہی بڑی کہانی ہے۔حیدر قریشی سے لئے گئے اور ان کے بارے میں لئے گئے انٹرویوز پر مبنی یہ کتاب ایک ایسی کتاب ہے جو ان کی ذاتی اور ادبی زندگی کو سمجھنے کے لئے ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اس کتاب سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حیدر قریشی کی کوئی ذاتی زندگی ہے ہی نہیں بلکہ ان کی زندگی صرف ادبی زندگی ہی ہے۔☆☆

''حیدر قریشی اپنی تمام تخلیقات میں خود سانس لیتے ہوئے اور زندگی بسر کرتے ہوئے موجود ہیں۔خود اس طرح کہ ان کی اپنی زندگی کے ساتھ ان سے وابستہ تمام اہم کردار بھی ان کی تخلیقات میں موجود ہیں۔۔۔ دوسروں کے ہاں خاکوں اور یادوں کے باب میں ایسی زندگی مل جاتی ہے کہ وہاں ان کا ذکر ناگزیر ہو جاتا ہے۔لیکن حیدر قریشی تو شاعری،افسانہ،انشائیہ،سفرنامہ،حتیٰ کہ انٹرویوز تک میں بھی۔۔۔۔اپنی زندگی،اپنے رشتوں،اپنی محبتوں کو ہی بیان کرتے ہیں اور انداز بیان ایسا کہ آپ بیتی، جگ بیتی بن جاتی ہے۔اپنی تمام تخلیقات میں اس طرح سے زندگی بسر کرنا اس عہد کے تمام شاعروں اور ادیبوں میں حیدر قریشی کی الگ پہچان ہے۔اس زاویے سے ان کی تمام تخلیقات خود ایک تحقیقی مطالعہ کا تقاضہ کرتی ہیں۔''

(**پروفیسر فرحت نواز** بحوالہ **انٹرویوز** مرتب:**سعید شباب** ص۱۳۳)

''حیدر قریشی کا شعری سفر ایک طویل عرصے پر محیط ہے۔انہیں میں نے بیس سوالات پر مشتمل سوالنامہ بھیجا تھا جس کا جواب انہوں نے تفصیل سے دیا۔ان کی تحریر میں مطالعہ اور فکر کی عمیق گہرائی ملتی ہے۔آپ ان کے نظریات،ان کی سوچ اور ان کے مطمع نظر سے متفق ہوں یا نہ ہوں لیکن ان کی کہی ہوئی باتوں سے صرفِ نظر نہیں کر سکتے۔یقیناً ان کے جوابات فکر کی نئی راہیں کھولتے ہیں اور مزید دعوت فکر دیتے ہیں''

(**سلطانہ مہر** بحوالہ کتاب **سخنور** صفحہ نمبر ۱۳۲۔مطبوعہ امریکہ ۱۹۹۶ء)

پروفیسر نذر خلیق (خانپور)

اردو ماہیا اور حیدر قریشی

اردو ماہیا کے بارے میں اب تک جتنے مباحث ہو چکے ہیں ،وہ مباحث اختلاف کو ابھارنے والے ہوں یا اتفاق رکھنے والے ہوں ،حیدر قریشی ان تمام مباحث کا مرکزی کردار رہے ہیں۔اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ۱۹۹۰ء میں جب ماہیا نگاری کے اس نئے دور کا آغاز ہو رہا تھا تب سے حیدر قریشی اس میں تخلیقی اور تحقیقی وتنقیدی ہر لحاظ سے سب سے زیادہ اہم اور متحرک کردار ادا کر رہے ہیں۔تاریخی لحاظ سے دیکھا جائے تو ممتاز عارف نے سب سے پہلے ''اوراق'' میں اس طرف توجہ دلائی تھی کہ تین ہم وزن مصرعوں پر مشتمل اردو ماہیے، پنجابی ماہیے کی روایت پر پورا نہیں اتر رہے۔یہ اگست ۱۹۹۰ء کی بات ہے۔تب ہی حیدر قریشی بیک وقت ماہیا نگاری اور اس کی تحقیق و تنقید کی طرف متوجہ ہوئے۔ماہنامہ ''ادب لطیف'' لاہور کے نومبر ۱۹۹۰ء کے شمارے میں ان کے ماہیے شائع ہوئے۔جنہیں اردو ماہیے کے نئے اور باقاعدہ دور کی تخلیقی ابتدا کہا جا سکتا ہے۔دسمبر ۱۹۹۰ء میں ان کا خط ''اوراق'' میں شائع ہوا جس میں انہوں نے لکھا:

''ممتاز عارف نے اپنے خط میں ماہیے کے وزن کا مسئلہ اٹھایا ہے جو خاصا وزن رکھتا ہے۔میرا خیال ہے کہ ہمارے ماہیا نگاروں کو باہم طے کر لینا چاہئے کہ انہیں اردو ماہیے کو اصل پنجابی ماہیے کی طرح رکھنا ہے یا اس کا حشر بھی ہائیکو جیسا کرانا ہے''۔

اس خط کے بعد حیدر قریشی نے ماہیے کے لوک خدوخال کو ابھارنے کی سعی کرتے ہوئے اسے اردو میں متعارف کرایا،اپنے مثالی نمونوں سے ان کی درست اردو صورت ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ان کی مساعیٔ جمیلہ سے دیکھتے ہی دیکھتے اردو ماہیا پاکستان کے اردو شاعروں سے نکل کر انڈیا کے پنجاب، مہاراشٹر، راجستھان، بہار،مغربی بنگال، گجرات، یو پی، آندھرا پردیش اور متعدد دیگر صوبوں تک پھیل گیا۔پھر بات برصغیر سے باہر نکلی۔جرمنی،انگلینڈ،امریکہ،کینیڈا،ناروے،اٹلی،ہالینڈ اور دیگر مغربی ملکوں میں رہنے والے شعراء نے بھی ماہیے کہنا شروع کر دیئے۔اور ان میں سے متعدد کے ماہیوں کے مجموعے بھی شائع ہو گئے۔اردو ویب سائٹس پر ماہیے کے لئے سیکشن بنائے جانے لگے اور اردو ماہیے کی سی ڈی

بھی جاری ہوگئی۔ادبی رسائل کے ماہیا نمبرز شائع ہوئے۔میں یہاں اردو ماہیے کی اب تک کی پیشرفت اوراس کے مستقبل کے امکانات پر بات نہیں کرنا چاہتا کہ اس طرح مضمون بہت پھیل جائے گا۔میرا مقصد اردو ماہیا نگاری کے سلسلے میں حیدرقریشی کی اب تک کی کارکردگی اور خدمات کا تھوڑا سا ذکر کرنا ہے۔اردو میں ماہیے کی تحقیق اورتنقید کے سلسلے میں حیدرقریشی کی تین کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔

ا۔اردو میں ماہیا نگاری، ٢۔اردو ماہیے کی تحریک، ٣۔اردو ماہیے کے بانی۔۔ہمت رائے شرما

پہلی کتاب تحقیق وتنقید کی یک موضوعی کتاب ہے۔جبکہ باقی دونوں کتابیں ان کے مضامین کے مجموعے ہیں۔ان کے بعد بھی حیدرقریشی کے متعدد مضامین اورطویل خطوط شائع ہو چکے ہیں جن میں انہوں نے اپنے موقف کی وضاحت کی ہےاورمعترضین کےاعتراضات کے مدلل جواب بھی دیئے ہیں۔ متعدد ماہیا مجموعوں کے پیش لفظ حیدرقریشی کےتحریرکردہ ہیں۔ان کو ماہیا کی عملی تنقید کہا جا سکتا ہے۔

اردو میں ماہیا نگاری سے اردو ماہیے تک۔۔۔۔حیدرقریشی نے تحقیقی طور پرایک سفر کیا ہے۔ایسا سفر جس سے ان کے ذہنی ارتقا کا پتہ بھی چلتا ہےاوران حقائق کا بھی جو ماہیے کے مباحث کے نتیجہ میں مسلسل نمایاں ہوکرسامنے آتے چلے گئےاورحیدرقریشی کے موقف کومزیدتقویت دیتے رہے۔''اردو میں ماہیا نگاری'' تک درست اردو ماہیے کے جو پرانے نمونے دستیاب تھے وہ قمر جلال آبادی اور ساحر لدھیانوی کے فلمی ماہیے تھے۔''اردو ماہیے کی تحریک'' تک ان دونوں سے پہلے ہمت رائے شرما اور قتیل شفائی کے فلمی ماہیے بھی دریافت ہوچکے تھے۔یہ سارے فلمی ماہیے جومحض لکھے نہیں گئے تھے بلکہ گائے گئے تھے اور ماہیے کی لوک لَے کو مدِ نظر رکھ کر گائے گئے تھے،سب کے سب حیدرقریشی کے موقف کی تائید کرتے ہیں۔اس دوران چراغ حسن حسرت کے''مبینہ ماہیوں'' کا چرچا کیا جانے لگا،حالانکہ حیدرقریشی نے اپنی پہلی کتاب کے باب''اردو میں ماہیا نگاری کی ابتداء'' کا آغاز ہی چراغ حسن حسرت کے نام اور کام سے کیا ہےاوراس بارے میں اپنے موقف کووضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ماہیے کے مخالفین سے جب اور کچھ نہیں بنا تو ماہیا نگاری کے ابتدائی نقوش کی تلاش میں چراغ حسن حسرت کو ہمت رائے شرما کی جگہ اوّلیت کا تاج پہنانے کی کوشش کی گئی۔تب حیدرقریشی نے اپنے دو مضامین☆ میں خصوصی طور پر ہمت رائے شرما کی اولیت کو دستیاب حقائق کی بنیاد پر ثابت کیا۔اسی دوران انہوں نے خود حمید نسیم کی ''ناممکن کی جستجو'' کے حوالہ سے ایک نکتہ نکالا جس سے لگتا تھا کہ چراغ حسن حسرت نے اپنے مساوی الوزن ماہیے جنوری ١٩٣٦ء میں لکھے تھے۔اس طرح ہمت رائے شرما کے اوّلین ماہیے کہنا ١٩٣٧ء میں ثابت ہوتا تھا۔لیکن اس کے ساتھ ہی حیدرقریشی نے ایک کتاب کے حوالے سے زمانی لحاظ سے بھی ہمت رائے شرما کو فوقیت دے دی۔وہ کتاب ہے''مسلم انڈینز آف بائیوگرافیکل ڈکشنری'' از احمد سعید ہیڈ

آف ڈیپارٹمنٹ آف ہسٹری۔ایم اےاو کالج لاہور۔اس کے صفحہ نمبر ٣٢٧ کا حوالہ☆☆ دے کر حیدر قریشی نے اپنے موقف کوانتہائی مضبوط بنالیا ہے۔پنجابی ماہیے کے وزن کے مطابق اردو ماہیے کے وزن کے تعین کے لئے اپنے ابتدائی مضامین میں حیدرقریشی نے یہ موقف اختیار کیا تھا:''ماہیے کی ایک دو نہیں،بیس بحریں بیان کردی جائیں،ہروہ بحر ماہیے کی بحر ہے جس میں ماہیا اپنی مخصوص دُھن میں گایا جا سکتا ہے''(''اوراق''لاہور۔نومبر،دسمبر ١٩٩٣ء۔بحوالہ''اردو ماہیے کی تحریک''صفحہ نمبر ٢٣)

ماہیے کے وزن کی تمام بحث کے بعد وزن کے مسئلہ پر حیدرقریشی کا یہ موقف تاحال حرفِ آخر کا درجہ رکھتا ہے۔پنجابی ماہیے میں پنجابی زبان کی لچک کے حوالے سے اپنی پیش کردہ کئی مثالوں کو بنیاد بناتے ہوئے حیدرقریشی رقمطراز ہیں۔

''ان مثالوں اور سابقہ مضامین کے حوالوں کے بعد ماہیے کے وزن کے سلسلے میں یہ صورتحال سامنے آتی ہے کہ اگر پنجابی ماہیے کے حروف کو اردو عروض کے ضابطوں سے پرکھنے کی کوشش کریں تو دوسرے مصرعوں میں اس قسم کے متضاد وزن ملیں گے۔

ا۔دوسرا مصرعہ پہلے اورتیسرے مصرعوں کے وزن سے دوحروف کم ہوگا۔

٢۔چارحروف کم ہوگا۔ ٣۔مساوی الوزن ہوگا۔ ٤۔دوحروف زیادہ ہوگا۔ ٥۔چارحروف زیادہ ہوگا۔

یہ صرف دوسرے مصرع کی صورتحال ہے۔ریاض احمد نے نشاندہی کی تھی کہ ماہیے کے پہلے اور تیسرے مصرعوں کا وزن بھی اسی طرح کم وبیش ہوتا رہتا ہے۔سو بظاہر ایسی الجھی ہوئی صورتحال میں محض یہ کہہ دینا مناسب نہیں ہے کہ پنجابی ماہیے میں چونکہ دوسرے مصرعہ میں ایک''سبب'' کم وزن والے ماہیے بھی ملتے ہیں اور مساوی الوزن بھی۔لہٰذا اردو میں دونوں طرح کے ماہیے جائز ہیں۔کیونکہ پنجابی حروف کو اردو عروض کے گھیرے میں لینا مناسب نہیں وگرنہ پھر مذکورہ بالا پانچوں قسم کے ماہیے جائز قرار دینا پڑیں گے اور یہ ماہیے کے ساتھ سنگین مذاق ہوگا۔ماہیے کے سلسلے میں جتنا الجھاؤ ہے وہ اس وقت ایک دم ختم ہوجاتا ہے جب ہم ماہیے کواس کی لَے سے سمجھتے ہیں۔پنجابی ماہیے کی لَے کو آسانی سے اردو عروض کے گھیرے میں لیا جا سکتا ہے اوراس لَے کی رُو سے ماہیے کا پہلا اور تیسرا مصرعہ تو مساوی الوزن ہوتے ہیں جبکہ دوسرے مصرعہ کا وزن ایک''سبب'' کم ہوتا ہے۔'' (اردو ماہیے کی تحریک۔صفحہ نمبر ١٣٢)

ماہیے کی بحث میں جب دیکھا گیا کہ حیدرقریشی کے موقف کو بڑے پیمانے پر پذیرائی ملنے لگی ہے تو مخالفین نے اپنے مختلف مقاصد کے تحت ماہیے کی تحریری ہیئت کے مسئلے کو اچھالنے کی کوشش کی اوراصرار کیا کہ ماہیا کو ڈیڑھ مصرعی ہیئت میں لکھا جانا چاہئے۔اس سلسلے میں حیدرقریشی کے تین مضامین خاص اہمیت کے حامل ہیں۔''اردو ماہیے کی تحریک'' اور''پنجابی لوک گیت۔ماہیے کی تحریری ہیئت'' یہ دونوں مضامین

ان کی کتاب ''اردو ماہیے کی تحریک'' میں شامل ہیں جبکہ تیسرا مضمون ''ماہیے کی بحث'' ''اوراق'' لاہور کے جولائی، اگست ۱۹۹۹ء کے شمارے میں دستیاب ہے۔ان تینوں مضامین سے انہوں نے ثابت کیا ہے کہ ماہیے کی بحث کے آخری مرحلے میں وزن کے مسئلے پر اپنی ناکامی اور حیدر قریشی کے موقف کی پذیرائی سے ان کے مخالفین نے مل کر اس شوشہ کو چھوڑا اور اس میں وہ سب لوگ شامل تھے جو خود سارے مصرعے مساوی الوزن رکھ کر سہ مصرعی ماہیے کہہ چکے تھے۔ چنانچہ ڈیڑھ مصرعی شوشے کے سب سے جارح معترض پرویز بزمی نے ''اوراق'' کے جنوری فروری ۱۹۹۹ء کے شمارے میں اپنے تیروں کا رُخ صرف حیدر قریشی اور ان کے ساتھیوں کی طرف کئے رکھا۔تینوں مصرعے ہم وزن لکھنے والوں کو میلی نظر سے بھی نہیں دیکھا۔لیکن جیسے ہی حیدر قریشی نے ''اوراق'' کے جولائی اگست ۱۹۹۹ء کے شمارے میں ان کے مضمون کا پوسٹ مارٹم کر کے اصل حقائق کو آشکار کیا، موصوف نے ''اوراق'' کے صفحات پر پھر اس بحث کو آگے بڑھانے کی جرات نہیں کی۔ بہر حال سہ مصرعی اور ڈیڑھ مصرعی تنازعہ میں مذکورہ بالا تینوں مضامین کی رُو سے حیدر قریشی کے موقف کا خلاصہ یہ ہے کہ ماہیا ایک لوک گیت تھا۔اسے پنجاب میں لکھنے کا کوئی رواج نہ تھا۔ یہ صرف گائی جانے والی لَے تھی۔ جب انگریزوں نے برصغیر میں آکر یہاں کے لوک گیتوں کو جمع کرنے کا کام شروع کیا تب ماہیے بھی احاطہء تحریر میں لائے گئے۔شروع میں پورا ماہیا ایک ہی لائن میں لکھ دیا جاتا تھا۔ پھر اسے ڈیڑھ مصرعہ میں بھی لکھا جانے گا۔اور تین مصرعوں کی صورت میں بھی لکھا جانے لگا۔اس لئے کسی خاص ہیئت کو ماہیے کی تحریری ہیئت قرار دے کر باقیوں کو رد کرنے کا اختیار کسی کے پاس نہیں ہے۔اس سلسلہ میں انہوں نے پنجابی ادبی بورڈ لاہور، اکادمی ادبیات پاکستان اور لوک ورثہ کے قومی ادارہ کی جانب سے شائع کی جانے والی ان کتابوں کا حوالہ بھی دیا ہے جو پنجابی ماہیے کے انتخاب ہیں اور ان سب میں پنجابی ماہیے کو ڈیڑھ مصرعی نہیں بلکہ سہ مصرعی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔حیدر قریشی نے ''اوراق'' کے شمارے جولائی، اگست ۱۹۹۹ء میں اپنے سہ مصرعی موقف کی تائید میں پنجابی اسکالرز میں سے تنویر بخاری، ڈاکٹر جمال ہوشیار پوری، علامہ غلام یعقوب انور، ڈاکٹر روشن لال آہوجہ، فارغ بخاری اور امین خیال جیسے ممتاز لوگوں کے حوالے دے کر اپنے موقف کو مزید تقویت دی ہے۔اس کے باوجود وہ تینوں ہیئتوں میں سے کسی کو از خود، رد کرنے کے بجائے یوں رقمطراز ہیں۔

''کسی ایک کو قبول کر کے باقیوں کو رد کرنے کا اختیار کسی کو بھی حاصل نہیں ہے۔سہ مصرعی ہیئت کے بارے میں یہ ضرور کہوں گا کہ اب ماہیے کی لَے سے اس کے اتار چڑھاؤ کی تین حالتوں کی نشاندہی کے بعد شواہد اس کے حق میں زیادہ ہو گئے ہیں۔گویا (۱) لَے کی تین حالتوں کی بنیاد پر، (۲) سہ مصرعی ہیئت میں زیادہ ہرا بھرا دِکھنے کی بنیاد پر، (۳) پنجابی میں سہ مصرعی ہیئت کے بیشتر نمونوں کی بنیاد

پر، اور (۴) اردو میں مقبولیت کی بنیاد پر ماہیے کی سہ مصرعی ہیئت ہی مروّج ہیئت بنتی ہے۔اس کے باوجود اگر کوئی ماہیا نگار اصل وزن کو ملحوظ رکھتے ہوئے ماہیے کو ڈیڑھ مصرعی ہیئت میں لکھے، چاہے ایک ہی لمبے مصرع کی ہیئت میں لکھے، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ ماہیا نے جس طرح اپنی لَے کے ذریعے اپنے وزن کا تعین خود کیا ہے ویسے ہی اس کی تحریری ہیئت بھی اس کی لَے کے ذریعے سے خود بخود رائج ہوتی جائے گی۔ جو ہیئت اسے مناسب نہیں لگے گی از خود قصۂ پارینہ بن جائے گی۔ڈیڑھ مصرعی ہیئت پر بے جا اصرار کرنے والوں کو بھی اس کا یقین ہونا چاہئے۔''

اس اقتباس کے آخری جملہ سے حیدر قریشی کا اپنے موقف پر اعتماد اور بے جا مخالفت کرنے والوں کی علمی بے بسی از خود ظاہر ہوئی جاتی ہے۔ چنانچہ بعد میں بقول حیدر قریشی ''پرویزی حیلوں'' سے کام لینے والے کسی مخالف کو اس مسئلہ کو علمی رنگ میں آگے بڑھانے کی توفیق نہیں ملی۔ پھر انہوں نے ایک اور رنگ میں مخالفت کا رستہ نکالا۔حیدر قریشی کے ماہیوں پر حملہ کر دیا گیا۔اس مرحلہ میں یورپ سے اردو کی ایسی شخصیات بھی شامل تھیں جن کے دامن میں ایسے مطبوعہ بے وزن شعری مجموعے آن ریکارڈ ہیں جو چھپائے جانے کے باوجود چھُپ نہیں سکے تھے۔اور متعدد جعلی شاعر اور ادیب بھی اس کھیل میں شریک تھے۔اس مہم اور اس کے جملہ مواد کو برادرم سعید شباب یک جا کر رہے ہیں اور کتابی صورت میں لانا چاہتے ہیں اس لئے میں اس سے قطع نظر کرتے ہوئے یہاں حیدر قریشی کے ماہیوں کا تھوڑا سا انتخاب پیش کر دیتا ہوں۔آفتاب آمد دلیلِ آفتاب۔

رائن سے چناب ملا
کوئی حقیقت تھی
یا خواب سے خواب ملا

یوں روشن جان ہوئی
دل میں کہیں جیسے
مغرب کی اذان ہوئی

کچھ دل کو ملوک کرو
ویسے چن ماہی
جو چاہے سلوک کرو

(دریائے رائن جرمنی کا مشہور دریا ہے۔)

اک روح تھی سیلانی
چھوڑ کے شہرِ دل
جو ہو گئی ملتانی

بچپن کے خزانے میں
کتنے زمانے تھے
اُس ایک زمانے میں

نہیں ہم نہیں روئے تھے
چاند کی کرنوں میں
کچھ موتی پروئے تھے

تصویر خیالوں کی
کجلا بھری آنکھیں
''تفسیر اجالوں کی''

اس درد خزانے کے
چل دو نفل ہی پڑھ
رب کے شکرانے کے

تُو کس کا سوالی تھا
دامنِ دل جس کا
خود اپنا ہی خالی تھا

پھولوں کو پرونے میں
سوئی تو چُبھنی تھی
اس ہار کے ہونے میں

منظر ترے گاؤں کے
گرم دو پہروں میں
ہنستی ہوئی چھاؤں کے

کچھ رشتے ٹوٹ گئے
برتن مٹی کے
ہاتھوں سے چُھوٹ گئے

تھے دیس میں پردیسی
آ کے ولایت میں
اب ہو گئے ہیں دیسی

رہ جاتی ہیں تعبیریں
خواب ہیں ہم شاید
اور اصل ہیں تصویریں

لفظوں کے مداری ہیں
عشق کے جذبے سے
جو شاعر عاری ہیں

مل مہکی فضاؤں سے
یار نکل باہر
اندر کے خلاؤں سے

مہکار ہے کلیوں کی
جیسے دعا کوئی
دھرتی پہ ہو ولیوں کی

سب صبحوں کا تاج ہوئی
رحمتِ عالمؐ کو
جس شب معراج ہوئی

ایسے ماہیوں کے تخلیق کار پر اعتراضات کی نوعیت کوئی بھی ہو، مجھے اس امر کا کامل یقین ہے کہ مخالفین نے جن حوالوں سے حیدر قریشی پر اعتراض کئے تھے، کل کو وہی حوالے نئے ماہیے لکھنے والوں کے لئے سندِ جواز قرار پائیں گے۔ حیدر قریشی اردو ماہیے کا ایک ایسا مستند نام ہے کہ کل کو ماہیا ادب کا مستقل حصہ بنے نہ بنے اس کے لئے حیدر قریشی کی خدمات ادب کا مستقل حصہ رہیں گی۔ نقصان والی ایک ہی بات ہے کہ ان کی ماہیے کے لئے خدمات اتنی نمایاں ہوئی ہیں کہ ان کی متعدد دوسری اصناف ادب میں بہت ہی اہم ادبی خدمات کسی حد تک پس منظر میں چلی گئی ہیں۔ حیدر قریشی نے جن دوسری اصناف ادب کو چھوا ہے ان میں بھی ان کی خدمات بہت اہم اور قابلِ قدر ہیں۔ ان پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔☆☆

☆مضمون ا ''اردو ماہیے کے بانی۔۔۔ہمت رائے شرما''۔۔مضمون ۲ ''اردو ماہیے کے بانی، ہمت رائے شرما۔فلم خاموشی اور تحقیق مزید (بحوالہ کتاب اردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما۔مطبوعہ دہلی، ۱۹۹۹ء)
☆☆مضمون ''مرزا صاحب کے جواب میں'' (مطبوعہ ''جدید ادب'' جرمنی۔اشاعت مئی ۲۰۰۰ء)

☆☆

''ماہیے کا مستقبل نہایت تابناک ہے اور اس میں حیدر قریشی کے ماہیے اور ان کا اس کے فروغ کے ضمن میں کردار یقیناً ہمیشہ باقی رہے گا'' (**ہارون الرشید** کے مضمون ''غزلیں، نظمیں، ماہیے ایک مطالعہ'' سے اقتباس۔بحوالہ **حیدر قریشی کی ادبی خدمات** مرتب: پروفیسر نذر خلیق ص ۱۷۳)

حیدر قریشی (جرمنی)

عمرِ لا حاصل کا حاصل

(مئی ۲۰۰۵ء میں حیدر قریشی کی گیارہ کتابوں کی کلیات کا عوامی ایڈیشن شائع ہوا ہے۔اس میں پیش لفظ کے طور پر شامل حیدر قریشی کی تحریر یہاں پیش کی جا رہی ہے۔حیدر قریشی کی کلیات کی پیش کش کا اندازہ لگانے کے لیے اتنا بتانا کافی ہے کہ ہمارے ہاں جو شاعری ۴۵۰ سے زائد صفحات پر چھپتی ہے وہ اس کے صرف ۴۶ صفحات میں سمیٹ لی گئی ہے۔اس سے ۲۸۴ صفحات کی شعری و نثری کلیات کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔**ارشد خالد**)

میرے پانچ شعری مجموعے اور چھ نثری مجموعے اس عوامی ایڈیشن میں شامل ہیں۔گیارہ کتابوں کی مجموعی ضخامت بارہ سو صفحات سے زائد بنتی ہے۔تاہم اس عوامی ایڈیشن میں وہ سارا میٹر ۲۸۴ صفحات میں سمیٹ لیا گیا ہے۔اس انداز کی کلیات کی اشاعت شاید پہلی بار کی جا رہی ہے۔ مجھے اس کا آئیڈیا ماہنامہ شاعر بمبئی سے ملا ہے۔ابھی تک میں اس رسالہ کو دوسرے اچھے ادبی رسالوں کی طرح دیکھتا تھا۔ نومبر ۲۰۰۴ء کے شاعر میں میرا گوشہ شائع ہوا تو مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ اس سائز اور انداز میں کم سے کم صفحات پر زیادہ سے زیادہ میٹر شامل کیا جا سکتا ہے۔اس احساس کے ساتھ ہی اپنی گیارہ تخلیقی کتابوں کو یکجا کرنے کا خیال آیا۔سو میں نے اس منصوبہ پر کام شروع کر دیا اور اب بارہ سو سے زائد صفحات کا میٹر ۲۸۴ صفحات کی اس کلیات میں پیش خدمت ہے۔ برادرم شاہد ماہلی کا شکر گزار ہوں کہ موجودہ کاروباری اور تجارتی دور میں انہوں نے اس بار بھی میرے ساتھ ویسے ہی اخلاص کا اظہار کیا ہے جیسے قبل ازیں میری کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں ان کی طرف سے ہوتا رہا ہے۔ان کی محبت اور خلوص کے نتیجہ میں ہی اس کلیات کے عوامی ایڈیشن کی اشاعت اتنی آسانی سے ہونے جا رہی ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس طرح مجھے اپنے پورے تخلیقی کام کے ساتھ اپنے قارئین تک پہنچنے میں آسانی ہو گی۔

چار شعری مجموعے ''سلگتے خواب''، ''عمر گریزاں''، ''محبت کے پھول'' اور ''دعائے دل'' کتابی صورت میں بھی چھپ چکے ہیں اور ان چاروں مجموعوں کی کلیات بھی ''غزلیں، نظمیں، ماہیے'' کے نام سے چھپ چکی ہے۔ پانچواں مجموعہ ''درد سمندر'' الگ سے شائع نہیں کیا، البتہ ''غزلیں، نظمیں، ماہیے'' کے پاکستان سے متوقع نئے ایڈیشن میں اسے بھی شامل کیا ہے۔ان پانچ مجموعوں کے بعد میں نے جو تھوڑی سی

شاعری کی ہے وہ بھی اس عوامی ایڈیشن کلیات میں شامل ہے۔کافی عرصہ پہلے ایک بار چند دوہڑے کہے
تھے،انہیں بھی ماہیوں کے بعد،شعری حصہ کے آخر میں شامل کر دیا ہے۔

میرے دو افسانوی مجموعے’’روشنی کی بشارت‘‘اور’’قصے کہانیاں‘‘،خاکوں کا مجموعہ’’میری محبتیں‘‘
اور سفر نامہ’’سوئے حجاز‘‘ یہ کتب تو پہلے سے چھپ چکی ہیں البتہ’’کھٹی میٹھی یادیں‘‘اور انشائیوں کا مجموعہ’’
فاصلے قربتیں‘‘ ابھی تک الگ سے شائع نہیں ہوئے،یہ دونوں نثری مجموعے پاکستان سے متوقع میری
نثری کلیات’’افسانے،خاکے،یادیں،انشائیے‘‘میں شامل کئے جا چکے ہیں اور اس عوامی کلیات میں بھی
شامل کئے جا رہے ہیں۔اس سب کے ساتھ ماریشس کی ایک کانفرنس کا رپورتاژ بھی یادوں والے حصہ
میں ہی شامل کر دیا ہے۔تمام تخلیقات کے آخر میں پروفیسر نذر خلیق کا انٹرنیٹ مکالمہ اس وجہ سے شامل کر لیا
ہے کہ یہ مکالمہ زیادہ تر انہیں تخلیقات کے حوالے سے ہوا ہے۔تخلیقی حوالے سے یہ گیارہ کتب اور کچھ اضافی
تحریریں میرا اب تک کا اثاثہ ہیں۔داغِ ندامت سمیت بہت سارے داغِ ملامت (اور تھوڑی سی نیکیاں)
میری لا حاصل زندگی کا حاصل ہیں،انہیں آپ میری تخلیقات میں بخوبی دیکھ سکیں گے۔میں نے ایک بار
اپنے آپ سے کہا تھا۔

خوشی کے لمحے لکھو،عمرِ اضطراب لکھو　　نکالو وقت کبھی عشق کا حساب لکھو

حساب کتاب تو مجھے کبھی نہیں آ سکا پھر بھی ان گیارہ کتابوں میں کچھ بے ترتیب سا حساب ضرور آ گیا ہے۔
اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والے ادب کے قارئین کے لیے اپنا یہ اثاثہ پیش کرتے ہوئے مجھے دلی مسرت
ہو رہی ہے۔مجھے یقین ہے کہ میرے قارئین میرے اس تخلیقی سفر میں کسی نہ کسی سطح پر اپنی شرکت محسوس
کریں گے۔

ان کتابوں کے علاوہ ماہیے کی تحقیق وتنقید پر مشتمل میری پانچ کتب کی کلیات الگ سے ترتیب دی
جا رہی ہے۔ان میں سے تین کتب پہلے سے مطبوعہ ہیں جبکہ دو کتب کا سارا میٹر تو رسائل اور کتب میں
چھپ چکا ہے لیکن الگ سے کتابی صورت میں ابھی شائع نہیں ہوا۔تحقیق اور تنقید کا وہ سارا کام الگ
منصوبہ کے تحت زیرِ ترتیب ہے۔حالاتِ حاضرہ پر میرے تاثرات کا مجموعہ’’منظر اور پس منظر‘‘ بھی الگ
سے چھپا ہوا موجود ہے۔باقی جو تھوڑا بہت بکھرا ہوا کام ہے،زندگی رہی اور توفیق ملی تو اسے بھی اپنی زندگی
میں ہی سمیٹ لوں گا ورنہ دوست احباب اور محققین کے لئے بھی کچھ کام رہنے دیا جائے تو کوئی حرج
نہیں۔

سرِ دست میں اپنا اب تک کا سارا تخلیقی نوعیت کا کام اس عوامی ایڈیشن کی صورت میں پیش کر رہا
ہوں،اپنے قارئین کے ردِ عمل کا منتظر رہوں گا! ☆☆

ارشد خالد (راولپنڈی)

حیدر قریشی۔۔شخص و عکس

(ان کوائف کی تیاری میں سعید شباب اور نذیر فتح پوری کے ترتیب دیئے ہوئے کوائف سے اور
ماہنامہ کائنات (اردو دوست ڈاٹ کام) کے شمارہ مئی ۲۰۰۴ء سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔)

نام: قریشی غلام حیدر ارشد
قلمی نام: حیدر قریشی
ولدیت: قریشی غلام سرور
پیدائش: سرکاری کاغذات میں یکم ستمبر ۱۹۵۳ء
درست خاندانی روایت: ۱۳/جنوری ۱۹۵۲ء
مقامِ پیدائش: چناب نگر (سابق ربوہ)
آبائی علاقہ: رحیم یار خاں،خان پور (سابق ریاست بھاولپور)
تعلیم: ایم اے (اردو)
ادبی سفر کا آغاز: ۱۹۷۱ء
اصنافِ ادب: شاعری میں۔غزل،نظم،ماہیا
نثر میں: افسانہ،خاکہ،انشائیہ،سفر نامہ،یادنگاری،تحقیق وتنقید

جملہ کتب کی تفصیل: شاعری:

سلگتے خواب (غزلیں)،ناشر: تجدید اشاعت گھر۔لاہور،اسلام آباد۔مطبوعہ ۱۹۹۱ء
عمرِ گریزاں (غزلیں،نظمیں اور ماہیے)،ناشر: تجدید اشاعت گھر لاہور،اسلام آباد۔مطبوعہ ۱۹۹۶ء
محبت کے پھول (ماہیے)،ناشر: نایاب پبلی کیشنز۔خانپور۔مطبوعہ ۱۹۹۶ء
دعائے دل (غزلیں،نظمیں) ناشر: نصرت پبلشرز لاہور۔مطبوعہ ۱۹۹۷ء
چاروں مجموعوں کا مجموعہ **غزلیں،نظمیں،ماہیے** ناشر: سرور ادبی اکادمی۔جرمنی۔مطبوعہ ۱۹۹۸ء
دردِ سمندر (غزلیں،نظمیں اور ماہیے) یہ مجموعہ کلیات’عمر لا حاصل کا حاصل‘میں شامل کیا گیا ہے۔

تخلیقی نثر:

روشنی کی بشارت(افسانے)ناشر:تجدید اشاعت گھر،اسلام آباد،لاہور۔مطبوعہ۱۹۹۲ء

قصے کہانیاں(افسانے)یہ مجموعہ الگ سے نہیں چھپا۔**افسانے** میں شامل ہے۔

افسانے (روشنی کی بشارت اور قصے کہانیاں ایک جلد میں)'ناشر:معیار پبلی کیشنز دہلی۔مطبوعہ۱۹۹۹ء

ایٹمی جنگ(تین افسانے اردو اور ہندی میں)ناشر:معیار پبلی کیشنز دہلی۔مطبوعہ۱۹۹۹ء

میں انتظار کرتا ہوں(افسانوں کا ہندی ترجمہ)ناشر:ساہتیہ بھارتی،دہلی۔مطبوعہ ۱۹۹۶ء

میری محبتیں(خاکے)'ناشر:نایاب پبلی کیشنز۔خانپور۔مطبوعہ۱۹۹۶ء

میری محبتیں(خاکے)،ناشر:معیار پبلی کیشنز،دہلی۔مطبوعہ ۱۹۹۸ء

کھٹی میٹھی یادیں(یادنگاری)یہ الگ سے شائع نہیں کی،عمرِ لاحاصل کا حاصل میں شامل ہے

سُوئے حجاز(سفرنامہ۔عمرہ کا احوال)'ناشر:معیار پبلی کیشنز،دہلی۔مطبوعہ ۲۰۰۰ء

سُوئے حجاز(سفرنامہ،سفرِ حج کے اضافہ کے ساتھ)،ناشر:سرور ادبی اکادمی جرمنی۔مطبوعہ۲۰۰۴ء

فاصلے،قربتیں(انشائیے)یہ الگ سے شائع نہیں کی،'عمرِ لاحاصل کا حاصل'میں شامل ہے

عمرِ لاحاصل کا حاصل مذکورہ بالا پانچ شعری مجموعوں اور چھ نثری مجموعوں کی عوامی کلیات

ناشر:معیار پبلی کیشنز۔دہلی۔مطبوعہ۲۰۰۵ء

منظر اور پس منظر(9/11 کے بعد حالاتِ حاضرہ پر لکھے گئے فکر انگیز کالموں کا مجموعہ)

ناشر:سرور ادبی اکادمی جرمنی اور www.urdustan.com مطبوعہ۲۰۰۴ء

تحقیق و تنقید:

ڈاکٹر وزیر آغا عہد ساز شخصیت(مضامین)ناشر:نایاب پبلی کیشنز۔خانپور مطبوعہ۱۹۹۵

اردو میں ماہیا نگاری(تحقیق وتنقید)ناشر:فرہاد پبلی کیشنز۔اسلام آباد۔مطبوعہ۱۹۹۷ء

اردو ماہیے کی تحریک(مضامین)ناشر:فرہاد پبلی کیشنز۔راولپنڈی۔مطبوعہ۱۹۹۹ء

اردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما(مضامین)ناشر:معیار پبلیکیشنز دہلی۔۱۹۹۹ء

اردو ماہیا(ماہیے کے مجموعوں کے پیش لفظ۔زیرِ اشاعت)

ماہیے کے مباحث(مضامین۔زیرِ اشاعت)

اردو ماہیا تحقیق و تنقید(ماہیے کی تحقیق وتنقید کی پانچ کتابیں ایک جلد میں زیرِ ترتیب ہیں)

ادارت: ادبی رسالہ''**جدید ادب**''خانپور کی ادارت نو سال تک کی۔یہی جریدہ اب جرمنی سے جاری کیا ہوا ہے۔یہ رسالہ کتابی صورت کے ساتھ انٹرنیٹ پر اس سائٹ پر موجود ہوتا ہے۔

www.jadeedadab.com

ویب سائٹ:خورشید اقبال،نذر خلیق اور سعید شباب کی ترتیب دی ہوئی ایک ویب سائٹ قائم ہے۔ www.haiderqureshi.com

اس ویب سائٹ پر حیدر قریشی کی بیشتر کتب موجود ہیں،مزید میٹر بھی اپ لوڈ کیا جا رہا ہے۔ابھی تک آج کے ادباء میں سے کسی بھی اردو ادیب کی یہ سب سے بڑی اور معیاری ویب سائٹ ہے۔

اس کے علاوہ اس ویب سائٹ پر حیدر قریشی کا حالاتِ حاضرہ پر فکر انگیز اور مستقل نوعیت کے کالموں کا مجموعہ **منظر** اور **پس منظر** موجود ہے۔ www.urdustan.net

ادبی اعتراف

حیدر قریشی کے بارے میں لکھی گئی اور مرتب کی گئی کتابیں

۱۔**حیدر قریشی فکر و فن**

مصنف: **محمد وسیم انجم** (مطبوعہ ۱۹۹۹ء)

ناشر:انجم پبلشرز،کمال آباد نمبر۳،راولپنڈی۔پاکستان

۲۔**حیدر قریشی فن اور شخصیت**

مرتبین :**نذیر فتح پوری اور سنجئے گوڑ بولے**(مطبوعہ۲۰۰۲ء)

ناشر:اسباق پبلی کیشنز۔پُونہ،انڈیا

۳۔**حیدر قریشی کی ادبی خدمات**

مرتب:**پروفیسر نذر خلیق** (مطبوعہ۲۰۰۳ء)

ناشر:میاں محمد بخش پبلشرز۔خانپور۔پاکستان

۴۔**حیدر قریشی شخصیت اور فن**

منزہ یاسمین کا تحقیقی مقالہ

اسلامیہ یونیورسٹی بھاولپور سے ایم اے اردو کا تحقیقی مقالہ

۵۔**حیدر قریشی سے لیے گئے انٹرویوز**

مرتب :**سعید شباب**(مطبوعہ۲۰۰۴ء)

ناشر:نظامیہ آرٹ اکیڈمی۔ایمسٹرڈیم۔ہالینڈ

۶۔ادبی کتابی سلسلہ **عکاس** حیدرقریشی نمبر

مرتب: ارشد خالد

ناشر: عکاس پبلی کیشنز،اسلام آباد(کتاب نمبر۴۔مطبوعہ اکتوبر۲۰۰۵)

حیدرقریشی پر ترتیب دیئے گئے گوشے اور مطالعۂ خصوصی

۱۔گوشۂ حیدرقریشی مطبوعہ ماہنامہ ''**اسباق**'' پونہ شمارہ:فروری تا اپریل۱۹۹۳ء ایڈیٹر:نذیر فتح پوری

۲۔اشاعتِ خصوصی ''دنیائے ادب کا درخشاں ستارہ/حیدرقریشی''

ہفت روزہ **ہوٹل ٹائمز** اسلام آباد ۲۲مئی تا ۲۸مئی ۱۹۹۸ء مرتبین:اختر رضا کیکوٹی و محمد وسیم انجم

۳۔گوشۂ حیدرقریشی مطبوعہ سہ ماہی ''**ادبِ عالیہ**'' وہاڑی۔شمارہ مارچ ۲۰۰۲ء

ایڈیٹرز:ریاض ہانس و ریاض ملک

۴۔خصوصی مطالعہ ''**مہرِامروز**'' مطبوعہ ماہنامہ **کائنات** شمارہ مئی ۲۰۰۴ء(اردو دوست ڈاٹ کام)

ایڈیٹر:خورشید اقبال

۵۔گوشۂ حیدرقریشی مطبوعہ ماہنامہ **شاعر** بمبئی شمارہ نومبر۲۰۰۴ء ایڈیٹر:افتخار امام صدیقی

پاکستان اور جرمنی سے باہر کے اسفار

ہندوستان۔سعودی عرب۔انگلینڈ۔ہالینڈ۔فرانس۔ماریشس۔آسٹریا۔بلجیم۔

حیدر قریشی کا ڈاک کا پتہ:

Haider Qureshi

Rossertstr.6, Okriftel,

65795 Hattersheim, Germany.

ٹیلی فون نمبر: 0049-6190-930078

ای میل: hqg786@arcor.de

☆☆

''مجھے پہلے کی طرح آپ کے کام کی صلاحیت کے معجزے پر حیرت بھی ہے اور صد رشک بھی۔سمجھ میں نہیں آتا ہے آپ 24 گھنٹوں کو 48 گھنٹوں یا اس سے بھی زیادہ کس طرح بنا لیتے ہیں؟اگلی ملاقات ہوگی(انشاءاللہ)تو آپ سے یہ منتر سیکھنے کی کوشش کروں گی'' **ڈاکٹر لڈمیلا** (ماسکو) **بنام حیدر قریشی** مطبوعہ ماہنامہ **شاعر** بمبئی۔شمارہ نومبر۲۰۰۴ء۔ص۲۰)

نذیر فتح پوری (پونہ)

ایک تاثر،ایک احساس

ایک ادھوری تحریر حیدرقریشی کے نام

ادب کے میدان میں،زندگی کے میدان میں حیدرقریشی ایک فاتح کے روپ میں نظر آتے ہیں۔آپ انہیں دور سے دیکھیں یا قریب سے،غزلوں میں دیکھیں یا افسانوں میں،نظموں میں دیکھیں یا ماہیوں،خاکوں میں دیکھیں یا خطوط میں،تبصروں میں دیکھیں یا مضامین میں،وہ ہر جگہ فتح کا علم اٹھائے ،زیرِلب مسکراتے ،ایک شانِ بے نیازی سے رواں دواں نظر آتے ہیں۔تکان،پژمردگی اور تساہل کا احساس تک ان کو چھو کر نہیں گزرتا۔وہ جب بھی لکھتے ہیں تخلیقی سچ لکھتے ہیں اور تخلیقی سچائی کے بیان میں نمایاں اور قابلِ ذکر مرحلوں کو سر کرتے چلے جاتے ہیں۔ہوا میں لفظ اچھال کر وہ اپنا اور اپنے قاری کا وقت ضائع نہیں کرتے۔حرف کی حرمت کا انہیں شدید احساس ہے۔لفظ کی توقیر کو وہ خوب سمجھتے ہیں۔روشنی اور روشنائی دونوں کا زیاں کرنے سے گریز کرتے ہیں۔حیدرقریشی آدھے لفظوں کی روشنائی سے لکھنے کے قائل نہیں،پوری تاب و توانائی کے ساتھ،پورے تخلیقی سچ اور بھرپور صداقت کے ساتھ وہ پورے لفظوں میں جرأت کے ساتھ اپنا ادبی اظہار کرتے ہیں۔

ادب میں اختلاف رائے کی بڑی گنجائش ہے۔اردو ماہیے کے درست وزن کو رائج کرنے کے سلسلے میں وہ انڈو پاک دونوں جگہ شدید مخالفت کا شکار ہوئے۔جرمنی میں جہاں وہ مقیم ہیں ان کے خلاف انتہائی پست سطح کی محاذ آرائی کی گئی۔ناطقہ بند کرنے والوں نے بے پناہ زور آزمائی کی،لیکن وہ حیدرقریشی کی شخصیت کو،ان کی سوچ کو اور ان کے افکار کو قید نہیں کر سکے۔آج اکثر مخالفین یا گھسی ہوئی مخالفت لکیر پیٹ رہے ہیں یا سینہ کوبی میں مبتلا ہیں اور کچھ مخالفین شرمندہ ہو کر چپ ہو گئے ہیں۔حیدرقریشی ماہیے کے معرکے میں فتح یاب ہو چکے ہیں۔ماہیا نگاروں کی بھاری اکثریت ان کے ساتھ ہے۔کثرت میں وحدت کا منظر مرتب ہو چکا ہے۔ماہیے کے فروغ کے لیے ایک تخلیقیت پرور ماحول اپنی تاب و توانائی کے ساتھ

پرورش پا رہا ہے۔اپنی کامیابیوں پر حیدر قریشی خوش ضرور ہیں لیکن وہ خوشیوں کا بے جا اظہار نہیں کرتے۔کبر ونخوت کا اظہار ان کی کسی ادا سے بھی نہیں ہوتا۔وہ اپنے حاسدوں کو ایسی خشک لکڑیاں سمجھتے ہیں جو ان کے اندر تخلیق پرور آگ کو ہمیشہ زندہ اور پُر نور رکھتی ہیں۔

یہ سچ ہے کہ حیدر قریشی سے آج تک براہِ راست ملاقات کا موقع مجھے نہیں ملا ہے۔پچھلے دس بارہ برسوں میں اپنے خطوط کے ذریعہ،اپنی کتابوں کے ذریعہ،اپنے مضامین کے ذریعہ،ان کی شخصیت جس طرح مجھ پر روشن ہوئی ہے اسی روشنی کو رہنما بنا کر یہ تاثر قلمبند کر رہا ہوں۔حیدر قریشی منتشر خوابوں ،ڈوبتے منظروں اور گم ہوتی ہوئی منزلوں کو پکڑنے کا ہنر جانتے ہیں۔وہ جانتے ہیں کہ تتلیوں کا تعاقب کرنے والوں کو ان کا بچپنا واپس نہیں ملتا۔وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ جھوٹ کے چہرے پر چاہے جتنا ملمع چڑھایا جائے سچ کے سامنے اس کی رونق ماند پڑ ہی جاتی ہے۔قلعی بہر حال قلعی ہوتی اور کھلنا اس کا مقدر ہے۔جب قلعی کھل جاتی ہے تو اصلی اور نقلی کی پہچان آسانی سے ہو جاتی ہے۔

گھنی نیند سوئی ہوئی خموشی کو چٹکی بھر کر اٹھانا،سناٹے کو گونج عطا کرنا،بنجر زمینوں میں ہل چلانا،ویرانوں میں پھول کھلانا،اُس طرف جانا جس طرف کوئی نہیں جاتا،اور اُس طرف نہیں جانا جس طرف سب جاتے ہیں۔منزلوں کا سراغ نکالنا،راستوں کو ہموار کرنا،ہوا کو پکڑنا،سمندر کو تسخیر کرنا،نمیدہ ریت پر زندگی کی اَن کہی اور اَن لکھی کہانیوں کو نقش کرنا۔صحرا کو گل و گلزار بنانا،در و دیوار پر سبزہ اگانا،آنکھوں کو اَن دیکھے منظر دکھانا،ذہنوں کو اَن سوچی سوچ دینا،بے رنگ خاکوں میں رنگ بھرنا،بے چہرگی کو چہرا عطا کرنا،جذبات کا احترام کرنا،رشتوں کا اکرام کرنا،دوسروں کو زخم نہ لگانا،پرائے زخموں پر مرہم رکھنا،شعر کہتے وقت خود تڑپنا،شعر کہہ کر قارئین کو اطمینان و سکون عطا کرنا،دل کی خانقاہ میں عقیدتوں کی مشعل روشن کرنا،اندھیرے کو مٹاتے ہوئے روشنی کی بشارت دینا۔روایتوں کا احترام کرنا،نئی ہواؤں کے لیے ذہن کھلا رکھنا،درد کو ماہیا بنانا،احساس کو شعر بنانا،نالوں کو نغمگی عطا کرنا،تکلم میں تبسم پیدا کرنا،تبسم میں تکلم پیدا کرنا،مخطوطوں کی حفاظت کرنا،عہد ناموں پر دستخط کرنا،یہ اور ایسی دوسری بے شمار خوبیوں سے ان کی زندگی کی کتاب بھری پڑی ہے۔قاری جس ورق سے چاہے اس کتاب کا مطالعہ کر سکتا ہے۔کہیں جھول،ابہام یا ژولیدگی محسوس نہیں ہوگی۔سارا،سب کچھ فر فر پڑھا جائے گا۔ادب کا بھرپور خزانہ،زندگی کا بھرپور احساس حیدر قریشی کی زندگی کی کتاب میں سطر سطر پر درج ملے گا۔

میں قلم کو روک رہا ہوں۔ابھی کاغذ بھی میرے سامنے پھیلا ہوا ہے،قلم میں روشنائی موجود ہے،ذہن میں اس تاثر کے لیے ابھی جملوں کا انبار لگا ہوا ہے۔۔۔تاثر ابھی باقی ہے۔۔۔

☆☆

عارف فرہاد کی

حیدر قریشی سے گفتگو

عارف فرہاد ۲۰۰۴ء میں جرمنی گئے تھے۔وہاں انہوں نے ۲۶ ستمبر کو حیدر قریشی سے انٹرویو کیا تھا۔یہ انٹرویو فورم انٹرنیشنل جرمنی میں چھپ چکا ہے لیکن ایک تو وہ رسالہ ادبی رسالہ نہیں بلکہ سوشل میگزین ہے دوسرے اس مطبوعہ انٹرویو میں کمپوزنگ کی بعض اغلاط رہ گئی تھیں جن سے گفتگو کا نفسِ مضمون متاثر ہوا تھا اس لیے اس انٹرویو کو نظر ثانی کے بعد اس نمبر میں شامل کیا جا رہا ہے(ارشد خالد)

حیدر قریشی کی ہمہ جہت شخصیت ادبی دنیا میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔اخبارات اور جرائد کے لئے اب تک اُن کے کئی انٹرویوز لئے جا چکے ہیں مگر اِن میں سے بیشتر آن لائن یا بذریعہ ڈاک منگوائے گئے۔گزشتہ دنوں مجھے یورپ کے دورے میں ان سے تفصیلی ملاقاتوں کا موقع ملا تو میں نے ’’فورم انٹرنیشنل‘‘ کے لئے ان کا خصوصی انٹرویو لیا۔ان کے ادبی کام کے تو ہم سب پہلے سے ہی معترف تھے مگر جرمنی میں ان سے بالمشافہ ملاقاتوں سے اس بات کا بھی احساس ہوا کہ حیدر قریشی نہ صرف اپنی تخلیقات کی طرح سچے،کھرے اور متوازن ہیں بلکہ ایک خوش مزاج،نفیس اور شائستہ آدمی ہیں۔

عارف فرہاد: برادرم حیدر قریشی صاحب،ہمیں کچھ اپنے ابتدائی حالات کے بارے میں بتائیے؟

حیدر قریشی : عارف فرہاد صاحب!میری زندگی کا آغاز رحیم یار خان سے ہوا تھا اور بچپن کا آدھا حصہ وہاں گذارا،اس کے بعد ہم لوگ خانپور شفٹ ہو گئے اور خانپور میں ہی زندگی کا باقی حصہ گذارا۔کہیں نہ کہیں چھوٹے چھوٹے پڑاؤ رہے مگر زیادہ تر خانپور،رحیم یار خان کو ہی شمار کرتا ہوں اور اس کے بعد سے اب تک جرمنی میں بیٹھے ہوئے ہیں۔

عارف فرہاد : یہ بتائیے کہ آپ قریشی غلام حیدر ارشد سے حیدر قریشی کیسے بنے؟

حیدر قریشی : یہ کچھ یوں ہوا کہ ہماری ایک عزیزہ تھیں،بزرگ خاتون۔انہوں نے بڑے پیار سے میرے نام کے ساتھ ارشد کا اضافہ کر دیا۔بچپن میں ہی،تو ان کے احترام میں ارشد کا تخلص تو رہنے دیا مگر جب لکھنے کا شوق ہوا تو مجھے لگا کہ یہ نام ادبی طور پر کچھ میچ نہیں کر رہا تو میں نے سوچا کہ مجھے کس طرح کا نام اختیار کرنا چاہئے تو پھر حیدر قریشی مجھے مناسب لگا اور میں نے حیدر قریشی نام اختیار کر لیا۔

عارف فرہاد: جرمنی آنے کا خیال کیسے آیا آپ کو؟

حیدر قریشی : آہ۔ یہ لمبی کہانی ہے اور اس کے لئے ابھی مزید چھ مہینے انتظار کریں۔ اس کے بعد میں جو کہوں گا سچ کہوں گا اور سچ کے سوا کچھ نہیں کہوں گا۔

عارف فرہاد: تو اب تک آپ نے جو انٹرویوز دیئے ہیں ان میں جرمنی آنے کا واقع سچ تھا یا جھوٹ تھا۔

حیدر قریشی : نہیں جھوٹ کہیں نہیں بولا ہے۔ یہ تو ہوسکتا ہے کہ کہیں کسی مجبوری یا مصلحت کے تحت خاموشی اختیار کر لی ہو لیکن جھوٹ کہیں نہیں بولا اور ابھی میں ان باتوں کو دہرانا نہیں چاہتا اور جھوٹ بھی نہیں بولنا چاہتا بلکہ بعد میں دیانتداری سے بتاؤں گا کہ کیا صورت حال تھی اور کیا Situation تھی۔

عارف فرہاد : یہاں آ کر بھی لکھنا لکھانا جاری رکھا، یہ بتائیے کہ یہاں آ کر آپ کے انداز فکر میں کوئی تبدیلی آئی اور اگر آئی تو اس کی وجہ کیا تھی۔

حیدر قریشی: دیکھیں جی وہ جو کہتے ہیں نا کہ سفر وسیلہء ظفر ہے تو ظاہر ہے کہ پاکستان جیسے معاشرے سے نکل کر یورپ کے معاشرے میں آنا اور اس میں بھی پھر جرمنی جیسے ملک میں آنا تو ذہنی کشادگی کا ایک احساس ہوا ہے۔ بہت سی چیزیں ہیں جو وہاں کے ماحول میں بیٹھ کر کچھ اور طرح دکھائی دیتی تھیں۔ یہاں آ کر ان میں تھوڑا فرق محسوس ہوا ہے۔ Vision میں بھی کچھ نہ کچھ تبدیلی آئی ہے لیکن یہ نہیں کہ میں اپنی جڑوں سے کٹ گیا ہوں۔ میری بنیاد وہی ہے۔ اس بنیاد پر رہتے ہوئے میں سمجھتا ہوں کہ میری سوچ میں کچھ وسعت آئی ہے، ذہنی کشادگی ہوئی ہے اور دونوں کا کمبی نیشن آپ میرے ہاں دیکھ سکتے ہیں۔

عارف فرہاد :اس سے پہلے بہت سے احباب آپ سے پوچھ چکے ہیں، آپ نے پہلے شاعری کی یا نثر لکھی، میں یہ پوچھنا چاہوں گا کہ جرمنی آ کر آپ نے پہلی غزل، پہلا افسانہ یا پہلا تحقیقی یا تنقیدی کام جو کیا اس کی تفصیل کیا ہے۔

حیدر قریشی: یہ حساب کتاب والی بات تو بالکل اب ذہن میں نہیں ہے لیکن یادداشت کے سہارے جو کچھ فوری طور پر ذہن میں آ رہا ہے پھر وہی بات آ جاتی ہے کہ یادوں کے ساتھ یا اپنی روایت کے ساتھ جڑنے کی چیز جو تھی وہ بڑی شدت کے ساتھ یہاں آ کر ظاہر ہوئی مثلاً ماہیے پر میرا جو بنیادی کام ہے وہ یہاں آ کر شروع ہوا۔ اس کو صرف ماہیے والی بحث نہ سمجھیں۔ ماہیے کی بحث کو ایک طرف رکھ دیتے ہیں۔ اصل چیز یہ ہے کہ ماہیا میرے Locale سے Related چیز ہے یعنی ایک زاویئے سے اس مٹی سے جڑنے کا عمل بھی تھا جہاں میں نے زندگی بسر کی۔ گویا اپنے ماضی یا اپنی روایت کے ساتھ جڑے رہنے کی کیفیت یا خواہش یا جو بھی اس کو آپ کہہ لیں، تو یہ سب از خود آتا چلا گیا، شاعری میں بھی، دوسری

تحریروں میں بھی۔۔ پہلا افسانہ مجھے یاد ہے، میں نے ''مسکراہٹ کا عکس'' لکھا تھا۔ یہ وہ افسانہ ہے جس میں میری خاکہ نگاری اور افسانہ نگاری ایک دوسرے میں ضم ہوگئی ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار میرے والد صاحب ہیں۔ ''اوراق'' میں چھپا تھا یہ افسانہ اور آغا جی نے بہت پسند کیا تھا اسے۔ اس کے باقی کے کردار جو میرے تینوں بیٹے ہیں اور میں۔ یعنی یہ وہ افسانہ ہے جو یہاں آنے کے بعد مجھ سے لکھا گیا۔ اس میں بھی اپنی مقامیت کے ساتھ وابستہ رہنے کی ایک خواہش تھی۔

عارف فرہاد : احمد ندیم قاسمی اور آغا صاحب، دو ادبی ستون ہیں، کچھ لوگوں کا خیال ہے قاسمی صاحب کی پہچان ان کا افسانہ اور ان کی شاعری ہے۔ کچھ کا کہنا ہے کہ ان کی کالم نگاری ہے۔ اسی طرح آغا صاحب کے حوالے سے بھی کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ان کی پہچان تنقید ہے۔ کچھ کے خیال میں نظم ہے اور کچھ کے نزدیک ان کی انشائیہ نگاری۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ ان دونوں شخصیات کے کس کس کام کو ہم اہمیت دے سکتے ہیں اور ان کی شناخت ٹھہرا سکتے ہیں۔

حیدر قریشی: میرے نزدیک دونوں بزرگوں کے ٹوٹل کام کی بنیاد پر ہی ان کا مجموعی Impact بنے گا۔ ان کو خانوں میں تقسیم کر کے یعنی احمد ندیم قاسمی کی غزل کو ان کے افسانے سے لڑا کے یا آغا جی کی نظم کو ان کی تنقید سے لڑا کے تو وہ آغا جی Verses آغا جی اور قاسمی جی Verses قاسمی جی تو یہ بات نہیں بنے گی۔ ان کے ٹوٹل ورک سے ہی ان کا ٹوٹل Impact بنے گا۔ یہ ہوسکتا ہے کہ وہ اپنی کسی صنف یا تحریر میں اس قدر مضبوط ہوں کہ دوسری صنف نسبتاً کچھ کم لگے لیکن جو بڑے Artist ہوتے ہیں۔ ان کی کمزور تحریر کا بھی کم از کم کوئی Level ہوتا ہے۔ اس لئے وہ کم از کم Level جو ہے وہ بہت سوں کے بڑے لیول سے بھی زیادہ ہے۔ اس لئے میں نہیں سمجھتا کہ کسی ایک حوالے سے ان کی پہچان مقرر کی جائے۔ ہاں آغا جی کے حوالے سے میں یہ کہنا پسند کروں گا کہ ان کا اکیڈمک لیول اتنا ہائی ہے کہ ان کو تو ابھی تک پاکستان میں صحیح طرح سے سمجھا ہی نہیں گیا اور یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ ہمارے ہاں جو جرنلسٹک ٹائپ کا ادب ہے۔ یہاں میں جرنلزم کے خلاف نہیں بول رہا ہوں۔ جرنلزم کی اپنی ایک اہمیت ہے، افادیت ہے اور اس کا میں بڑا معترف ہوں بلکہ اس سے فیض یاب ہوتا رہتا ہوں لیکن وہ جو ادب میں جرنلسٹک Value کو جس طرح سے لایا گیا ہے اس طرح کے لوگوں نے بھی کچھ خرابی کی ہے۔ آغا جی کی تفہیم ہونے میں۔

عارف فرہاد : یہاں آ کر آپ نے ماہیے پر پہلی مرتبہ تحقیقی و تنقیدی کام کیا۔ نہ صرف خود لکھا بلکہ دوسروں کو بھی تحریک دیتے رہے۔ یوں ماہیا آپ کی شناخت بن چکا ہے۔ یہ بتائے کہ آپ نے خود ماہیے کب لکھنا شروع کیے؟

حیدر قریشی: اب مجھے صحیح طرح سے یاد نہیں، ظاہر ہے کہ اس کے لئے کوئی کتاب یا ریفرنس دیکھنا

پڑے گا۔ وہ کون سے دوست تھے جو آپ کے ہم نام بھی تھے ذرا سے۔ ہاں یاد آیا۔ممتاز عارف۔انہوں نے اوراق میں ایک خط لکھا تھا اور میرا خیال ہے یہ 1990ء کا کوئی شمارہ تھا جس میں انہوں نے ماہیے کے وزن کی طرف توجہ دلائی تھی۔اس کے فوراً بعد اوراق کا اگلا شمارہ آنے سے پہلے میں نے نہ صرف ماہیے لکھے بلکہ ان کے Favour میں ایک خط لکھا اور سب سے پہلے میرے ماہیے ادب لطیف لاہور میں چھپے تھے۔ادب لطیف کا غالباً 55 سالہ نمبر تھا یا گولڈن جوبلی نمبر،نومبر کا شمارہ تھا شاید۔اس کے بعد اوراق اور دیگر رسائل میں میرے ماہیے چھپے یعنی جس سال ممتاز عارف صاحب کا خط اوراق میں چھپا، اسی سال میں نے ماہیے لکھے۔

عارف فرہاد : آپ نے نظم بھی لکھی، افسانہ بھی، انشائیہ بھی لیکن اصلاً آپ نے جو تحقیقی وتنقیدی کام کیا وہ ماہیے پر ہے۔اس کی کیا وجہ ہے۔آپ نے غزل یا نظم پر کیوں نہیں کیا؟

حیدر قریشی: بات یہ ہے کہ میں ماہیے پر اتنا کام کرنا نہیں چاہ رہا تھا، وہ تو مجھے یار لوگوں نے دھکیلا اس طرف۔آپ نے لطیفہ سنا ہوگا نا کہ کسی ڈوبتے ہوئے کو بچانے کے لئے ایک صاحب چلے گئے تو جب بچا کر واپس لے آئے تو لوگوں نے انہیں بڑی داد دی تو انہوں نے جواب دیا کہ یہ داد واد بعد میں دیں پہلے یہ بتائیں کہ مجھے دھکا کس نے دیا تھا۔تو مجھے تو دھکا دیا گیا ہے۔ایک بڑی سادہ سی اور بڑی صاف سی بات تھی اور میرا خیال تھا سب دوست فوراً بات مان لیں گے کہ بھئی ماہیے کا یہ مسئلہ ہے، یہ پنجابی میں یوں ہے۔اس کو ذرا گنگناؤ تو یہ ماہیا ہے اور یہ سب کو سمجھ آ جائے گی۔اس سے کوئی جھگڑا کھڑا نہیں ہوگا مگر لوگوں نے اتنا جھگڑا کھڑا کر دیا اور اس پر اتنی بحث چلی کہ مجبوراً مجھے اس میں Involve ہونا پڑا اور اس طرح سے یہ کام ہوتا چلا گیا لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ کسی بھی شعبے میں کام کرنے کی اگر آپ کو توفیق ملی ہے تو یہ خدا کا فضل ہے اور وہ جس طرح سے بھی توفیق دے اس کا شکر ادا کرنا چاہئے۔کسی اور صنف میں مجھے کام کرنے کی توفیق مل جاتی تو وہ بھی اس کی مہربانی ہوتی۔اس میں (ماہیے میں) کام کرنے کا موقع مل گیا تو اسے میں اپنی کوئی کمزوری نہیں سمجھتا ہوں۔

عارف فرہاد : قریشی صاحب، آپ کی ادب میں جو Contribution ہے اس میں ایک حوالہ آپ کے ادبی جریدے جدید ادب کا بھی آ جاتا ہے۔یہ بتائیے کہ جدید ادب کا آغاز آپ نے کب کیا تھا۔

حیدر قریشی: ہاں یہ میں نے اکتوبر 1978ء میں اس کا پہلا شمارہ شائع کیا تھا جس میں ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب کی تصویر میں نے ٹائٹل پر دی تھی اور بڑا ہی غریبواں سے ہمارا یہ پرچہ تھا، 80 صفحات کا، ایک سال تک ہم کتابی سلسلے کی صورت میں 80 صفحات کا ہی پرچہ نکالتے رہے۔ پھر کچھ تھوڑی سی Development ہوئی۔خانپور کے دوستوں نے دیکھا کہ کچھ کام ہو رہا ہے تو انہوں نے ساتھ دینا شروع

کیا، پھر اسے ہم نے کچھ ضخیم بھی کیا۔500 صفحات تک بھی لے گئے۔گویا یہ خانپور کا دور جو تھا یہ آٹھ یا نو سالوں کا تھا۔

عارف فرہاد : اچھا یہ بتائیے کہ خانپور کا جو دور تھا اس زمانے میں وہاں کی ادبی فضا یا یہ کہہ لیجئے کہ ان دنوں آپ کا کن کن پاکستانی ادیب شاعروں سے رابطہ رہا۔

حیدر قریشی: خانپور کے جتنے بھی مقامی دوست تھے، سب سے ہی رابطہ رہا۔سارے شروع میں بڑے خوش ہوئے اور پھر اس کے بعد ساروں کو ایسا لگا کہ شاید ہماری وجہ سے یہ آگے بڑھ رہا ہے جو اکثر ہوتا ہے اور جب میں نے خانپور چھوڑ دیا اس کے بعد سارے ٹھنڈے ہو گئے۔اب اتنے سال گذر گئے ان میں سے کسی کو بھی کوئی بے چینی نہیں ہے۔اب مجھ کو ہے قرار تو سب کو قرار ہے

عارف فرہاد : جدید ادب کا سلسلہ پھر کب منقطع ہوا اور کب دوبارہ آپ نے اس کا اجراء کیا۔اس کی بھی ذرا سی تفصیل بتا دیجئے۔

حیدر قریشی: میرا خیال ہے 1987ء میں اس کا آخری پرچہ میں نے پاکستان سے شائع کیا تھا جو سات ادیبوں کا گوشہ تھا۔ایک جوگندر پال نمبر بھی چھاپا تھا ایک سات ادیب نمبر۔ یہ غالباً 87ء میں ہی آخری شمارہ تھا۔اس کے بعد پھر خانپور میں جو میرے حالات تھے وہ ایسے نہ رہے کہ میں جدید ادب جاری رکھ سکتا۔اصل میں اپنی بیوی کے زیور کے بل پر میں نے یہ رسالہ جاری رکھا ہوا تھا، جب وہ زیور بالکل ختم ہوگیا تو رسالہ بالکل بند ہوگیا۔ پھر اس دوران مجھے خانپور بھی چھوڑنا پڑا اور گوجرانوالہ سے لے کر ایبٹ آباد تک کئی مقامات سے گذرتا ہوا میں جرمنی آ گیا۔ جب جرمنی پہنچا ہوں تو یہاں آنے کے بعد خواہش تھی کہ پرچہ نکالا جائے۔شروع میں جب اس کے دو شمارے نکالے تو میں نے دیکھا کہ ان میں میری اپنی بطور ایڈیٹر Involvement نہیں ہے اور جو مقامی دوست جن کے سپرد وہ کام کیا تھا ان کا اپنا دخل اس میں زیادہ آ گیا ہے۔میرے نزدیک پرچے کا تشخص شروع سے جو رہا ہے کہ اس میں ایڈیٹر نظر آئے وہ ان دونوں پرچوں میں نہیں تھا۔لہذا پھر میں نے بند کر دیا۔اب انٹرنیٹ کی جو سہولت میسر آ گئی ہے اس سے رابطے سیدھے ہو گئے ہیں اور مجھے اس سے کچھ فیضیاب ہونے کا موقع بھی ملا ہے، تین شمارے اب تک نکال چکا ہوں۔انشاءاللہ چوتھا شمارہ آخری مرحلے میں ہے۔

عارف فرہاد : قریشی صاحب آپ نے افسانے بھی لکھے۔معاصرین افسانہ نگاروں پر آپ کی نظر بھی رہی۔آپ کے نزدیک اردو افسانے نے کوئی ترقی بھی کی اور اس میں کوئی پیشرفت بھی ہوئی اور کس حوالے سے ہوئی۔

حیدر قریشی: جدید افسانے کے حوالے سے اردو میں بہت ترقی ہوئی۔جدید افسانہ، حقیقتاً اردو کا

افسانہ،مغرب کےافسانوں سےبھی نسبتاً بہتر لکھا جارہا ہے۔

عارف فرہاد : آپ جانتے ہیں کہ ڈاکٹر وزیر آغا نے انشائیے کی روایت ڈالی بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ انہوں نے انشائیے کواردو ادب میں متعارف کروایا۔آپ نے خود بھی انشائیے لکھے۔یہ بتائیے کہ نئے لکھنے والوں کے لئے اگر وہ انشائیہ لکھنا چاہتا ہے تو اس کی تفہیم کیلئے آپ انشائیہ کی کیا تعریف بیان کریں گے کہ انشائیہ ہے کیا؟

حیدر قریشی :اس موضوع پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اب مزید کیا کہا جائے کیونکہ کوئی گائیڈ لائن دینے والی بات تو نہیں ہے۔Basically تو یہ ہے کہ ایک موضوع آپ کے ذہن میں آتا ہے تو اس کے مختلف پہلوؤں کو آپ اس زاویئے سے دیکھیں کہ اس کے مخصوص مدار سے آپ باہر نکلیں، پھر دیکھئے، آپ پر کیا کیا نئی چیزیں منکشف ہوتی ہیں۔ٹوپی ہے، کرسی یا گری پڑی چیزیں ہیں جن کو بڑے دانشور اہمیت ہی نہیں دیتے کہ اس پر کیا لکھنا ہے۔انشائیہ نگار کا کمال یہ ہے کہ اس طرح کی عام سی چیزوں کی غیر معمولی خوبیاں اس پر منکشف ہوتی ہیں اور پھر وہ ان کو بیان کرتا چلا جاتا ہے۔

عارف فرہاد : حیدر قریشی صاحب ہم چاہیں گے کہ کچھ آپ اپنی زبانی ماہیے پر اب تک ہونے والے کام کی تفصیل ہمارے قارئین کو بتائیے۔

حیدر قریشی : ماہیے پر کام تو بہت ہوا ہے اور زبانی انٹرویوز میں اتنا سارا حساب بیان کرنا تو بہت مشکل ہے مگر جو مین کام ہے اس میں کوئی 40 سے اوپر تو ماہیے کے مجموعے چھپ چکے ہیں اور تنقیدی حوالے سے تین کتابیں تو میری آچکی ہیں۔ایک آپ کی جو میں سمجھتا ہوں کہ ماہیے کی ساری بحث کا احاطہ کرتی ہے۔یعنی 1990ء سے لے کر اب تک پوری بحث کا خلاصہ اور احاطہ کرتی ہے۔''ماہیے کے خدوخال'' اس کے علاوہ کچھ اکا دکا کتابوں میں ماہیے کے لئے کچھ سیکشن آئے ہیں مثلاً عروض کی ایک کتاب چھپی ہے اب مجھے نام بھول رہا ہے، شاید ڈاکٹر عارف حسن ہیں یا کوئی اور دوست ہیں۔اس میں انہوں نے باقاعدہ ایک چیپٹر رکھا ہے، ماہیے کی عروض پر اس طرح کچھ اور بھی کتابیں آئی ہیں جن میں ماہیے پر قابل قدر چیزیں ہیں پھر ہندوستان سے ایک صاحب ہیں غالباً مشتاق اعظمی نام ہے ان کا۔ انہوں نے ماہیے پر PHD کی اور انہیں PHD کی ڈگری مل چکی ہے۔وہ مقالہ میں نے نہیں دیکھا اور میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کا معیار کس لیول کا ہے اور وہاں کے لوگ ماہیے کو جس حد تک سمجھ سکے ہیں اس حد تک ہی انہوں نے بیان کیا ہوگا لیکن اس کا ایک دوسرا پہلو یہ ہے کہ پاکستان سے اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور سے ابھی ایک بچی شگفتہ الطاف PHD کرنے جارہی ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ PHD کے حوالے سے ان کا مقالہ زیادہ اہمیت کا حامل ہوگا کیونکہ یہاں کے سارے لوگ جو ہیں وہ ماہیے سے Related ہیں اور

ماہیے کو سمجھنے والے لوگ زیادہ بہتر سمجھنے والے لوگ ہیں۔

عارف فرہاد : تخلیقی اعتبار سے آپ کے نزدیک اہم ماہیا نگار کون کون سے ہیں۔

حیدر قریشی : چونکہ یہ بالکل ابتدائی دور ہے، ماہیے کا تو میرے نزدیک ہر ماہیا نگار ہی میرے نزدیک اہم ہے۔یہاں تک کہ جس نے دو چار ماہیے بھی کہہ دیئے ہیں تو میں اسے بھی اہم سمجھتا ہوں لیکن پھر بھی جن کی وجہ سے میں سمجھتا ہوں کہ ماہیے کو آگے بڑھنے کا موقع مل رہا ہے تو ابتدائی دور میں ہمت رائے شرما ہیں۔قمر جلال آبادی ہوگئے، ساحر لدھیانوی ہوگئے اور قتیل شفائی اور اس موجودہ دور میں جو لکھنے والے ہیں ان میں نذیر فتح پوری ہیں، آپ خود عارف فرہاد ہیں، ترنم ریاض، شاہدہ ناز، ثریا شہاب ہیں گو ثریا نے بہت کم ماہیے کہے ہیں لیکن جتنے کہے ہیں بہت اچھے کہے ہیں۔سعید شباب ہیں، قمر ساحری مرحوم ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے، ان کا تو ماہیے کا دیوان ہے جو ایک ہسٹری ہے کہ ماہیے کا دیوان ابھی تک کسی نے نہیں لکھا۔حروف تہجی کے لحاظ سے انہوں نے پورا اس کا التزام رکھا ہے۔امین خیال بھی ہیں، بڑے اہم نام ہیں جو میں بھول رہا ہوں، تو یہ بات مشکل ہے، میرے لئے میں معذرت چاہوں گا کہ بڑے پیارے پیارے دوست میں بھول رہا ہوں۔ناصر نظامی صاحب ہیں ان کا اتنا ضخیم ماہیے کا مجموعہ ہے''یادوں کی بارش''اور بھی بہت سے ہیں۔

عارف فرہاد :یورپ کی ادبی فضا کیسی ہے اور کیا آپ کے نزدیک یہاں مقیم ادیبوں اور شاعروں میں سے کسی کی اہمیت بنتی ہے، اردو ادب میں۔

حیدر قریشی :اس سوال کو آپ دو حصوں میں بانٹیں، ایک تو یہ کہ یورپ میں جو لکھنے والے ہیں ان میں سارے ہی لکھنے والے وہ ہیں جو پاکستان سے ہی لکھتے ہوئے آئے ہیں اور اسی حوالے سے ان کی شناخت بنتی ہے جو Prominent ادیب ہیں ان کی شناخت اس لئے نہیں کہ وہ یہاں رہتے ہیں اور یورپ میں رہتے ہوئے وہ اچھے شاعر ہیں بلکہ یہ کہ وہ اردو کی مین سٹریم کے اچھے شاعر ہیں، کوٹہ سسٹم کے تحت اچھے شاعر نہیں ہیں۔ان میں آپ ساقی فارقی لے لیں۔اکبر حیدر آبادی لے لیں۔افسانے میں ہرچرن چاولہ، جیتندر بلو، افضل عباس ایک اچھے شاعر ہیں، ناروے میں۔اسی طرح اور بھی کچھ نام ہیں۔تو یہ وہ لوگ ہیں جو Genuine لکھنے والے ہیں۔اوریجنل لکھنے والے ہیں اور پاکستان سے ہی ان کی شناخت تھی، یہ تو ہوا سوال کا ایک حوالہ، دوسرا حوالہ یہ بنتا ہے کہ یہاں یورپ میں رہتے ہوئے یہاں کی نئی نسل میں سے کوئی بھی شاعر اور ادیب اردو کا نہیں بنا ہے جو کہ ایک المیہ ہے ہمارے لئے۔اور اس سے ہمیں یہ اندازہ کرنے میں بڑی آسانی ہو جاتی ہے کہ یہاں رہتے ہوئے اردو کے فروغ کی صورت نہیں ہے۔سوائے اس کے کہ ہم میلے ٹھیلے کی فضا بنالیں، رونق میلہ لگالیں، ثقافتی شو کرلیں، وہاں تک ٹھیک ہے لیکن ادبی

حوالے سے میں نہیں سمجھتا کہ یہاں کوئی ایسا قابل ذکر کام ہے۔

عارف فرہاد : ایک جگہ میں نے پڑھا کہ پروفیسر چشتی نے علامہ اقبال کی ایک کوشش دی تھی کہ ہمیں چاہئے کہ ہم ادب اور علم کو مسلمان کریں تو اس پس منظر میں آپ کیا جانتے ہیں کہ کیا ادب اور مذہب کا ایک دوسرے پر انحصار ہے اور کس حد تک ہے۔

حیدر قریشی : مسلمان کرنے والی بات کا تو مجھے علم نہیں ہے چونکہ میرے علم میں نہیں اس لئے میں اس حوالے سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یہ اپنے اپنے Concept کی بات ہے ایک Concept یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کو مسلمان کرنے کی بھی ضرورت ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر دیکھا جائے تو لیکن وہ ایک دوسرا Topic ہو جاتا ہے جو مذہب اور ادب کے تعلق کا سوال ہے تو بالکل تعلق ہے اور صرف مذہب اور ادب ہی نہیں، سائنس کو بھی اس میں شامل کرلیں۔ سائنس، مذہب اور ادب ان تینوں کی جستجو کا رخ خالق کائنات کی طرف ہے۔ رستے الگ الگ ہیں تینوں کے۔ مذہب، روحانیت کے حوالے سے خدا کی جستجو کرتا ہے۔ سائنس عقل کے حوالے سے اپنے ٹھوس حقائق کی بنیاد پر۔ لیکن سفر اُسی کی طرف کر رہی ہے۔ اُس کا انکار کرتے ہوئے جا اُسی کی طرف رہی ہے۔ اور ادب جمالیاتی حوالے سے اُسی کی طرف جا رہا ہے لہٰذا ان تینوں کی جستجو کا رخ ایک ہی طرف ہے۔ چونکہ رخ ایک ہے اس لئے تینوں ایک دوسرے سے تعلق تو رکھتے ہیں۔

عارف فرہاد : قریشی صاحب، آپ نے سوئے حجاز، سفر نامہ بھی لکھا، عمرے کی سعادت بھی حاصل کی۔ حجاز کی مقدس زمین سے ہو کر آئے، جیسا کہ ابھی ہم اس حوالے سے بات کر رہے تھے کہ سائنس، مذہب اور ادب کا آپس میں تعلق ہے اور ان کا رخ اپنے خالق کی طرف ہے تو آپ وہاں سے ہو کر آئے۔ کیا اس سعادت سے فیض یاب ہونے کے بعد آپ کے ادب یا آپ کے فکری زاویئے میں بھی کوئی تبدیلی آئی۔

حیدر قریشی : میرا خیال ہے کہ کچھ تبدیلی آئی ہے اور وہ میرے سفر نامہ میں خاص طور پر دیکھی جا سکتی ہے اور اس کے پیش لفظ میں میں نے لکھا بھی ہے کہ اس سفر کے دوران کہیں میرے خیالات میں مزید پختگی آئی ہے اور کہیں بہتر تبدیلی آئی ہے۔ لیکن یہ کہ ان کو Sort Out کرنا اور ان کی چھان پھٹک کر کے کچھ کہنا تو بڑا مشکل ہے کہ خاص طور پر کوئی بات Point Out کی جائے۔ یہ کام میرا خیال ہے نقاد کا ہونا چاہئے وہ دیکھے کہ بھئی اس سفر کے بعد اس کے ہاں کیا تبدیلی آئی ہے۔

عارف فرہاد : ہائیڈل برگ یونیورسٹی میں اقبال چیئر پر اب تک کچھ دوست پاکستان سے حکومت کی طرف سے آئے۔ آپ کا خیال ہے کہ ان لوگوں نے اس چیئر پر آ کے اردو کے لئے کوئی کام کیا یا محض

حاضریاں لگا کر جاتے رہے۔

حیدر قریشی : اس شعبے کی کارکردگی کا مجھے کچھ علم نہیں ہے۔ میرا رابطہ صرف ڈاکٹر کرسٹینا تک رہا۔ وہ بھی جس حد تک ہمارا کام ہوتا تھا کبھی کوئی وہاں فنکشن کیا تو اس کے لئے کچھ کر دیا یا جدید ادب کے ایک دور میں وہ ساتھ رہیں۔ بس اس حد تک ہمارا رابطہ رہا۔ اقبال چیئر کے تو کسی دوست سے ملاقات ہی نہیں ہوئی یہاں تک کہ اپنے پروفیسر فتح محمد ملک صاحب سے بھی ماریشس میں ملاقات ہوئی۔ یہاں جرمنی میں رہتے ہوئے ملاقات نہیں ہوئی۔

عارف فرہاد : اب ذرا نثری نظم کی طرف آتے ہیں کہ کیا آپ اسے شاعری سمجھتے ہیں۔

حیدر قریشی : اصل میں یہ بحث اتنی ہو چکی ہے کہ اب اس پر کیا کہا جائے۔

عارف فرہاد : آپ کا اپنا View کیا ہے؟

حیدر قریشی : میرا View یہی ہے کہ نثری نظم میں شعری مواد ہوتا ہے لیکن یہ شاعری نہیں ہوتی۔

عارف فرہاد : یعنی آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس کی Diction Poetic ہے

حیدر قریشی : نہیں میں اس کو مزید واضح کر دیتا ہوں، پہلے بھی اس کی ایک مثال دی تھی، اب میں مزید واضح کر دیتا ہوں۔ تاج محل میں جتنا میٹریل صرف ہوا ہے اس سارے کا اگر ڈھیر لگا دیا جائے تو وہ شعری مواد ہے۔ یہ سارا میٹریل ہے اس میں یہ چیز استعمال ہوئی اس میں وہ چیز استعمال ہوئی ہے، یہ سنگ مرمر ہے، یہ گارا ہے، یہ مٹی ہے، یہ ساری چیزیں جو ہیں ان کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ الگ الگ ڈھیریاں لگی ہوئی ہیں اور یہ شعری مواد ہے۔ جب اس مواد کو فنکارانہ طور پر استعمال کرتے ہوئے آپ نے تاج محل تعمیر کر دیا تو وہ ایک شاندار نظم بن گئی ہے تو نثری نظم شعری مواد ہے صرف مٹیریل کا ایک ڈھیر ہے۔ شاعری نہیں ہے۔

عارف فرہاد : یعنی ضرورت ہے کہ اسے شاعری میں تبدیل کیا جائے۔

حیدر قریشی : مطلب وہ ان کی مرضی ہے، وہ چاہیں تو ویسے ہی رہنے دیں۔۔۔

عارف فرہاد : بہت خوب! یہ بتائیے کہ اگر ہم ہندوستانی اور پاکستانی شعری ادب کا موازنہ کریں تو آپ کو کس کا پلڑا بھاری دکھائی دیتا ہے اور اس کی وجہ کیا ہے۔

حیدر قریشی : میرا خیال ہے پلڑا بھاری والی بات نہیں ہے کیونکہ پاکستان میں اس پر زیادہ کام ہوا ہے۔ تھوڑا سا پاکستان کا پلڑا بھاری لگتا ہے لیکن اٹھارہ، بیس کا فرق ہے، کوئی زیادہ فرق نہیں ہے، آپ اٹھارہ ہندوستان کو نمبر دے دیں اگر تو 20 پاکستان کو دے دیں۔

عارف فرہاد: یعنی برابر ہے

حیدر قریشی : جی ہاں

عارف فرہاد : آپ کی اپنی تصنیفات اور جو آپ کی مرتب کردہ کتب ہیں ان کی تفصیل بتائیے۔

حیدر قریشی : بھائی اب زبانی تو میں یہ نہیں بتا سکتا،شاعری کے چار مجموعے چھپ چکے ہیں اور چاروں کی کلیات چھپ چکی ہیں۔اب پانچویں مجموعے سمیت کلیات کا دوسرا ایڈیشن آرہا ہے۔اسی طرح افسانوں کے دو مجموعے چھپ چکے ہیں اور ابھی چند دن پہلے ڈاکٹر رشید امجد بات کررہے تھے تو کہنے لگے کہ بھئی تم تو اصل بندے ہی افسانے کے ہو۔تم افسانہ لکھو اور جو افسانہ لکھو مجھے بھیجو۔میں اس کا مطالعہ کر کے اس پر آرٹیکل لکھوں گا۔دراصل وہ مجھے ایک طرح سے تحریک دینا چاہتے تھے کہ میں افسانے کی طرف مزید سنجیدگی اختیار کروں۔

عارف فرہاد : کیونکہ وہ خود افسانہ لکھتے ہیں۔

حیدر قریشی : ہاں یہ بہت کم ہوتا ہے،عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ جو افسانہ نگار ہوتا ہے وہ آپ کی شاعری کی تعریف کرتا ہے اور جو شاعر ہوتا ہے وہ آپ کے افسانوں کی تعریف کرتا ہے۔وہ افسانہ نگار ہیں اور وہ میرے افسانوں کی ہی تعریف کررہے تھے۔

عارف فرہاد : قریشی صاحب ! آپ اس وقت Internet پر بیٹھے ہیں اور بہت سی اردو ویب سائیٹس پر کام بھی کررہے ہیں۔آپ کی تخلیقات بھی ہم Net پر دیکھتے رہتے ہیں۔"اردو رائٹرز فورم" بھی ہے۔ان سب چیزوں کے ہوتے ہوئے ہماری نئی نسل کتاب سے دور ہوگئی ہے،کیا اسے کتاب کی طرف لانے کیلئے کوئی حکمت استعمال کی جاسکتی ہے۔

حیدر قریشی : جو انٹرنیٹ پر اردو کی ویب سائیٹس کا مسئلہ ہے ان کی وجہ سے تو لوگ کتاب سے دور نہیں ہورہے،کچھ اور مسائل کی وجہ سے کتاب سے ضرور دور ہوئے ہیں۔انٹرنیٹ پر تو میں سمجھتا ہوں اردو کا آنا،اردو کتابوں کا آنا بڑا بابرکت اور بڑا مفید ہے اور اچھا ہے اس سے اردو کے مستقبل پر کوئی بُرا اثر نہیں پڑے گا لیکن اردو کتاب واقعی زد میں آئی ہوئی ہے۔وہ کس چیز کی زد میں آئی ہوئی ہے۔یہ جو نئے چینل آرہے ہیں اور دلچسپی کے نئے جو سامان آرہے ہیں اس کے نتیجے میں لوگ ادب سے بالکل الگ تھلگ ہوئے جارہے ہیں اور یہاں تک کہ آپ کو نئے چینلز پہ کہیں کوئی سنجیدہ ادبی پروگرام آدھے گھنٹے کا بھی دکھائی نہیں دے گا اور اگر کہیں کوئی غیر سنجیدہ سے پروگرام بھی ہوں گے تو ان میں بھی تمسخرانہ انداز زیادہ ہوگا،ادب کے تعلق سے۔

عارف فرہاد : قریشی صاحب ! ادب تو ایک طرف، میں نے تو یہ دیکھا ہے کہ بیرون ملک پاکستانیوں کی جو نئی نسل ہے وہ اردو زبان سے بھی بہت دور ہوکر رہ گئی ہے۔ان میں اردو کا رجحان کیسے پیدا

کیا جائے۔

حیدر قریشی : دیکھیں جی کچھ لوگ رضا کارانہ طور پر ذاتی حیثیت سے کچھ نہ کچھ جدوجہد کررہے ہیں،میں سمجھتا ہوں ان کی Struggle اپنی جگہ مخلصانہ ہے لیکن اس کا کچھ نہیں ہوگا۔یہ کلچرز کا ٹکراؤ یا ملاپ ہے اس میں ظاہر ہے اردو کہاں Survive کرسکتی ہے۔یہ تو بس ہم جیسے مہاجرین جو آتے رہیں گے،تازہ تازہ آئیں گے۔ان کی وجہ سے اردو کا رونق میلہ رہے گا جو نئی نسل آئے گی ان کے لئے اردو زیادہ سے زیادہ ایک بولنے والی زبان کی حد تک رہ جائے گی تو وہ بھی ایک نسل تک۔دو نسل تک،مطلب پڑھنے اور لکھنے والی اردو نہیں رہے گی۔

عارف فرہاد : آپ کو شعر و ادب میں آئے ہوئے تقریباً 33 سال ہو چکے ہیں،اگر آپ اپنی نگارشات پر نظر ڈالیں تو آپ کو کس صنف میں آپ کا اپنا کام مطمئن کرتا نظر آتا ہے۔

حیدر قریشی : کسی ایک کی میں تخصیص نہیں کرسکوں گا۔شاعری پہلی محبت ضروری ہے،میرا خیال ہے وہی بات جو شروع میں دو بزرگوں کے بارے میں کہی گئی تھی۔مجموعی طور پر مجھے اپنے پورے کام کے بارے میں ایک سطح پر اس حد تک اطمینان ہے کہ جو کچھ میرے دامن میں تھا اسے جس حد تک ممکن تھا ادبی سلیقے سے پیش کردیا ہے لیکن ایسا اطمینان نہیں ہے کہ بس میں نے جو کچھ پیش کرنا تھا پیش کردیا۔ کیونکہ ایسا اطمینان کبھی نہیں ہونا چاہئے اور خوب سے خوب تر کی تلاش رہنی چاہئے اور وہ نہ رہی تو پھر تو آپ نے لکھنا چھوڑ دیا۔

عارف فرہاد :یعنی آپ دوسرے الفاظ میں اسے ادب کا آل راؤنڈر کہہ سکتے ہیں۔

حیدر قریشی : نہیں مجھے یہ لفظ کچھ عجیب سا لگتا ہے۔اس کی بجائے اگر آپ زمیندارے والے حساب سے کہیں کہ ایک زمین ہے جو صرف ایک ہی فصل اگاتی ہے اور ایک زمین ہے جس میں سال میں دو تین فصلیں اگائی جاسکتی ہیں۔ایک سے زیادہ فصلیں اگائی جاسکتی ہیں۔

عارف فرہاد : یہ بھی تو ہے کہ ایک ہی زمین میں کئی فصلوں کے بیج بو دیئے جائیں اور بیک وقت وہ سارے ہی Grow کرجائیں۔

حیدر قریشی : یہ بھی ٹھیک ہے اور وہ زمین اتنی زرخیز ہوتی کہ وہ ساری فصلوں کی نشوونما کرتی ہے۔

عارف فرہاد : پاکستان یاد نہیں آتا،کیا واپس جانے کو جی نہیں چاہتا؟

حیدر قریشی : یہ جو میں بار بار شروع سے کہہ رہا ہوں کہ اپنے ماضی سے وابستگی،اپنی مقامیت سے وابستگی اور اپنی جڑوں سے وابستگی،تو یہ پاکستان واپس جانے کی ہی بات ہورہی ہے۔یعنی اپنے گھر کا یاد

آ نا،گلیوں کا یاد آ نا، Even وہ جو گھر کی گلی میں ہوائی چپل پہنے ہوتے اور کوئی پتھر پاؤں سے ٹکرا جا تا اور انگوٹھا زخمی ہو جا تا، مجھے تو اب وہ پتھر بھی یاد آ تا ہے۔اس پتھر پہ پیار آ تا ہے جس نے زخمی کر دیا تھا۔

عارف فرہاد : اصل میں یہ سوال آپ سے اس لئے کیا گیا ہے کہ پاکستان میں مقیم ہمارے اکثر دوست یہ کہتے ہیں کہ یورپ جا کر لوگ پاکستان کو بھول جاتے ہیں تو میں چاہتا تھا کہ ایک عام آ دمی کی رائے کے ساتھ ساتھ ایک ادیب کی رائے بھی جان لی جائے۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ جرمنی میں آ کر مجھے کوئی سنجیدہ ادیب آپ کے علاوہ نظر نہیں آیا بلکہ یوں کہیے کہ اگر شاعر ملا تو وہ وزن میں لکھنے والا نہیں ملا اس کی کیا وجہ ہے۔

حیدر قریشی :(ہنس کر) میں کیا کہہ سکتا ہوں بھئی، میں نے اس کی وجوہات پہلے بڑی وضاحت سے بیان کی تھیں اور بڑی گالیاں کھائی تھیں تو اگر آپ مجھے مزید گالیاں دلوانا چاہتے ہیں تو میں وجہ پھر کھول کر بتا دیتا ہوں۔

عارف فرہاد :جی ہم جاننا چاہیں گے۔

حیدر قریشی : بات یہ ہے کہ جو لوگ یہاں 20،25 سال سے آئے ہوئے ہیں، جوانی انہوں نے بھرپور گذار لی۔ مڈل ایج Crises میں آئے اب۔ یہاں Well Establish ہو گئے۔روٹی، روزی کی فکر نہ رہی۔ بچوں کے معاملات میں بھی ایک حد تک آزاد ہو گئے تو اب انہیں یہ خیال آیا کہ نام کمانا چاہئے کسی طرح۔ پرانے زمانے میں لوگ پُل بنواتے تھے۔کنواں بنواتے تھے۔ مدرسے بنواتے تھے۔نام کمانے کیلئے یا ثواب کمانے کے لئے۔اب ثواب کہیں پیچھے چلا گیا ہے اور نام کمانے کی یہ صورت رہ گئی ہے کہ شاعر بن جاؤ۔اس میں بھی دو طرح کے لوگ ہیں۔ ایک وہ سادہ سے لوگ ہیں جو جیسی بھی بے وزن شاعری کرتے ہیں ایسے ہی اپنے نام سے چھپوا لیتے ہیں اور اس پر ہی فخر کرتے رہتے ہیں۔ دوسرے وہ ہیں جو نسبتاً سیانے ہیں اور وہ پلے سے پیسہ خرچ کر کے کتابیں لکھواتے ہیں اور چھپواتے ہیں۔تو شاعر تو یہاں کوئی بھی نہیں ہے جو میرے ایریئے میں ہیں اور مجھ سے ملے ہوئے لوگوں میں سے جو صاحبِ کتاب بنے ہوئے ہیں،ان میں سے کوئی ایک بھی شاعر نہیں ہے۔ افسوس تو یہ ہے کہ یہ ساری کرپشن پھیلانے میں ہمارے ہندوستان اور پاکستان کے بعض اساتذہ Type شعراء جو ہیں وہ برابر کے مجرم ہیں۔

عارف فرہاد : یہ بات واقعی افسوسناک ہے، خدا کرے کہ یہ سلسلہ ختم ہو جائے اور دو نمبر لکھنے والوں کی وجہ سے یہ جو گرد و غبار بیچ میں پیدا ہو جاتا ہے نہ رہے تا کہ ہمارا منظر نامہ اور یجنل لکھنے والوں کی پہچان کرا سکے۔قریشی صاحب! آپ نے یورپ میں بھی زندگی بسر کی،مشرق میں بھی۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ آپ برائیاں بیان کریں، میں یہ چاہوں گا کہ آپ نے اپنی تہذیب،مشرقی تہذیب کی جو اچھائیاں محسوس

کیں اور یورپ کی جو روایات یا یہاں کی تہذیب میں جو باتیں اچھی لگیں وہ ذرا مختصر بتا دیجئے۔

حیدر قریشی :اگر آپ اجازت دیں تو جو پہلا سوال تھا اس میں تھوڑی سی بات رہ گئی تھی، پہلے میں اس کو بیان کر دوں۔ بات صرف جرمنی میں ہی مقیم شاعروں کی نہیں ہے مجھے لندن میں ملینیم کانفرنس میں شریک ہونے کا موقع ملا۔اب آپ بتائیں کہ ایک ملینیم کانفرنس ہے جو دو ملینیم کے ایک نکتہ اتصال پر ہو رہی ہے جس میں ڈاکٹر جمیل جالبی جیسے جید اردو سکالرز بھی تشریف لائے ہوئے ہیں اور وہاں پر مشاعرہ ہوتا ہے۔آپ یقین کریں میں نے تب لکھا تھا کہ ون تھرڈ شاعر بے وزن پڑھ رہے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ آدھے شاعر بے وزن اشعار پڑھ رہے تھے اور داد پا رہے تھے۔ میرا تو اس طرح کی کانفرنسوں سے بھی دل اچاٹ ہو گیا ہے کہ یہ سب کیا ہے۔اب آپ کے اگلے سوال کی طرف آتے ہیں تو خوبیاں اور خامیاں جناب یہ۔

عارف فرہاد : خامیاں نہیں......خوبیاں گنوا دیں آپ۔

حیدر قریشی :اچھا......خوبیاں،تو خوبیاں یہ کہ جو مغرب کے لوگ ہیں یہ اپنے ملک سے اپنی قوم سے انتہائی وفادار ہیں اور جن باتوں کو ہم اپنی خوبیاں گنواتے ہیں کہ جھوٹ نہیں بولنا، جھوٹی گواہی نہیں دینی اور بے ایمانی یا ہیرا پھیری نہیں کرنی، مجموعی طور پر یہاں کا معاشرہ ان ساری خوبیوں سے مالا مال ہے اور جو برائیاں ہماری نظر میں برائیاں ہیں، آپ برائیوں کی طرف نہیں آنا چاہ رہے لیکن میں اس کو پھر بھی بیان کروں گا کہ جو برائیاں ہماری نظر میں برائیاں ہیں (جنسی آزادی وغیرہ) وہ حقیقتاً ان کو برائی سمجھتے ہی نہیں ہیں اور وہ ان کے معاشرے کا حصہ ہے۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ جو چیزیں ہمارے ہاں صرف طبقہ اشرافیہ کیلئے مخصوص ہیں وہ یہاں انہوں نے عوام کیلئے بھی عام کر دی ہوئی ہیں کہ اگر اشرافیہ ان کو Enjoy کر سکتا ہے تو عام آدمی بھی Enjoy کر سکتا ہے۔بس زور زبردستی اس میں کہیں نہیں ہے اور یہی عمل ہمارے ہاں ذرا مختلف ہو جاتا ہے۔ باقی رہ گئی ہمارے مشرق کی خوبیاں تو مشرق کی خوبیاں بہت سی ہیں۔ خاص طور پر ہماری روایات میں جو سب سے بڑی خوبی ہے وہ رشتوں کا جڑا رہنا ہے۔اس نے ہم سب کو تسبیح کے دانوں کی طرح ایک لڑی میں پرو رکھا ہے۔تو یہ ایک ایسی خوبی ہے جس میں باقی چھوٹی چھوٹی برائیاں اور بہت سے عیب چھپ جاتے ہیں مگر یہاں پر یہ صورتحال نہیں ہے کیونکہ فیملی سسٹم ٹوٹا ہوا ہے۔

عارف فرہاد : عرب کا مشہور قولہ ہے السفر وسیلہ ظفر۔ پاکستان سے جرمنی کے سفر میں آپ کو بھی کوئی کامیابی ملی۔

حیدر قریشی : دیکھیں ایک کامیابی تو سیدھی سی ہے نا کہ جو اقتصادی لحاظ سے مسائل تھے وہ سارے ختم ہو گئے۔ پاکستان میں رہتے ہوئے 80 ہزار روپے کا مقروض تھا اور وہ میرے لئے اتنا بڑا قرضہ

تھا جتنا غالب کیلئے اپنے زمانے کا قرضہ تھا بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ تھا میرے لئے۔ پاکستان میں رہتے ہوئے میرے تصور میں بھی نہیں تھا کہ میں اسے کیسے اتار سکتا ہوں۔ وہ سارا قرضہ نہ صرف یہ کہ پہلے سال میں ہی اتر گیا بلکہ Relax بھی ہو گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اقتصادی لحاظ سے یہ جو آسودگی ہے یہ بہت ضروری ہوتی ہے اور اس کے بعد تخلیق کار کے کام شروع ہوتے ہیں۔

عارف فرہاد : قریشی صاحب! مجھے یورپ میں تو اردو کا کوئی مستقبل نظر نہیں آیا اور یہ ہماری بدقسمتی بھی ہے لیکن یہ بتائیے کہ کیا جیسے یہاں اردو ادب کا مستقبل نظر نہیں آ رہا کیا یہاں مقیم پاکستانیوں کا بھی یہی حال ہے یا اس کے برعکس ہے۔

حیدر قریشی : کن معنوں میں؟

عارف فرہاد : دیکھئے میرا سوال یہ ہے کہ مجھے اردو کا تو یہاں روشن مستقبل نظر نہیں آ رہا، جیسا کہ آپ نے بھی ابھی بتایا کہ ہماری نئی نسل اردو سے دور ہو گئی ہے یہاں تک کہ ہم خود یہاں آ کر اردو کی بجائے جرمن زبان بولنے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں تو کیا پاکستانیوں کا مستقبل بھی اسی طرح سیاہی کی طرف گامزن ہے یا ان کا مستقبل آپ کو روشن ہوتا نظر آ رہا ہے؟

حیدر قریشی : بڑا مشکل سوال ہے یہ مجھے سمجھ اس طرح سے نہیں آ رہی کہ میں اس کو کس طرح سے Explain کروں لیکن یہ ہے کہ جو پاکستانی یہاں آ گئے ہیں وہ Settle ہو گئے ہیں۔ انہیں تو ظاہر ہے اسی معاشرے میں ضم ہونا ہے اور کسی حد تک اپنی شناخت رکھتے ہوئے ہی ضم ہونا ہے کہ ہم پاکستانی ہیں۔ بنیاد ہماری یہی ہے لیکن اب ہم اس معاشرے کا حصہ بن گئے ہیں گو کہ اس معاشرے میں ضم ہوتے ہوئے ابھی ان کو تین یا چار نسلوں کا ٹائم لگے گا لیکن ہونا یہی ہے آخر کار کہ انہوں نے ان میں جذب ہو جانا ہے، اگر آپ کہیں کہ یہ اپنی پوری پاکستانیت کے ساتھ یہاں رہیں گے تو یہ موجودہ نسل تک ہی ممکن ہے اس سے اگلی نسل میں ممکن نہیں ہو گا۔

عارف فرہاد : آپ کا اب تک جو قیام ہے جرمنی میں اس دوران یہاں سے اردو کے اخبارات و جرائد کون کون سے نکلتے رہے؟

حیدر قریشی : ثریا شہاب اور آپ نے ایک نکالا تھا ماہنامہ ’’فورم انٹرنیشنل‘‘۔ ہمارے ارشاد ہاشمی کا اردو دنیا بھی نکلتا رہا ہے۔ اس نے بڑے ہنگامے برپا کئے تھے۔ پچھلے دو تین سالوں سے روزنامہ ’’اوصاف‘‘ نکل رہا ہے اور بھی دو تین پرچے نکلے تو ہیں لیکن بس so,so سے ہی تھے۔ ٹھیک ہے ایک رونق میلہ ہے کہ لوگوں نے بڑی ہمت کی اور اپنے ہونے کا ثبوت دینے کے لئے یہ محنت کی ہے تو جس نے جتنی بھی محنت کی ہے اس کے حساب سے ٹھیک ہے۔

عارف فرہاد : آپ اپنی کوئی پسندیدہ غزل اور ماہیے ہمارے قارئین کو سنانا پسند کریں گے۔

حیدر قریشی : جی ضرور جناب! ایک غزل ہے چھوٹی سی، اس کے اشعار پیش ہیں۔

وہ جو ابھی تک خاک میں رُلنے والے ہیں — سچے موتیوں میں اب تُلنے والے ہیں
اپنی ذات کے دروازے تک آ پہنچے — بھید ہمارے، ہم پر کھلنے والے ہیں
دودھ بدن ہے وہ تو مصری کوزہ ہم — سو اب اس کے عشق میں گھلنے والے ہیں
واقفیت ہے ان سے اپنی برسوں کی — دکھ تو ہمارے ملنے جلنے والے ہیں
آنکھیں اس کی بھی ہیں اب برسات بھری — حیدر میل دلوں کے دھلنے والے ہیں

عارف فرہاد : کچھ ماہیے بھی سنائیے۔

حیدر قریشی : جی ماہیے بھی سنا دیتا ہوں، یار یہ ویسے تو بڑا آکورڈ سا لگتا ہے لیکن میرا دل کرتا ہے کہ ماہیے کی بحث میں چونکہ ہم نے کہیں اس کے وزن کو Discuss نہیں کیا اور وزن کو Discuss کریں تو اس کی ’’لے‘‘ آ جاتی ہے۔ اس لئے ترنم والا شاعر نہ ہونے کے باوجود بھی میں یہ چاہوں گا کہ ماہیے تھوڑی سی لے کے ساتھ پڑھنا چاہوں گا۔

عارف فرہاد : جی ضرور

حیدر قریشی :

☆ تھے اپنی ہی لہروں میں
عمر گزاری جو
پنجاب کے شہروں میں

☆ یادوں کے خزینے میں
خانپور اپنا تو
آباد ہے سینے میں

☆ لفظوں کے مداری ہیں
عشق کے جذبے سے
جو شاعر عاری ہیں

☆ رائن سے چناب ملا
کوئی حقیقت تھی
یا خواب سے خواب ملا

عارف فرہاد : بہت بہت شکریہ۔

☆☆

www.haiderqureshi.com

ویب سائٹ پردرج تاثرات سے انتخاب

(حیدرقریشی کی ویب سائٹ کی گیسٹ بک میں منشا یاد،ڈاکٹر حمید سہروردی،ڈاکٹر سعادت سعید،ڈاکٹر لڈمیلا،احمد سہیل،سلطان جمیل نسیم،پروفیسر عبدالرب استاد،خالد حمید فاروقی،اور دیگراہم ادبی شخصیات کے تاثرات بھی درج ہیں۔ان سب کے تاثرات کو پروفیسر نذر خلیق نے اپنی کتاب ''حیدرقریشی کی ادبی خدمات'' میں شامل کرلیا تھا۔اس کے بعد جن افراد نے سائٹ کو وزٹ کرتے ہوئے اس کی گیسٹ بک میں اپنے تاثرات درج کیے،ان کا انتخاب ذیل میں درج کیا جارہاہے۔**ارشد خالد**)

پروفیسر رحمت یوسف زئی۔حیدرآباد(انڈیا)

It is a fantastic page. My hearty congradulations to Mr Hyder Quraishi. I have read his book on Mahia and have reffered it in my articles/research work by my students

....

منیر ارمان نسیمی۔بھدرک(انڈیا)

I got to visit your site via Sher-o-Sukhan. بہت ہی شاندار اور دیدہ زیب سائٹ ہے۔اللہ کرے آپ اسی طرح اردو کی آبیاری کرتے رہیں۔آمین

....

فہیم احمد فہیم۔لاہور

Your poetry is very beautiful and attractive "Succhay Shaer Kehtay Hein Aap janab". Specialy your Ghazals are so admiring, I am realy very much impressed,

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ!

....

ڈاکٹر سریندر بھوٹانی۔وارسا(پولینڈ)

It was a pleasant surprise to know the real meaning of Haider Qureshi's personality. He has done very well for Urdu Adab.Lekin" abhi sitaroN se aage jahaN aur bhi." Hope he will do a good service for Urdu literature in future also. His output is amazing.

....

ارواح عمر۔امریکہ

Such a wonderful website. You've done a tremendous job in order to complete this website. I can say that this website is successful because of your great efforts.

....

ڈاکٹر شہزاد وسیم۔راولپنڈی

This is a beautiful website with all its classical colours, Your poetry touches the hearts and provocates not only thinking but also forces others to write. I think let the time should decide!God Bless you

....

میشائیل گرابے (جرمنی)

Lieber Herr Qureshi,

ich bin von Ihrer Seite sehr beeindruckt. Sie hat eine optisch schöne und sehr professionelle Aufmachung. Leider kann ich davon natürlich nichts lesen. Ich möchte mich jedoch auch an dieser Stelle herzlich bedanken, dass wir Ihre Gedichte in unserer kleinen Hauszeitschrift abdrucken dürfen.

Viele Grüße

Michael Graber-Dünow

طارق مقبول (وینکوور۔کینیڈا)

جب زمانے میں سچا خلوص ناپید ہواور ادبی باتیں روح سے خالی معلوم ہوں،ایسے میں حیدرقریشی صاحب آپ قلمی جہاد کررہے ہیں۔خدا کرے یہ جوش وجذبہ اور زیادہ۔

....

اسلم بدر (جمشید پور)

''عمرِ گریزاں''اور''دعائے دل'' کی تقریباً تمام غزلیں پڑھ لی ہیں۔اکثر غزلیں متاثر کرتی ہیں۔جرمنی میں رہ کرشعروادب کے لیے اتنا کچھ کرجانا ہی حیرت کی بات ہے۔آپ کی غزلیں جدیدیت اور کلاسیکیت کے درمیان سے گزرتی ہوئی کافی خوشگوار نقش چھوڑتی ہیں،اوراس وقت تو اور بھی جب اشعار میں جمالیاتی رنگ جھلکنے لگتا ہے۔میں سمجھتا ہوں کہ جمالیات ہی آپ کی پہچان بھی ہے۔آپ کے ماہیے بھی کسی ویب پر دیکھے تھے۔ماہیے بھی آپ نے خوب لکھے ہیں۔

....

عاصمہ خان (امریکہ)

آپ کی ویب سائٹ میں تمام افسانے اور شاعری بہت بہترین اور خوبصورت ہے۔۔۔میں اس کی مستقل ریڈر رہوں۔

....

حسیب الرحمن ملک (مانٹریال۔کینیڈا)

This is a beautiful website with all its classical colours, Your poetry touches the hearts and provocates not only thinking but also forces others to write. I think let the time should decide!

صغیر (فرانس)

i just by chance find out your web site iread your mahiya regarding 5th july itis very nice you did a good job ireally apriciate you

....

زبیر احمد گجر (آسٹریا)

i have seen your web pag it is really wonder full,it is a great work for improv our national language urdu,i really like it.

....

سلمان (بھاولپور)

A good effert to promote Urdu on the web. I offer my services in this context.

....

ارشد حسین (حیدرآباد۔انڈیا)

سوئے حجاز سفرنامہ نظرنواز ہوا۔دل میں زیارتِ کعبہ کی زبردست خواہش پیدا ہوئی ہے۔اچھی سائٹ ہے اور نفیس کلام ہے۔

....

سید یوسف علی (کراچی)

I have no hesitation to admit you had a great job . I was much impressed to know about your work,it is why I watched your web site and read all the matter including your poetry and articles.Please accept my hearty congritulation.It was also my wish to introduce your valued work in Pakistan . SYED YOUSUF ALI

Senior Sub Editor/ Incharge Foriegn Desk,Daily "JURAAT" Karachi

....

کساندرا راؤزن (امریکہ) Cassandra Rouson

I think Haider Qureshi is a wonderful friend he is a man of his word and really admire him. It is a great honor for me to have met him. I offer many blessings to my friend and all that is related to him.

....

غیاث انجم (بکارو۔انڈیا)

آپ کی سائٹ دیکھی،خوشی ہوئی۔آپ کی تمام کتابوں کے نام اور کلام پڑھنے کا نیا انداز اچھا لگا۔

....

رضوانہ کوثر (مائنٹال،جرمنی)

Comments: ich find Ihre webseite herzberuabend. ich bin wirklich stolz auf Ihnen Papa. keep this elegent work and prosper in each field of life.

....

ندیم (ایبٹ آباد)

I was just browsing when i came across this familiar name who had been my teacher and I have learned a lot from this person.Its a very good effort on the part of those who have always strived for the betterment of literature in this part of the world.

....

دانش طاہر (کراچی)

Really this site presents the standard of urdu Literature.Very impressive work.

....

آج سے چند سال پہلے ڈنمارک سے ''شاہین انٹرنیشنل'' کی اشاعت پر میں نے ان سے رابطہ قائم کیا اور مدد کی درخواست کی،انہوں نے جس ظرف،وسعت قلب،پیار اور محبت سے اس پراجیکٹ میں میری راہنمائی کی وہ صرف حیدر قریشی کا ہی کام ہوسکتا ہے۔تعلق قربت میں اور قربت دوستی میں بدل گئی۔اسی طرح میں نے اردو کمپیوٹر کو فرینکفرٹ میں حیدر قریشی کے توسط سے متعارف کرانے میں نمایاں رول ادا کیا۔۔۔ادب کی ہر صنف پر بے پناہ اور با مقصد لکھنے والا،ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ آدمی سوتے میں بھی لکھتا ہے۔میری مہمان نوازی کے دوران دن کا پورا وقت مجھے دینے کے باوجود رات کو اپنے ہاتھ سے لکھے بیس خط میرے سامنے رکھ دیئے،جو کہ پاکستان اور انڈیا کے مختلف ادیبوں اور شعراء کے نام تھے۔ (**محمد آصف خواجہ** کے تاثرات،

بحوالہ کتاب **انٹرویوز** مرتب **سعید شباب** ص۱۴۵،۱۴۶)

ناصر نظامی (ہالینڈ)

حیدر قریشی کے لئے دلی جذبات

خوش فکر ہیں،خوش قسمت و خود دار ہیں حیدر
پُردرد ہیں، ہمدرد ہیں، پُرکار ہیں حیدر
وہ تو ہیں نئی جہتوں، نئی پرتوں کے خوگر
تجدید کے مکتب کے قلم کار ہیں حیدر
ہر پل وہ لٹاتے ہیں نئی فکر کے موتی
گل خیز و سمن ریز و گہربار ہیں حیدر
تخلیق ہو، تحقیق ہو، تنقید ہو، کچھ ہو
اردو کے اہم شاعر و نثّار ہیں حیدر
ماہیے کو عطا کی ہے نئی شان ادب میں
سب کج رووں سے برسرِ پیکار ہیں حیدر
ہستی ہیں وہ احساس کی کرنوں کی دھنک سی
بے لوث ہیں، دَم ساز ہیں،غم خوار ہیں حیدر
مُرجھائی ہوئی رُوحوں میں جو بھر دے نیا دَم
اس نکہتِ اخلاص کی مہکار ہیں حیدر
وہ فنِ ظرافت کی ادا سے بھی ہیں واقف
جب بات کو کر دیتے گرہ دار ہیں حیدر
ناصرؔ نے تہہ دل سے لکھا اُن کا قصیدہ
تعریف کے، توصیف کے حق دار ہیں حیدر

ڈاکٹر صابر آفاقی (مظفر آباد)

غزل
پیارے حیدر قریشی کے نام

مصرعہ تمہارے شعر کا یہ کام کر گیا
نشتر کی طرح میرے جگر میں اُتر گیا

وہ شخص دل کے شہر میں اب بھی مقیم ہے
وہ شخص گرچہ دیس سے پرواز کر گیا

کچھ بھی ہو بزمِ ناز سے جانا نہیں کہیں
نکلا جو ایک بار تو وہ عمر بھر گیا

دل میں ہزار خنجر و نشتر چمکتے ہیں
جب پوچھتے ہیں آپ کا حیدرؔ کدھر گیا

تُو جرمنی میں شاد رہے اے مِرے عزیز!
مجھ کو خوشی ہے تیرا مقدّر سنور گیا

صابرؔ کبھی بھی شہرِ وفا کو نہ چھوڑنا
پھر کیا رہے گا شہر میں، تُو بھی اگر گیا

(ڈاکٹر آفاقی صاحب نے یہ غزل اندازاً ۱۹۹۵ء میں کہی تھی، یہ گلبن احمد آباد میں چھپ چکی ہے)

اطہر راز (لندن)

فکروفن کے رازداں حیدر قریشی آپ ہیں
الجھنوں کے درمیاں حیدر قریشی آپ ہیں

بدگمانی کی فضا میں حق نظر آتا نہیں
حق پرستی کا نشاں حیدر قریشی آپ ہیں

آپ کے دَم سے منوّر ہیں محبت کے چراغ
روشنی کا آستاں حیدر قریشی آپ ہیں

سوءِ ظن کی راہ میں تخریب کی اُڑتی ہے دھول
حسنِ ظن کے ترجماں حیدر قریشی آپ ہیں

آپ کا قد بھی نمایاں ہے ادب کے شہر میں
رازؔ میرے ہم زباں حیدر قریشی آپ ہیں

نوٹ: یہ اشعار اطہر راز مرحوم نے تب کہے تھے جب لندن کے اردو ادبی مافیا نے حیدر قریشی کے خلاف غلیظ مہم شروع کر رکھی تھی۔یہ اشعار لندن کے رسالہ ''پرواز'' میں چھپ چکے ہیں۔(**ارشد خالد**)

اسلم حنیف (گنور، بدایوں)

توشیح
حیدر قریشی کے نام

ح حریری جذبات واحساسات کے اظہار پر
ے یدِطولیٰ رکھنے والی ادبی ہستیاں
فعال اور متحرک ہستیاں
د دورافتادہ، مفلوج کن ماحول اور
مصروف زندگی میں بھی
ر ریاضتِ فن سے غافل نہیں ہوتیں
مشغلۂ لوح وقلم کے وقت
ق قطبین و آفاق اور زندگی کے حقائق
ان کی نوکِ قلم پر مجتمع ہو جاتے ہیں
ر رواں دواں قلم جب ان کو مختلف علامتوں میں
ترسیل، کی قوتوں سے ہمکنار کرتا ہے تبھی
ے یعنی تبھی
ش شہرہ آفاق تصانیف معرضِ اظہار میں آتی ہیں
ی یقیناً حیدر قریشی تم بھی اسی قبیل کے فنکار ہو
تم نے خود کو قلم کے حوالے کر کے
ادب پر احسانِ عظیم کیا ہے

قطعہ — عاصی کاشمیری (برمنگھم)

کتنا عالی مقام ہے حیدرؔ
ماہیے کا امام ہے حیدر
نظم، تنقید ہو کہ افسانہ
مستند ایک نام ہے حیدر

حیدرقریشی کی گیارہ کتابوں کے مجموعہ

’’عمرِ لاحاصل کا حاصل‘‘پرتاثرات

[حیدرقریشی کی گیارہ کتابوں کو یکجا کر کے **عمرِ لاحاصل کا حاصل** کے نام سے ۲۰۰۵ء میں عوامی ایڈیشن کے طور پر شائع کیا گیا تھا۔تب اس کتاب کے حوالے سے جومضامین رتاثرات لکھے گئے،انہیں یہاں یکجا کر کے پیش کیا جا رہاہے۔اس کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ اب ۲۰۰۹ء میں میگزین سائز کے ۶۱۶ صفحات پر مشتمل اسی کتاب کا لائبریری ایڈیشن مزید اضافوں کے ساتھ شائع ہوا ہے۔اس ایڈیشن کے استقبال کے طور پر یہ چند مضامین اور تاثرات پیش ہیں۔**ارشدخالد**]

’’عمرِ لاحاصل کا حاصل‘‘ ایک انوکھی کتاب ہے جسے ممتاز ہمہ جہت ادیب حیدر قریشی نے یادوں،غزلوں،نظموں،ماہیوں،کہانیوں،انشائیوں،خاکوں اور سفرناموں کی صورت میں رقم کیا ہےاور پھران جملہ جہات کو باہم مربوط کر کے ایک ایسی خودنوشت سوانح عمری میں ڈھال دیا ہے جواپنی انفرادیت،گہرائی اور وسعت کے اعتبار سے ایک’’چیزے دیگر‘‘میں منقلب ہوکر سامنے آ گئی ہے۔شاعری،احساس،متخیلہ اور خیال کے سفر کی داستان ہے اور انشائیہ تخلیقی سطح کی فکری یافت کا بیانیہ ہے۔جبکہ کہانی زماں کے مختلف ابعاد کی تصویرکشی کرتے ہوئے باطن اور خارج کے منطقوں کو باہم آمیز کرنے پر قادر ہوتی ہے۔خاکوں اور یادوں کے ذریعے انسان دوسروں سے اپنے تعلقِ خاطر کو منظرِ عام پر لاتا ہےاور سفرناموں میں زندگی کے رواں مناظر کو شخصی زاویۂ نگاہ سے گرفت میں لیتا ہے۔غور کیجئے کہ یہ سب خودنوشت سوانح عمری کی قاشیں ہیں جنہیں اگر بکھری حالت میں رہنے دیا جائے تو مختلف اصنافِ ادب کی صورت میں دکھائی دیتی ہیں لیکن اگر انہیں سلک میں پرو دیا جائے تو ایک ایسی خود نوشت سوانح عمری بن جاتی ہیں جو ہر اعتبار سے منفرد اور دلکش ہوتی ہے۔یہی کام حیدرقریشی نے انجام دیا ہےاور ایک ایسی کتاب لکھ دی ہے جسے اگر ایک زاویے سے دیکھیں تو یہ مختلف اصناف میں منقسم نظر آئے جب کہ دوسرے زاویے سے دیکھیں تو یہ ایک خیال انگیز،معنویت سے لبریز تصنیف کی صورت میں سامنے آ جائے۔حیدرقریشی نے اپنی اس زندہ رہنے والی کتاب کو’’عمرِ لاحاصل کا حاصل‘‘ کہا ہے۔غور کیجئے کہ اس عنوان میں لاحاصل سے حاصل تک کا سفر ایک ایسی اوڈیسی ہے جو کم کم دیکھنے میں آئی ہے۔ **ڈاکٹر وزیر آغا**۔(لاہور،پاکستان)

حیدرقریشی کی شاعری میں بے ساختہ پن اور روانی ہے۔ایک بار پڑھنا شروع کیا تو جی چاہا پڑھتی ہی رہوں۔دوسرا اہم وصف بے باکی اور وارفتگی کا ہے جو حیدرقریشی کی شاعری میں نمایاں ہے۔

ڈاکٹر کرسٹینا اوسٹرہیلڈ۔(جرمنی) Dr. Christina Oesterheld

حیدرقریشی کی کہانیاں کائناتی انسان،خدا،روح،ثقافت اور ثقافتی وراثت کے ازلی سوالوں کی کہانیاں ہیں۔ایسی کہانیاں اردو میں بہت کم لکھی گئی ہیں۔۔۔۔۔حیدرقریشی کی کہانیاں ایک نئی تخلیقی روایت کی ابتدا ہیں۔

دیوندر اِسّر۔(دہلی،انڈیا)

مجھے پہلے کی طرح آپ کے کام کی صلاحیت کے معجزے پر حیرت بھی ہےاور صدرشک بھی۔سمجھ میں نہیں آتا ہے آپ 24 گھنٹوں کو 48 گھنٹوں یا اس سے بھی زیادہ کس طرح بنا لیتے ہیں؟۔اگلی ملاقات ہوگی (انشاءاللہ) تو آپ سے یہ منتر سیکھنے کی کوشش کروں گی۔

ڈاکٹر لڈمیلا وسیلئیوا۔(روس) **Dr.Ludmila**

میری مادری زبان اردو نہیں اور حیدرقریشی جیسی قدآور ادبی شخصیت کے فن کے بارے میں لکھنا غیر اردو پس منظر رکھنے والے طالب علم کے لیے قطعاً کوئی آسان کام نہیں۔مگر میں نے ان کی قیمتی کتابیں پڑھ رکھی ہیں اور ان سے لطف اندوز بھی ہوتا رہتا ہوں۔حیدرقریشی نے کئی ادبی اصناف میں قلم اُٹھایا اور یہ بھی ثابت کیا کہ وہ جدید اردو ادب کے ایک بڑے ادبی شہسوار ہیں جنہوں نے اپنی جمالیاتی فتوحات کے ذریعے سے اردو زبان و ادب کو توسیع دینے کا کام کیا ہے۔ان کی کتاب’’میری محبتیں‘‘میری نظر میں اردو خاکہ نگاری میں ہی نہیں مجموعی اردو ادب کی بھی ایک بڑی اہم کتاب ہے۔

ہانی السعید۔(مصر)

Haider Qureshi is a breath of frsh air for our times.I am honoured to have his aquaintance.

Cassandra Diane Rouson (U.S.A.)

’’پرسوں کی شام میرے لیے بہت اہم اور خوش گوار تھی کہ میری ملاقات عباس رضوی صاحب سے ہوئی۔عمرِ لاحاصل کا حاصل اور جدید ادب نے اُس رات بھی اور آج رات بھی صبح تک مجھے جگائے رکھا۔ہمارے درمیان بہت کم ایسی ادبی شخصیات ہیں جنھوں نے ادب کے اتنے سارے منطقوں میں نہ صرف قدم رکھا بلکہ خوب خوب سیر کی اور اپنے تجربوں اور مشاہدات کو اپنے تخلیقی سفر کا حصہ بنایا۔

میں آپ کی ان کاوشوں کو انتہائی قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔یوں ہی ایک اور خیال آیا ہے کہ’’خان پور سے جرمنی تک‘‘ کا احاطہ کیجیے۔آپ جس ڈھنگ سے کردار بناتے ہیں اور اُن کرداروں کو ایک خاص ڈھب سے کہانیوں کے نشیب وفراز سے گزارتے ہیں بہت Realistic ہیں۔’’خان پور سے جرمنی تک‘‘ کی ان کئی دہائیوں میں ایسے بے شمار کردار ہوں گے اور ایسے دلچسپ اور صبر آزما واقعات ہوں گے جو آپ کی تخلیقی اپچ کے محتاج ہوں گے۔‘‘

(اقتباس از مکتوب **ایوب خاور** بنام حیدرقریشی ۱۴رستمبر ۲۰۰۹ء)

ڈاکٹر حامد اشرف

ریڈر و صدر شعبہء اردو، ایم۔یو۔کالج، اودگیر۔مہاراشٹرا۔(انڈیا)

حیدر قریشی کی نثری و شعری کلیات

عمرِ لا حاصل کا حاصل

جلوۂ صد رنگ کی عمدہ مثال

(یہ مضمون کتاب مذکور کے عوامی ایڈیشن کے حوالے سے ہے)

کل ہی ''عمرِ لا حاصل کا حاصل'' ملی۔اپنی نوعیت کی مجھے پہلی ایسی کتاب لگی جسے افطار سے پہلے اور سحر کرنے کے بعد پڑھنے کو جی چاہے۔سنا ہے کہ مخدوم کی کتاب ''سُرخ سویرا'' کو اُن کا کوئی پرستار ''رحل'' پر رکھ کر پڑھتا تھا۔میں سحر اور افطار کے وقت ''عمرِ لا حاصل کا حاصل'' کی حقیقت جان رہا ہوں۔

(**ڈاکٹر حامد اشرف** (اودگیر،انڈیا) کی ایک ای میل بنام **حیدر قریشی** سے اقتباس)

دنیا نے جن ابنائے زمانہ سے علمی و ادبی فیض اٹھایا، جن کے نقد و نظر سے شعر و ادب کی کہکشاں منور ہوئی، جن کی جولانیٔ قلم کی ایک دنیا پرستار بنی، جن کے اذہان تخلیق و تحقیق نے یقیں محکم اور عمل پیہم سے اصنافِ شعر و ادب کی راہیں متعین کیں، ان اہلِ قلم میں ایک نام حیدر قریشی کا بھی ہے۔جو بیک وقت شاعر، ادیب، ناقد، صحافی، ماہیا نگار، سفرنامہ نگار، سوانح نگار، محقق، انشا پرداز و خاکہ نگار، یادنگار و کالم نگار بلکہ شبدیزِ فن کے شہسوار سمجھے جاتے ہیں ۔

حیدر قریشی کا کل شعری و نثری سرمایہ بعنوان "عمرِ لا حاصل کا حاصل" بصورتِ کلیات و عوامی ایڈیشن شائع ہو چکا ہے۔اس کی انفرادیت یہ ہے کہ اس میں حیدر قریشی کی شاعری، افسانے، خاکے اور یادیں، انشائیے، اور سفرنامہ سے متعلق (۱۱) گیارہ کتابوں کو یکجا پیش کیا گیا ہے، جس کی مجموعی ضخامت بارہ سو صفحات سے کسی طرح کم نہیں تھی۔اردو ادب میں اس طرح کی پیشکش پہلی بار ہوئی ہے۔اس سلسلے میں ڈاکٹر انور سدید (پاکستان) کی رائے ملاحظہ ہو:

"(حیدر قریشی) کی پوری زندگی کا تخلیقی اثاثہ "عمرِ لا حاصل کا حاصل" کے نام سے شائع ہوا ہے، جس میں پانچ

شعری مجموعے (سلگتے خواب، عمرِ گریزاں، دعائے دل، درد سمندر اور محبت کے پھول) اور چھ نثری مجموعے (افسانے: روشنی کی بشارت، قصے کہانیاں) انشائیے (فاصلے قربتیں) سفرنامہ (سوئے حجاز) خاکے (میری محبتیں اور کھٹی میٹھی یادیں) شامل ہیں، جسے اردو ادب کا نادر، انوکھا اور منفرد تجربہ قرار دیا جا سکتا ہے۔"

(اقتباس از تبصرہ، مطبوعہ روزنامہ نوائے وقت، لاہور، سنڈے میگزین، مورخہ ۲۱/اگست ۲۰۰۵ء)

حیدر قریشی کا تعارف راقم السطور سے معروف ادیب و شاعر و صحافی نذیر فتح پوری اور انٹرنیٹ کی دین ہے۔اردو دوست ڈاٹ کام، حیدر قریشی ڈاٹ کام، حیدر قریشی اسپیس ڈاٹ لائیو ڈاٹ کام، جدید ادب ڈاٹ کام، جیسی ویب سائٹس نے یہ احساس دلایا کہ خانپور (پاکستان) کی سرزمیں سے ابھرنے والا قلمکار، جرمنی میں سکونت اختیار کرتے ہوئے اردو زبان و ادب کو نئی بلندیاں فراہم کرنے اور دنیا بھر میں اردو کی پہچان انٹرنیٹ سے کروانے میں دائمی کامیابی حاصل کر چکا ہے۔اس کارِ خیر کے علاوہ حیدر قریشی کی تحقیقی و تخلیقی تصانیف نے انہیں شہرت و عظمت کی نئی بلندیاں عطا کیں۔

راقم السطور ادب کی دنیا کا نوآموز طالبِ علم ہے، اور حیدر قریشی صاحب کا قد ادب میں بہت اونچا ہے لیکن، مجھے یہ کہنے میں تامّل نہیں ہے کہ حیدر صاحب نے راقم سے جو رابطہ روا رکھا ہے، وہ محبانہ اور دوستانہ ہے۔ادبی رسالہ اسباق، پونہ کے مدیر نذیر فتح پوری نے استاذی ڈاکٹر راہی قریشی اور راقم السطور پر ایک گوشہ نکالنے کا اعلان کیا تو ناچیز کی حقیر خدمتِ زبان کے پیشِ نظر حیدر صاحب نے ایک خوبصورت تحریر ارسال کی، جو ان کی سادہ لوحی اور نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کا بیّن ثبوت ہے۔

حیدر صاحب کی شعری و نثری کلیات، بلاشبہ چمنستانِ ادب کا عطر بیز، مرقعِ حسن ہے، جس کے مطالعہ سے نہ صرف نزدیک و دور کے بے شمار اہلِ اردو کے قلب و ذہن معطر ہوتے ہیں بلکہ زندگی کے بہت سے اسرار و رموز بھی ان پر کھلتے ہیں۔جس طرح ہر زبان کے ادب کی ابتداء شعر سے ہوئی ہے، اسی طرح حیدر صاحب اپنی کلیات میں بطورِ شاعر پہلے متعارف ہوتے ہیں۔شاعری کی یہ تعریف کی گئی ہے کہ وہ خود حسین ہوتی ہے اور حسن کو Repersent کرتی ہے۔حیدر صاحب کی سیرت و شخصیت میں حسن و عشق کے دو عظیم پہلو موجود ہیں، اس لیے وہ ایک اچھے شاعر کے منصبِ عظیم سے عہدہ برآ ہو سکے ہیں۔مذکورہ بالا کلیات کے شعری مشمولات میں غزل، نظم، ماہیا، اور دوہڑوں کے مطالعے سے قاری اس کنفیوژن کا شکار ہو جاتا ہے کہ حیدر صاحب کو غزل کہنے میں مہارت ہے یا کہ نظم و ماہیا کی تخلیق پر! کیونکہ، شاعری جن لوازماتِ فن کا استعمال اور صرفِ خونِ جگر کا تقاضہ کرتی ہے، حیدر صاحب منجملہء اوصافِ شاعری اس پر پورے اترتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری رومان و حقیقتی " تفسیرِ غم " بن جاتی ہے۔جہاں غمِ جاناں و غمِ دوراں کا آفاقی اظہار بھی ہے اور محبوب کے حسن و جمال کا ایک میلہ بھی! خصوصاً غزل اور کے باب میں حیدر صاحب کی افکار کی تابانی، تجربے کی شدّت، فکر کی رسائی، مشاہدے کی گہرائی، احسا

سات کی کشادگی اور شیریں بیانی کی ایک دنیا قائل ہو چکی ہے‘ جو‘ شعر و ادب میں ان کا نام باقی رکھنے کے لیے کافی ہے۔حیدر صاحب کی غزلوں کا سرسری مطالعہ بھی یہ ثابت کرتا ہے کہ خدا نے انہیں چشمِ بصیرت عطا کی ہے۔جس کا اندازہ ذیل کے سہل و خوبصورت اشعار اور رواں دواں زباں سے ہوتا ہے۔

غم تمہارا نہیں جاناں‘ ہمیں دکھ اپنا ہے   تم بچھڑتے ہو تو ہم خود سے بچھڑ جاتے ہیں

مرجھا چکے ہیں پھول تری یاد کے مگر   محسوس ہو رہی ہے عجب تازگی مجھے

دل کو تو بہت پہلے سے دھڑکا سا لگا تھا   پانا ترا شاید تجھے کھونے کے لیے ہے

پھر اس کے وصل میں کیا جانے کتنی لذت ہوگی   وہ جس کا ہجر بھی لطفِ وصال رکھتا ہے

چند لمحے وہ ان سے ملاقات کے   مری سانسوں میں برسوں مہکتے رہے

نہیں ہے کوئی بھی امید‘ جس کے آنے کی   دل اس کے آنے کے سو سو قیاس رکھتا ہے

کر دیا ہے اس نے کن خوش فہمیوں میں مبتلا   اس کے خالی خط کے معنی ڈھونڈتا رہتا ہوں میں

وہ چاند‘ وہ گلاب‘ وہ پتھر‘ وہ آگ بھی   جیسی مثال دیجیے‘ برحق مثال ہے

نہ پورا سوچ سکوں‘ چھو سکوں‘ نہ پڑھ پاؤں   کبھی وہ چاند‘ کبھی گل‘ کبھی کتاب لگے

اس کی چیخوں کی صدا آج بھی آتی ہے مجھے   میں نے زندہ ہی تری یاد کو دفنایا تھا

مرے ہی خواب کنوارے نہیں رہے اب تو   کہ آرزوئیں تری بھی بیاہیاں نہ گئیں

وہ پتھر دل سہی لیکن‘ ہمارا بھی یہ دعویٰ ہے   ہمارے لب جنہیں چھو لیں‘ وہ پتھر بول اٹھتے ہیں

شرطوں پہ محبت کی کوئی بات نہ کرنا   یہ تیرا طلب گار شہنشاہ نہیں ہے

صرف یہ عمرِ گریزاں ہی نہیں کرتی اداس   مرا ہنستا ہوا بچپن بھی رلاتا ہے مجھے

حیدر قریشی کی ماہیہ نگاری بھی غم و نشاط کی مخصوص کیفیت کا برملا اظہار اور تاثر کا دوسرا نام ہے‘ یہاں بھی ان کی زباں صاف‘ رواں دواں اور سیدھی سادھی ہے۔غزلوں کی طرح ماہیوں میں بھی ابہام کہیں نہیں ہے اور پونے تین مصرعوں کے ماہیوں میں بھی موسیقیت کا عنصر صاف نظر آتا ہے۔صنفِ ماہیا نگاری پر حیدر صاحب نے اردو میں ماہیا نگاری اردو ماہیے کی تحریک‘ اور اردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما‘ جیسی تصانیف سپردِ قلم کر کے پوری اردو دنیا سے خراجِ تحسین وصول کیا ہے اور اپنی کلیات میں (۲۹۲) ماہیے ندرتِ تخیل‘ بصیرت افروز مشاہدہ اور تفحصِ الفاظ کے سہارے ماورائے ذہن ہو کر تخلیق کیے ہیں‘ جو جینے کا سلیقہ اور مرنے کا ادب سکھاتے ہیں‘ چاہنے اور چاہے جانے کا درس دیتے ہیں۔ان ماہیوں کے ذریعے حیدر صاحب نے اپنے پڑھنے والوں کو عشق و آگہی کی دولت عطا کرتے ہوئے ان کے قلب و ذہن کے مصفّیٰ ہونے کا موقع فراہم کیا ہے۔

رخصت کی گھڑی آئی
دل ماں کا دھڑکا
آنکھوں میں جھڑی آئی

☆

ناکامی سے ڈرتے ہو
عشق بھی کرتے ہو
بدنامی سے ڈرتے ہو

☆

کچھ رشتے ٹوٹ گئے
برتن مٹی کے
ہاتھوں سے چھوٹ گئے

☆

کچھ من کی خرابی تھی
کچھ اس چہرے کی
رنگت بھی گلابی تھی

☆

جنموں کی اداسی ہے
جسم ہے آسودہ
پر روح تو پیاسی ہے

☆

نیت تھی مری کھوٹی
تم بھی تھے آمادہ
اور کھلتی گئی چوٹی

☆

تو کس کا سوالی تھا
دامنِ دل جس کا
خود اپنا ہی خالی تھا

نہیں‘ ہم نہیں روئے تھے
چاند کی کرنوں میں
کچھ موتی پروئے تھے

کہا جاتا ہے صحبت کے اثر سے آدمی کیا در و دیوار بدل جاتے ہیں۔حیدر صاحب نے بھی نابغۂ روزگار ڈاکٹر وزیر آغا (پاکستان) کی علمی صحبتوں سے بہت کچھ سیکھا ہے۔وہ اپنی تصنیف‘ ڈاکٹر وزیر آغا۔عہد ساز شخصیت‘ میں رقمطراز ہیں کہ: ”الٰہیاتی مسائل‘ روح کی حقیقت‘ انسان کی مخفی قوتیں اور کائنات کی بے پناہ وسعتیں‘ ان موضوعات پر ان سے کھل کر باتیں کی ہیں۔بعض ایسی باتیں جو اپنے آپ سے کرتے ہوئے بھی خوف محسوس ہوتا ہے‘ وزیر آغا سے بے خوف ہو کر کی ہیں اور ان کی گفتگو سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔“

(وزیر آغا۔عہد ساز شخصیت۔ص۴۔نایاب پبلی کیشنز‘ خان پور ۱۹۹۵ء)

حیدر صاحب کی زمین و زماں کی معلومات ہی نثر و نظم میں ڈھل کر کلیات بن گئی ہیں۔جس میں حیدر صاحب کی (۳۰) نظمیں‘ بہر حال اپنے حسن کا جادو جگاتی ہیں۔موجودہ زمانے میں نظم کی کوئی ہیئت مقرر نہیں ہے۔کوئی بھی خیال تسلسل اور واقعہ کے ساتھ پیش کیا جائے تو وہ نظم ہے۔حیدر صاحب کی نظموں کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے اور ان کی نظموں کو ان کے ذہنی اور سوانحی حالات کی روشنی میں بآسانی سمجھا اور پرکھا جا سکتا ہے۔پھاگن کی سفاک ہوا‘ ایبٹ آباد‘ دعا گزیدہ‘ میں پھر آنسوؤں کا گلہ گھونٹ دوں گا‘ مبارک باد اور پرسہ جیسی

نظموں سے حیدر صاحب کی زندگی ایک کھلی کتاب بن جاتی ہے جس کی ہر سطر سے سادگی، فکر کی رسائی اور عزم کی بلندی کا اظہار ہوتا ہے۔حیدر صاحب کی نظم نگاری پر ڈاکٹر سعادت سعید، شعبہء اردو۔انقرا یونیورسٹی، ترکی، کی رائے ملاحظہ کیجیے۔

حیدر قریشی اس امر سے آگاہ ہیں کہ صنفِ نظم میں ذاتی اور اجتماعی کیفیات متنوع پیرایوں میں اجاگر ہوسکتی ہیں۔اس میں جذبے، تخیل اور فکر کی ترکیبی وحدت کی بنیاد پر، پرقوت اظہار کے دریچے وا ہوتے ہیں۔حیدر قریشی صنفِ نظم کی مطلوبہ و ملزمہ کلّی وحدت کا اہتمام اس طور سے کرتے ہیں کہ اس کے اجزاء کا حسن اور تاثر برقرار رہتا ہے۔

(پیش لفظ۔حیدر قریشی کی ادبی خدمات۔پروفیسر نذر خلیق۔مطبوعہ میاں محمد بخش پبلشرز۔خانپور۔۲۰۰۳ء)

حیدر صاحب اپنی نظموں میں غمِ عشق سے زیادہ غمِ دنیا کا اظہار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔یعنی عشق بلائے جان ہے۔مگر اس کی جان (دنیا) اس سے بھی زیادہ آفتِ ہوش وایماں ہے۔ذیل میں حیدر صاحب کی دو نظموں کے دو مختصر حصے بطورِ نمونہ پیش ہیں۔

ذرا پھر دل کے دریا میں اتر کر
اپنی نم آنکھوں سے تھوڑا مسکراؤ
اور پھر سوچو!
زمیں، پانی، فضاؤں تک
جہاں بھی زندگی ہے
اس ہوا کی حکمرانی ہے
ہوا نہ ہوا گر تو زندگی معدوم ہوجائے
ہوا ناگن سہی، ڈائن سہی، لیکن
ہوا تو زندگی بھی ہے!! **(نظم:ہوا)**

☆☆☆☆

ڈرتا ہوں تیرے قُرب سے پتھرا نہ جاؤں میں
میں چاہتا ہوں صرف تجھے سوچتا رہوں
جب جانتا ہوں دل ترا ہے پتھروں کا ڈھیر
پھر آئینہء روح کیوں ٹکراؤں گا بھلا؟
تسخیر کر کے میں تجھے کیا پاؤں گا بھلا؟

اچھا ہے تجھ کو دور سے ہی دیکھتا رہوں
اچھا ہے تجھ کو دور سے ہی سوچتا رہوں!
(نظم چاند کی تسخیر کے بعد)

حیدر صاحب کے دو افسانوی مجموعے بھی شاملِ کلیات ہیں۔بیشتر افسانے غم کے ساتھ خوشی اور خوشی میں غم کی کیفیات پیش کرتے ہیں۔ویسے بھی حیدر صاحب کی شاعری ہو کہ افسانہ نگاری، انشائیے ہوں کہ خاکہ نگاری، سفرنامے ہوں کہ کالم نگاری، سبھی ایک خاص ذہن کی پیداوار محسوس ہوتے ہیں۔حیدر صاحب کی تحریر کی یہ خاصیت ہے کہ وہ ہنسنے میں رونے کو، چلنے میں ٹھہرنے کو، خاموشی میں آواز کو اور زندگی میں موت کو ڈھونڈتے ہیں اور ان کی تحریر کا سکوت بھی صدائے بازگشت بن جاتا ہے۔حیدر صاحب نے زیرِ عنوان روشنی کی بشارت اور قصے کہانیاں، جملہ (۲۵) افسانے تحریر کیے ہیں، جس میں چند ایک کے علاوہ سبھی افسانے ہماری توجہ مرکوز کرنے میں کامیاب ہیں اور بلا مبالغہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان افسانوں کا مطالعہ کلاسکیت اور جدیدیت کا منفرد طرزِ اظہار ہے۔

ادب کی ایک اہم صنف خاکہ نگاری بھی ہے۔اردو میں یہ صنف اپنے لکھنے والوں کی جگر کاوی و جگر سوزی سے بے اعتنائی کے لیے گلہ گزار ہے۔خاکہ نگاری طنز و مزاح کے ساتھ ساتھ خاکہ نگار کی ظرافت و فراست کا مطالبہ کرتی ہے۔حیدر صاحب کی فطرت میں حسِ مزاح موجود ہے، جس کی وجہ سے ان کی تحریر میں مزاح ایک تبسمِ زیرِ لب کا سامان فراہم کرتا ہے۔اس صنف کے بارے میں وہ خود یہ کہتے ہیں کہ:

''خاکہ نگاری نہ تو شخصیت کی خاک اڑانے کا نام ہے اور نہ شخصیت پر خاک ڈالنے کا نام ہے، بلکہ یہ تو پلِ صراط پر سے گزرنے کا عمل ہے، جبکہ ادیب نما صحافیوں کے خاکے سرکس کے رسّوں پر چلنے کا منظر دکھاتے ہیں۔''

(بلند قامت ادیب، اکبر حمیدی۔میری محبتیں، ص ۱۴۸۔عمرِ لاحاصل کا حاصل۔۲۰۰۵ء)

حیدر صاحب کی کلیات مذکورہ میں زیرِ عنوان میری محبتیں، (۲۰) خاکے ملتے ہیں، جس میں (۱۰) خاکے، اول خویش کی ذیلی سرخی کے ساتھ خون کے رشتوں والے ممدوحین پر اور (۱۰) خاکے بعدِ درویش کے عنوان سے علمی و ادبی شخصیتوں پر پیش ہوئے ہیں۔سبھی خاکے زندگی کی حرارت اور زمانے کی نیرنگی کے ساتھ ساتھ حیدر صاحب کے افکار و فن اور نازک خیالی کا اظہار ہیں۔بعض مقامات پر موصوف کی تحریر اسقدر کربناک ہوجاتی ہے کہ ان کے آنسوؤں کی نمی ہمیں اپنی آنکھوں میں محسوس ہونے لگتی ہے اور سادہ واقعات بھی اسلوبِ بیان کے باعث حقیقت نگاری کی شان حاصل کر لیتے ہیں۔

حیدر صاحب نے بعنوان کھٹی میٹھی یادیں، تصنیف کے ذریعے ایک نئی صنف "یادنگاری" کی اردو میں بنا ڈالی ہے۔جس میں (۱۳) مضامین موجود ہیں، جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ ادب مسرت زائی کا سرچشمہ ہے۔ان مضامین میں واقعات کی پیش کشی اور اسلوبِ نگارش کی شان پوشیدہ ہے، جس سے حیدر صاحب کے دل

کی مخفی دھڑکنوں کا اظہار ہوتا ہے۔

حیدر صاحب کی ایک انشائیہ تصنیف زیرِعنوان ''فاصلے' قربتیں'' بھی مذکورہ کلیات میں شامل ہے۔جس میں جملہ دس انشائیے بیان ہوئے ہیں۔جو لوگ سوچنے' سمجھنے کا سلیقہ اور مناسب ومتوازن رائے قائم کرنے کا نظریہ رکھتے ہیں' وہ کسی بھی معاملے کی گہرائی اور گیرائی تک پہنچتے ہیں۔انسان جس طرح مناظرِ فطرت اور چاند ستاروں سے متاثر ہوتا ہے' اسی طرح وہ اپنی گرد وپیش کے اشیاء ومظاہر بھی متاثر ہوتا ہے۔انہی اشیاء ومظاہر کا حسین اظہار حیدر صاحب کے انشائیے ہیں۔

سفرِحج اور سات عمرے کی یاوری بھی حیدر صاحب کا قابلِ رشک نصیب ہے۔زیرِعنوان ''سوئے حجاز'' حیدر صاحب کی مکہ مکرمہ اور مدینہ شریف کے زیارتوں کا سفرنامہ تصنیف کیا ہے۔یہ تصنیف موصوف کے شعری ونثری کلیات کا آخری حصہ ہے۔جس میں حیدر صاحب نے مقاماتِ سفرِحج اور سات عمروں کی ادائیگی کے تاثرات' طور طریقے' فرائض وسنن کو کائنات اور اپنی ذات کے تناظر میں دیکھا' محسوس کیا اور پیش کیا ہے اور یہ ایک ایسا وصف ہے' جو ارفع واعلیٰ احساسات کے بغیر پیدا نہیں ہوتا۔مذکورہ کلیات میں کعبہ شریف سے متعلق چند ماہیے' اور نعتِ شریف بھی قابلِ ذکر ہیں۔

ماریشس میں عالمی اردو کانفرنس اور پروفیسر نذر خلیق کا حیدر قریشی سے مکالمہ بھی کلیات بالا کی مشمولات ہیں۔حیدر صاحب کی نثری وشعری کلیات یہ بتاتی ہے کہ اگر "عمرِ لاحاصل کا حاصل" چاہتے ہو تو اردو شعروادب کو اپنی زندگی کا ماحصل بنالو۔کیونکہ' اردو شعروادب صرف شعروادب نہیں ہے بلکہ' آبِ حیات ہے' جس کو پی لینے سے قوم مر نہیں سکتی۔یہ ایک حقیقت ہے کہ حیدر صاحب نے نظم ونثر اردو کی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔جرمنی کے ماحول میں ان کا مسلسل مصروفِ شعروادب رہنا موجبِ صد تحسین ہے اور ان کی عمرِ لاحاصل کا پیمانہ فکر ونظر کی دولت سے بھرا ہوا تہذیبی ورثہ ہے۔

میں انہیں (حیدر قریشی کو) مغربی دنیا میں اردو کا سب سے بڑا ادیب مانتا ہوں اور ان کی صلاحیتوں کے سامنے اپنی ہیچ مدانی کا اعتراف کرتا ہوں۔حیدر، ون مین ادبی رائٹنگ کی انڈسٹری ہیں۔۔۔۔۔میرے برخوردار ہیں۔مجھ سے عمر میں دس برس کم، لیکن کام وصلاحیت میں سو سال بڑے۔حیدر قریشی سے میرا سب سے بڑا رشتہ و تعلق یہ ہے کہ وہ میرے سب سے عزیز استاد اور دوست پروفیسر ناصر احمد کے بھانجے اور داماد ہیں۔اسی رشتے نے مجھے ان کے پاس جرمنی پہنچایا۔پھر ان کی علمی وادبی فتوحات کے درجہ و دائرہ کو دیکھا تو ماننا پڑا کہ ہم تو ساری عمر گھاس ہی کاٹتے رہے ہیں۔

(**ڈاکٹر ظہور احمد اعوان** کے کالم **''دل پشوری''** سے اقتباس۔مطبوعہ روزنامہ آج پشاور۔یکم جنوری ۲۰۰۹ء)

نصرت ظہیر

مدیر سہ ماہی **ادب ساز**، دہلی

حیدر بھائی پر ایک ادھورا مضمون

''عمرِ لاحاصل کا حاصل'' کے تناظر میں

حیدر بھائی سے میری پہلی سیدھی ملاقات اس وقت ہوئی جب ایشیا محوِ خواب تھا اور جرمنی جاگ رہا تھا۔

اصولاً یہ وہ ساعت تھی جو شاعرِ مشرق کو میسر آتی تو وہ مردِ مومن کو جگانے کے لئے ایک اور معرکتہ الآرا نظم یا مثنوی کہہ ڈالتے۔لیکن شکر ہے کہ ہم دونوں میں کوئی شاعرِ مشرق تو کیا شاعرِ شمال مشرق بھی نہیں تھا ورنہ اقبالیات کے ماہرین کو اپنی قابلیت جھاڑنے کیلئے ایک اور اقبالی تخلیق کا حوالہ دینا پڑ جاتا۔ہم دونوں حضرات اس وقت اپنے اپنے کمپیوٹر کے سامنے بیٹھے تھے، اور کوئی نظم کہنے کی بجائے ایک دوسرے کو ای میل بھیج رہے تھے۔

انٹرنیٹ پر اس ملاقات کا سبب میرا وہ مضمون بنا، جو میں نے گوپی چند نارنگ صاحب کو پدم بھوشن کا اعزاز ملنے پر دیے گئے ایک استقبالیہ میں پڑھا تھا اور جسے سُن اور پڑھ کر نہ صرف نارنگ صاحب کے مداح خوش ہوئے تھے بلکہ ان کے مخالفین میں بھی خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

مداح اس لئے خوش ہوئے کہ اُنہیں اس میں صرف نارنگ صاحب کی تعریف نظر آئی۔جب کہ مخالفین کو مضمون کا مزا اُن چٹکیوں میں آیا جو بھری تو گئی تھیں ہنسانے کے لئے مگر اُنہیں ان میں اپنی پسند کے نارنگ مخالف رنگ زیادہ دکھائی دیئے۔یعنی جس کی جیسی روح تھی اسے ویسے فرشتے نظر آئے۔رہ گئے نارنگ صاحب، تو میرا خیال ہے وہ ابھی تک بھی طے نہیں کر پائے ہیں کہ اسے مدح کے زمرے میں رکھیں یا مذاق کے۔جہاں تک خود میرا خیال ہے تو خدا گواہ ہے کہ میں نے وہ مضمون نیت باندھ کر ان کی مدح میں تحریر کیا تھا۔البتہ عنوان نے کچھ کنفیوژن پیدا کر دیا۔میں نے عنوان رکھا تھا' نارنگ صاحب کا تخلیقی اسلوب'۔عنوان کے سنجیدہ پن سے اکثر ادبی رسائل کے مدیر دھوکا کھا گئے اور انہوں نے مضمون کو غیر مزاحیہ ابواب میں شائع فرما دیا۔جس سے مزاح کا رنگ اور گہرا ہو گیا۔

خیر، جب یہ معلوم ہوا کہ ایک اردو ویب سائٹ نے اسے انٹرنیٹ پر بھی چھاپ دیا ہے تو کمپیوٹر پر اپنا

پہلا مضمون پڑھنے کا فطری اشتیاق مجھے جدید ادب ڈاٹ کوم تک لے گیا اور بس، وہاں حیدر قریشی صاحب سے میری ملاقات ہوگئی۔ ماشاءاللہ وہ ڈجیٹل ملاقات اب بھی جاری ہے اور انشااللہ آگے بھی جاری رہے گی۔

اس سے پہلے، بلکہ سب سے پہلے، حیدر بھائی مجھے 'کتاب نما' کے ایک شمارے میں ملے تھے۔ یہ کئی برس پہلے کی بات ہے۔ اس ایک کتاب نما میں انہوں نے سال بھر کے کتاب نماؤں کا تفصیلی جائزہ اس سنجیدگی سے لیا تھا کہ میں چونک گیا۔ اس لئے نہیں کہ کسی اردو والے میں سنجیدگی کا پایا جانا بجائے خود ایک چونکا دینے والی بات ہے۔ بلکہ اس لئے کہ انہوں نے اس مضمون میں اردو ادیبوں کی پورے سال کی کارکردگی کا کچّا چٹھا اس سنجیدگی سے کھول کر رکھ دیا تھا جس طرح ہمارے بچپن کے زمانے کی گھر والیاں ہفتے بھر کے میلے کپڑے دھوبی کے سامنے رکھ دیا کرتی تھیں اور گھر میں موجود کسی اسکولی بچّے کو کاپی قلم تھما کر کہتیں کہ لکھو، کرتے بغیر بٹن کے تین عدد، قمیصیں چھوٹی بڑی مع آستین پانچ عدد، پائجامے آٹھ عدد پائنچوں سمیت اور دوپٹّے وبنیان ثابت اتنے عدد وغیرہ وغیرہ۔

حیدر صاحب نے بھی کچھ اسی طرح حساب لگایا تھا کہ فلاں مصنف نے اس سال اتنے مضمون لکھے جن میں کمال یہ تھا کہ صفحے کے صفحے سیاہ کرنے کے باوجود کچھ نہیں کہا گیا۔ یا فلاں افسانہ نگار نے اتنی کہانیاں لکھیں جن میں سے ہر ایک پر کسی مضمون کا شبہ ہوتا تھا۔ یا پھر فلاں شاعر نے اس سال اتنی غزلیں اور اتنی نظمیں کہیں جن میں اتنے مصرعے بے وزن تھے اتنوں میں سکتہ پکڑا گیا نیز یہ کہ اس سال شتر گربہ اور ایطائے جلی وخفی کی اتنی وارداتیں ہوئیں۔ اسی طرح نقادوں، تبصرہ نگاروں اور مزاح نگاروں وغیرہ کی بھی خبر لی گئی تھی۔ یہاں تک کہ مراسلہ نگاروں کو بھی نہیں بخشا گیا اور بتایا گیا تھا کہ فلاں صاحب نے اس سال اتنے مراسلے لکھے جن میں اتنے مراسلے کسی اور کے مراسلوں سے چوری کئے گئے تھے وغیرہ وغیرہ۔

جب اس جائزے کا میں نے بغور جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ اتنی محنت تو ادیبوں نے اپنی تخلیقات میں بھی نہ کی ہوگی جتنی موصوف نے تمام تر جزئیات کے ساتھ ان کا جائزہ لینے میں فرمادی تھی۔ مضمون پڑھ کر میرے منھ سے وہی جملہ نکلا جو کسی زمانے میں ملک راج آنند کی تقریر سن کر اسرار الحق مجاز کی زبان سے نکلا تھا۔ یعنی یہ کہ کوئی بڑا ہی قابل آدمی معلوم ہوتا ہے۔ پھر جب دھیرے دھیرے ان کی ادبی تخلیقات یہاں وہاں پڑھیں تو ان کے اور جوہر کھلتے گئے۔ اور حال ہی میں ان کی کلّیات کا مطالعہ شروع کیا تو خود اپنا جہل بھی کھل کر سامنے آگیا کہ ایک شخص اتنے خلوص، وارفتگی، سنجیدگی، ایمانداری، محنت اور جانکاہی سے ادب تخلیق کرتا رہا، اور کاغذ کی زمین سے لے کر انٹرنیٹ کے آسمان تک ہر طرف دھومیں مچاتا رہا اور تمہیں اب تک خبر نہ ہوئی۔ یقین کیجئے ادب کے معاملے میں اپنی نا معلومات پر اس وقت اتنی شرم آئی کہ دیر تک یوں محسوس ہوتا رہا جیسے میں کوئی عام قاری نہیں بلکہ کسی یونیورسٹی کا لیکچرر ہوں۔ پروفیسر اس لئے محسوس نہیں کیا کہ وہ پھر بھی تھوڑے پڑھے لکھے ہوتے ہیں۔

حیدر بھائی کی کلّیات 'عمر لا حاصل کا حاصل' یوں تو خود انہی کے بقول اُن کا اب تک کا کُل اثاثہ ہے

لیکن مجھے اس بیان پر شبہ ہے۔ کیونکہ جس رفتار سے ان کا ادبی سفر جاری وساری ہے اسے دیکھتے ہوئے مجھے اندیشہ ہے کہ ایک دو سال میں انہیں ایک اور کلّیات کی ضرورت پیش آجائے گی۔ بلکہ دو عدد کلّیات پر تو کام شروع ہو بھی چکا ہے۔ ایک تو ہے ماہیے کی تحقیق وتنقید پر مشتمل ان کی پانچ کتابوں کی کلّیات، جس کی ترتیب چل رہی ہے۔ اس کے علاوہ تحقیق وتنقید کے بہت سے مضامین ہیں جو اِدھر اُدھر بکھرے پڑے ہیں اور جن کی کلّیات الگ منصوبے کے تحت زیرِ ترتیب ہے۔ لہٰذا اس کا پورا خطرہ موجود ہے کہ جب یہ کلّیات شائع ہوں گی تو ہمیں چند سال بعد انکی تمام کلّیات کی ایک جامع الکلّیات، بلکہ بالکلّیات چھاپنی پڑے گی۔

اس سے ادب کی دنیا میں جو اضافہ ہوگا اس کی تو خیر ایسی کوئی فکر نہیں لیکن یونیورسٹیوں کے اردو لکچررز کے لئے یہ ضرور پریشانی کی بات رہے گی کہ انہیں اپنی نا معلوماتِ عامہ کی موجودہ سطح برقرار رکھنے کے لئے مزید بے مطالعگی سے کام لینا پڑے گا۔ اس جملے کا آخری حصہ اگر آپ کی سمجھ میں نہ آیا ہو تو مرحوم ابنِ انشا کا وہ جملہ یاد کیجئے جو انہوں نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف، 'اردو کی آخری کتاب' کے دیباچے میں لکھا تھا۔ کتاب کے فلیپ پر تحریر تھا 'نا منظور شدہ از محکمۂ تعلیم'۔ اس تعلق سے مصنف نے تحریر کیا تھا کہ ہمیں بہت سے اسکولوں و مدرسوں سے یہ درخواستیں مل رہی ہیں کہ انہیں یہ کتاب نہ بھیجی جائے، اور یہ آرڈر اتنے زیادہ ہیں کہ ہمیں ان کی تعمیل میں دشواری ہو رہی ہے۔

کوئی کام نہ کرنا اپنے آپ میں خود کتنا بڑا کام ہے، اس بات کو کچھ وہی لوگ بہتر سمجھ سکتے ہیں جنہوں نے کبھی کوئی کام نہ کیا ہو۔ ورنہ جو لوگ دن رات کام میں جٹے رہتے ہیں وہ کیا جانیں کہ خالی بیٹھنا کس قدر محنت طلب ہوتا ہے۔ اس پر عزیز دوست شجاع خاورؔ کا شعر یاد آگیا:

مصروف جو رہتے ہیں انہیں کچھ نہیں ملتا　　　بے کار پھروگے تو کوئی کام ملے گا

اگر اب بھی بات سمجھ میں نہ آئی ہو تو کبھی ہمارے دفتر آکر دیکھئے جہاں لوگوں نے کوئی کام نہ کرنے کے ایسے ریکارڈ قائم کر رکھے ہیں کہ گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈز میں بھی ان کی کوئی مثال نہیں ملے گی۔ بے چارے روزانہ اس قدر خالی بیٹھتے ہیں کہ آرام کرتے کرتے تھک جاتے ہیں، اور تازہ دم ہونے کے لئے انہیں ڈیوٹی ختم ہونے سے عموماً ایک گھنٹہ پہلے ہی گھر چلے جانا پڑتا ہے۔

لیکن صاحب، حیدر قریشی جس طرح کام کر رہے ہیں اسے واقعی سلام کرنا پڑتا ہے۔ ایسا فنا فی الادب اردو والا کم از کم اب تک کی عمر میں تو میں نے نہیں دیکھا۔ جب وہ پیدا ہوئے ہونگے تو مجھ سے ایک ڈیڑھ سال چھوٹے رہے ہوں گے۔ لیکن اب جو حساب لگا کر دیکھتا ہوں تو پاتا ہوں کہ وہ اپنی ذات میں اردو ادب کا ایک دور بنتے جا رہے ہیں جب کہ میں ابھی پیدا بھی نہیں ہوا ہوں۔ یہ موازنہ آرائی قارئین کو کچھ بے موقع اور اوٹ پٹی سی ضرور لگی ہوگی مگر کیا کروں جب بھی کسی ہم عمر کو بلندیوں پر دیکھتا ہوں تو اس سے اپنا موازنہ کئے بغیر نہیں رہ

پاتا۔ ویسے اپنی اوقات اور جامے وپاجامے کودرست رکھنے میں یہ عمل خاصا مفید رہتا ہے۔اس عمر میں حیدر صاحب ادب کی اتنی اصناف میں اتنا کام کر چکے ہیں کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔اور وہ بھی اس حالت میں کہ اچھی خاصی غربت میں پلے بڑھے،تعلیم مکمل کرنے سے پہلے، بلکہ اسے مکمل کرنے ہی کے لئے اور گھر بار کی خاطر بھی فیکٹری میں مزدوری کرنا پڑی، وہاں مزدوروں کے لئے لڑتے بھڑتے اور طرح طرح کے عذاب جھیلتے رہے،اس کے بعد شہر چھوٹا، دیس چھوٹا اور سمندر پار پردیس میں رہنے کو مجبور ہوئے۔مگر مولانا حسرتؔ کی طرح چکّی بھی چلاتے رہے اور مشقِ سخن بھی جاری رکھی۔

یوں تو حیدر صاحب نے ادب کی تقریباً ہر صنف میں طبع آزمائی کر کے اردو والوں کا ذوق آزمایا ہے اور مجھ جیسے سخن نافہموں کو آزمائش میں ڈالا ہے مگر شاعری کی شائد سب سے غیر معروف مانی گئی فوک فارم، ماہیا کو اردو میں جو قبولیت و مقبولیت انہوں نے دلائی ہے اس میں دور دور تک کوئی ان کا ہم سر نہیں ہے۔میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ ان سے اچھا ماہیا کسی نے نہیں لکھا۔بہتوں نے بہت عمدہ ماہیا نگاری کی ہوگی، اور آگے بھی کریں گے،لیکن اس صنف کو پاکستان اور ہندوستان میں اردو کے تقریباً ہر ادبی رسالے کا لازمی جزو بنوا دینے میں ان کی کاوش و جدوجہد کا بڑا، بلکہ سب سے بڑا ہاتھ ہے۔ ماہیا، جس کے بارے میں ہماری معلومات مشہور فلمی گیت، 'تم روٹھ کے مت جانا' سے کبھی آگے نہیں بڑھی تھی، آج اردو شاعری کی سب سے بڑی دیسی صنف بن گئی ہے۔ پہلے یہ اعزاز دوہے کو حاصل تھا۔مگر ماہیا اب لگتا ہے دوہے سے بھی آگے نکل گیا ہے۔اور یہ سب کیا دھرا، اللہ معاف کرے،حیدر قریشی صاحب کا ہے۔

کہنے والے کہتے ہیں حیدر صاحب کو ماہیے کا جنون ہے۔ ایک صاحب نے انہیں بابائے ماہیا تک کہہ ڈالا۔ایک اور صاحب نے کہا وہ مجنوں ہیں اور ماہیا ان کی لیلیٰ۔اور اب ان کی یہ کیفیت ہے کہ ماہیا ماہیا کہتے کہتے خود ماہیا ہو گئے ہیں۔ایک قریبی دوست نے لکھا کہ اب جواُن کے خط جرمنی سے آتے ہیں تو لکھتے ہیں کہ ماہیا کے لئے دعا فرمائیں ۔انہوں نے جواب میں لکھا کہ تم ماہیے کے لئے دعا کرتے رہو، میں تمہارے حق میں دعا کروں گا۔شکر ہے کہ ان دعاؤں کے طفیل دونوں خیریت سے ہیں۔ ماہیا بھی اور حیدر بھائی بھی۔اور اب یہاں کوئی کچھ بھی کہے، میں ان کے وہ ماہیے نقل کئے بنا نہیں رہوں گا جو انہوں نے مرد اور عورت کے مکالمے کی صورت میں کہے ہیں اور جو مجھے سب سے زیادہ اس لئے پسند ہیں کہ ان میں ماہیے کی فطری لے کاری تو ہے ہی، لفظوں کی تال اور معنی کے سُر خوب جمے ہیں، جن سے انہوں نے بڑی سادگی کے ساتھ پوری ایک راگ مالا پرو کر رکھ دی ہے۔ سنئے اور سر دھنئے...

مرد

کتنے بدنام ہوئے

پیار میں تیرے،ہم
پھر بھی ناکام ہوئے

عورت

ناکامی سے ڈرتے ہو
عشق بھی کرتے ہو
بدنامی سے ڈرتے ہو

مرد

اس حال فقیری میں
عمریں بیت گئیں
زلفوں کی اسیری میں

عورت

زلفوں سے رہا ہو جا
رب تیری خیر کرے
جا ہم سے جدا ہو جا

مرد

کیا لطف رہائی کا
دل جب سہہ نہ سکے
دکھ تیری جدائی کا

مرد+عورت

ملنا ہو تو ملتے ہیں
پھول محبت کے
پت جھڑ میں بھی کھلتے ہیں

کہئے صاحب، کیا خیال ہے؟

ویسے، جن حضرات کو یہ ایک عام سا فلمی دوگانا محسوس ہوا ہواُن سے میری درخواست ہے وہ کچھ دیر کے لئے مضمون ایک طرف رکھ دیں۔اور جب طبیعت کچھ ٹھیک ہو جائے تو دوبارہ اسے ذرا ٹھہر ٹھہر کر پڑھیں۔ انشااللہ افاقہ ہوگا۔

ماہیے کے علاوہ غزل سے بھی ان کا عشق مجھے کچھ کم نہیں لگتا۔ یہی کیفیت کسی قدر نظم میں ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے افسانے لکھے ہیں،انشائیے تحریر کئے ہیں،خاکہ نگاری کی ہے،تنقیدیں لکھی ہیں،مراسلہ بازی فرمائی ہے اور وہ سب لکھا ہے جو عام طور سے عام ادیب نہیں لکھتے۔اور میری مشکل دیکھئے کہ میں نے پچھلے چند ہفتوں میں یہ سب پڑھا تو غزلوں سے زیادہ مجھے ماہیے اچھے لگے،ماہیوں سے زیادہ نظموں میں لطف آیا،نظموں سے زیادہ انشائیوں میں مزا پایا،انشائیوں سے زیادہ خاکوں نے لطف دیا،خاکوں سے زیادہ تنقیدی مضامین نے متاثر کیا،تنقیدی مضامین سے زیادہ غزلیں پسند آئیں،غزلوں سے زیادہ ماہیے اچھے لگے،ماہیوں سے زیادہ...وعلیٰ ہذالقیاس۔نہ وہ ٹھہرے نہ میں ٹھہرا۔گھوم پھر کر دونوں وہیں واپس آتے رہے جہاں سے چلے تھے۔میں نقاد تو نہیں ہوں کہ دعوے سے کوئی بات حیدر صاحب کے ادب اور فن کے بارے میں کہہ سکوں۔جتنی سمجھ ایک کچے پکے نثر نگار کے طور پر پائی ہے اس کے برتے پر یہ بات ضرور کہوں گا کہ کثیر الازدواج شوہر تمام بیویوں سے اور کثیر الاصناف ادیب تمام اصناف سے ہرگز انصاف نہیں کرسکتا۔لیکن حیدر قریشی نے بڑی حد تک یہ کام کر کے دکھایا ہے۔انہوں نے سبھی اصناف میں تقریباً ایک سا معیار قائم رکھا ہے۔ چنانچہ یہ کہنا مشکل ہے کہ انہیں کیا کہا جائے۔عمدہ شاعر،عمدہ افسانہ نگار،عمدہ انشائیہ نگار،عمدہ نقاد یا چاروں۔میں انہیں پانچوں کہوں گا کیونکہ ان کی ایک اور بڑی خصوصیت میرے علم کے مطابق یہ ہے کہ وہ ایک بہت اچھے انسان ہیں۔اور یہ خصوصیت وہ ہے جس کے بغیر وہ باقی چاروں میں سے ایک بھی نہ ہوتے۔

یہاں ایک بات واضح کر دوں کہ ان سے میری بالمشافہ ملاقات ابھی تک نہیں ہوئی ہے۔صرف ایک بار ٹیلیفون پر بات ہوئی۔ورنہ سب ملاقاتیں ای میل کی بدولت ہوتی ہیں۔لہٰذا ان کی شخصیت کے کئی گوشے ایسے ہوسکتے ہیں جو ابھی میرے علم سے باہر ہیں۔ ہاں یاد آیا۔انٹرنیٹ کی بات رہ گئی۔میرے ذاتی علم کے مطابق حیدر قریشی اردو کے واحد سنجیدہ ادیب ہیں جو انٹرنیٹ پر سب سے زیادہ موجود ہیں۔ان کا معیاری جریدہ ’جدید ادب‘ بھی اردو کا واحد ادبی رسالہ ہے جو کاغذ پر چھپنے کے ساتھ ساتھ پورے کا پورا انٹرنیٹ پر دستیاب ہے۔جدید ادب پہلے دو مرتبہ پاکستان میں چھپ کر بند ہو چکا ہے اور اب جرمنی سے شائع ہوا ہے تو نہائت پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔بلکہ پہلے تو صرف کاغذ پر ہی چھپتا تھا اب آپ اسے انٹرنیٹ پر بھی پڑھ سکتے ہیں۔لطف یہ کہ حضرت نے اچھے خاصے ضخیم رسالے کی قیمت بھی کچھ نہیں رکھی۔مفت تقسیم شروع کر دی۔ایک تو اردو والوں کو ادب پڑھنے کی عادت نہیں ہے۔اس پر مفت کا ادب!لوگ شک کرنے لگے کہ کہیں القاعدہ یا امریکہ تو اس کے پیچھے نہیں ہے جو ہمیں مفت میں ادب پڑھوا کر ہماری عادتیں خراب کرنا چاہتا ہو۔آخر ہیں تو دونوں ایک ہی سکّے کے دو رخ۔

تنگ آ کر کچھ لوگوں نے ان کی منّت سماجت کی اور ہاتھ پیر جوڑے کہ بندۂ خدا کچھ تو رسالے کی قیمت رکھ دو۔چنانچہ حالیہ شمارے سے لوگوں کی یہ پُرزور درخواست منظور کرتے ہوئے انہوں نے ازراہِ عنایت

اس کی قیمت مقرر کر دی ہے ورنہ وہ تو اگلے شمارے سے ایک ’جدید ادب‘ بلا قیمت قبول کرنے والے کو ساتھ میں ایک ’جدید ادب‘ مفت دینے کا ارادہ کئے بیٹھے تھے۔اس طرح اردو کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ ہے جب کسی اردو رسالے نے پبلک کی پرزور فرمائش پر مجبوراً اپنی قیمت طے کی ہے۔ادب کے رسیا اور لوگ بھی ہیں۔ادبی جریدے شائع کرنے کی خالص خسارے والی ادبی خدمت اور بھی کئی لوگ کر رہے ہیں۔لیکن اکثر معاملوں میں یہ خدمت ادب کی بجائے اپنی ذاتی شخصیت کو چمکانے کے لئے زیادہ ہوتی ہے۔ایسے حضرات کے ادبی جریدے ان کی اپنی شاعری،اپنی نثر اور اپنی تصویر سے شروع ہوتے ہیں اور اپنی تعریف میں لکھے گئے مضامین و مراسلات پر ختم ہو جاتے ہیں۔البتّہ بیچ میں جگہ بچے تو اپنے گروپ کے لوگوں کی بھی کچھ تخلیقات شائع کر دی جاتی ہیں۔اللہ اللہ خیر صلّا۔اس کے برعکس جدید ادب کے تازہ شمارے میں ۵۰ سے زائد ادیبوں کی ۱۰۰ سے زائد نگارشات کے بیچ حیدر بھائی کے صرف دو مضمون ہیں۔اور وہ بھی میراجی اور جوگندر پال کے بارے میں۔آپ ہی بتایئے ایسے شخص کو فنافی الادب نہ کہیں تو کیا کہیں۔

حیدر بھائی کی زندگی میں انٹرنیٹ کا ، بلکہ خود انٹرنیٹ کی زندگی میں حیدر بھائی کا اتنا عمل دخل ہو گیا ہے کہ جس اردو سائٹ پر جایئے وہاں وہ کسی نہ کسی روپ میں مل جائیں گے۔سنا ہے گھر میں ان کا زیادہ تر وقت کمپیوٹر کے ساتھ ہی گزرتا ہے۔یہاں تک کہ ان کی بیگم نے اسے اپنی سوت مان لیا ہے،اور بے چاری ہر دم بس کمپیوٹر کو ان سے خلع دلانے کی شرعی تدبیریں سوچتی رہتی ہیں۔میں نے جب بھی حیدر بھائی کو ای میل کیا اس کا جواب فوراً لَوٹتے ای میل سے پایا ہے۔کئی بار پریشان ہوتا ہوں،کوئی الجھن آتی ہے تو فوراً انہیں ای میل کرتا ہوں، کیونکہ مجھے یقین رہتا ہے کہ وہ فوراً جواب دیں گے۔جب کہ اپنے بیوی بچوں سے مشورہ لینے کے لئے مجھے ان کے کچن ورک اور ہوم ورک کے ختم ہونے تک انتظار کرنا پڑتا ہے۔کہتے ہیں کہ کھانا بھی وہ کمپیوٹر کے پاس بیٹھ کر کھاتے ہیں۔کئی بار مجھے ان کے ای میل کے ساتھ بریانی اور شامی کباب کی خوشبو آ چکی ہے۔واقعی،یقین کیجئے۔

آج کل شاعری اور مضمون نگاری وہ کمپیوٹر پر ہی کرتے ہیں۔لہٰذا اگر ان کا کمپیوٹر بھی ادب شناس اور ادیب مزاج ہو گیا ہو تو کچھ عجب نہیں۔اس کا شبہ مجھے اس لئے ہے کہ خود میرا کمپیوٹر بھی خاصا ادب فہم ہو گیا ہے۔اس کا پتہ مجھے تب چلا جب ایک روز میں اس پر ایک غزل فی البدیہہ ٹائپ کرنے لگا۔جیسے ہی مطلع کہہ کر سیو (save) کرنا چاہا فوراً سسٹم ہینگ (hang) ہو گیا۔بعد میں معلوم ہوا کہ مطلع نہ صرف دولخت تھا بلکہ دوسرے مصرعے کی ردیف بھی گر رہی تھی اور کمپیوٹر کو ہرگز ایسی شاعری گوارا نہ تھی۔اس حساب سے حیدر بھائی کا کمپیوٹر اور بھی زود فہم اور زود حس ہونا چاہئے کیونکہ ان کی تحریروں میں جو صفائی،جو کساوٹ،جامعیت اور دردمندی وشائستگی میں نے پائی ہے وہ ان کی عمر کے کسی اور ادیب یا نقاد کے یہاں کم از کم مجھے تو نہیں دکھائی دیتی۔جو ادیب خود کو زیادہ پڑھا لکھا دکھانا چاہتے ہیں وہ قصداً ادق الفاظ والی ایسی پُرپیچ اور علامتی انداز کی زبان بولنے لگتے ہیں جس سے سننے والے کی کچھ

سمجھ میں نہ آئے اوران کی نیم حکیمی پر ایک حکیمانہ پردہ پڑا رہے۔لیکن حیدر بھائی کی جوتحریر بھی میں پڑھتا ہوں وہ نہ صرف صاف سمجھ میں آجاتی ہے بلکہ اس سے وہی سمجھ میں آتا ہے جو وہ کہنا چاہتے ہیں۔یہ نہیں کہ وہ کہہ رہے ہیں ایران کی اور ہم سمجھ رہے ہیں طوران کی۔یہ دوٹوک پن ادب میں میرے خیال سے بڑے کام کی چیز ہے۔

یہاں جی چاہتا ہے کہ ان کی تحریروں،نظموں اور غزلوں وغیرہ سے اپنی پسند کے کچھ حوالے بھی ان کے کمالِ فن کے ثبوت کے طور پر پیش کردوں۔مگر پھر خیال آتا ہے کہ اس سے مضمون کوخواہ مخواہ طوالت دینے کے سوا کوئی اور مقصد ظاہر نہیں ہوگا۔اس لئے فی الحال یہ ارادہ ترک کرتا ہوں۔ویسے بھی میں نے تازہ تازہ ان کی کلّیات پڑھی ہے۔اوراس میں اتنی ساری چیزیں مجھے پسند آئی ہیں کہ وہ مل کر تقریباً کلّیات کے ہی سائز کی ہو جائیں گی۔لہٰذا قارئین ’عمرِ لا حاصل کا حاصل‘ کے ٹائٹل،فہرستِ مضامین اوراشتہارات کوچھوڑ کر باقی سبھی صفحات یہاں بطور حوالہ منسلک تصوّر فرمالیں۔اور مجھے اجازت دیں۔

لیکن واضح رہے۔ابھی یہ مضمون ادھورا ہے۔کیونکہ حیدر صاحب کو میں ابھی اتنا ہی جانتا ہوں۔مزید واقفیت اور معلومات کے بعد مضمون کا باقی حصہ بھی پیش کروں گا۔اگر چہ مجھے ابھی سے اندیشہ ہو رہا ہے کہ وہ بھی ادھورا رہ جائے گا۔خیر اللہ مالک ہے!

(بشکریہ سہ ماہی **تادیب** برطانیہ جلد:۴،شمارہ:۳۔جولائی تا ستمبر ۲۰۰۶ء)

تخلیقی ادب میں کسی نئی یا غیر معروف صنف کو رائج کرا دینا اپنے آپ میں اتنی بڑی بات ہے کہ اسے تاریخ ہمیشہ ایک ادبی واقعے کے طور پر یاد رکھتی ہے۔آزاد غزل کو متعارف کرانے میں جتنا مظہر امام کو یاد رکھا جائے گا شائد اس سے کہیں زیادہ ’ماہیے‘ کو پھر سے رواج اور قبولیت دلانے کے لیے حیدر قریشی کی یاد آئے گی۔کتنی حیرت کی بات ہے کہ پچھلے کئی عشروں سے جرمنی میں خاموشی،مگر نہایت سرگرمی سے ادب کی تخلیق و ترویج میں مصروف یہ فنکار صرف ماہیے ہی نہیں لکھ رہا ہے بلکہ اس نے غزل،نظم،افسانے،انشائیے،خاکے اور سفرنامے لکھنے اور تنقید وتحقیق کے شعبے میں بھی اپنی موجودگی کا احساس دلایا ہے۔ایسے قلم کار کی ادبی قدر و قیمت اور تخلیقی جہات کا اندازہ لگانے کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ اسے اور قریب سے دیکھا اور دکھایا جائے۔

نصرت ظہیر مدیر ادب ساز دہلی۔شمارہ نمبر ۶۔۷،جنوری تا جون ۲۰۰۸ء۔

اردوستان میں آپ کا خبر نامہ نظر آیا،اچھا تھا۔۔۔آپ کی سوچ اور باتوں میں بڑا توازن ملتا ہے،جس سے میں بھی کئی باتیں سیکھ رہا ہوں۔ **نصرت ظہیر** حیدر قریشی کی کتاب **خبر نامہ** کے فلیپ سے

عبداللہ جاوید۔کینیڈا

”عمرِ لا حاصل کا حاصل“ میں شامل افسانے

حیدر قریشی کے افسانوں کی اوّلین خوبی یا خصوصیت یہ ہے کہ وہ افسانوں کے معیار پر پورے اترتے ہیں (علامتی ہونے کے باوجود) اور وہ معیار یہی ہے کہ افسانہ قاری کی توجہ کو اپنی گرفت میں لے اور افسانے کے اختتام تک پکڑے رکھے۔البتہ ایک اچھا افسانہ نگار اپنے افسانے کے اختتام کے بعد،بہت بعد تک۔بعض اوقات ہفتوں،مہینوں اور برسوں کسی نہ کسی انداز میں قاری سے جڑا رہتا ہے۔حیدر قریشی کا قاری افسانے کا ہی نہیں بلکہ حیدر قریشی کا ہو جاتا ہے اور پڑھتے سے تو لازمی طور پر۔اگر حیدر قریشی کے افسانوں کو علامتی افسانوں کے خانے میں رکھا جائے تو اس خانے کے کتنے افسانہ نگاروں کے کتنے افسانے اس معیار پر پورے اترتے نظر آئیں گے؟ گنتی کے چند۔کسی کسی افسانہ نگار کا کوئی افسانہ۔بہت ممکن ہے علامتی افسانہ ہونے کے باوجود افسانوی ادب کا شاہ کار تسلیم کیا جا چکا ہو لیکن حیدر قریشی وہ واحد افسانہ نگار ہے جس کا قریب قریب ہر افسانہ،افسانے کی صنف کی متذکرہ خصوصیت کا حامل نظر آتا ہے۔علامتی افسانہ (تحریک کی صورت میں) ہمارے ادب میں اس طرح آیا جیسے تیز ہوا کا جھونکا۔بیشتر افسانہ نگاروں نے اسے باہر کی چیز جان کر لیا اور باہر کی چیز کے طور پر پیش بھی کیا نہ تو اس کے فارم کو اپنا بنایا اور نہ ہی اپنی چیز کے طور پر اسے برتا۔مجھے اس حقیقت سے انکار نہیں کہ اردو کو چند ایک کامیاب علامتی افسانے ضرور ملے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تحریک سے ہٹ کر بھی چند علامتی افسانے بلکہ اعلیٰ افسانے بھی مل جاتے ہیں۔پریم چند کے ’کفن‘ کرشن چندر کے ’غالیچہ‘ منٹو کے پھندنے،عصمت کے ’لحاف‘ غلام عباس کے ’آنندی‘ عسکری کے ’چائے کی پیالی‘ بیدی کے ’اک چادر میلی سی‘ اشفاق احمد کے ’گڈریا‘ کو ہم ایسے افسانوں میں شمار کر سکتے ہیں۔تحریک سے جڑے افسانوں میں البتہ فرائیڈین‘ یونگین‘ کر کیگارڈین،یا کافکائی عناصر کچھ زیادہ واضح صورت میں موجود ملتے ہیں۔علامتی افسانے کی تحریک ختم نہیں ہوئی اور نہ ہو سکتی ہے کیونکہ علامت شعر و ادب کی جان ہے بقول برک (Burke) ہر فن پارہ ممکنہ طور پر علامتی عمل کی شکل ہو سکتا ہے۔“ کولرج Coleridge کے خیال میں فن کار علامتوں کا تخلیق کار (خالق) ہوتا ہے۔یوں بھی ہمیں یہ فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ لفظ ایک علامت یا ایک سے زائد علامات پر مبنی ہوتا ہے۔لفظ تو رہا ایک طرف حرف بھی علامت کے سوا کچھ نہیں۔علامتی افسانے کی تحریک کے آخری دنوں میں ایک اور تحریک ہمارے افسانوی ادب میں دبے پاؤں داخل ہوئی اور الٹے قدموں لوٹ گئی۔اس تحریک کو ”اکہانی“ (نواسٹوری) کا نام دیا گیا تھا۔اس کی شانِ نزول غالباً یہ کہی جائے کہ جب علامتی

افسانے اس طرح کے لکھے جانے لگے کہ افسانے سے افسانوی عنصر رخصت ہو گیا۔تو اس کے نتیجے میں کہانی سے یکسر انحراف کی شکل ’اُ کہانی‘ (نو اسٹوری) کا جنم ہوا۔ بات حیدر قریشی کے افسانوں کی ہو رہی تھی اور میں اپنے پڑھنے والوں کو ساتھ لے کر یہ سوچ رہا تھا کہ حیدر قریشی کا افسانہ علامتی ہونے کے باوجود اس خصوصیت کا حامل ہے کہ قاری کی توجہ کو اپنی گرفت سے نکلنے نہ دے اس نے علامتی افسانے کی افراط وتفریط سے اپنا دامن بچائے رکھا۔شکر ہے اس نے ’اکہانی‘ (نو اسٹوری) کو آزمانے کا خیال نہیں کیا۔

افسانے کی دوسری خصوصیت اس کا پڑھنے کے لائق (Readable) ہونا ہے۔حیدر قریشی کا ہر ’’افسانہ‘‘ پڑھنے کے لائق ہوتا ہے۔اس کا پڑھنا گراں نہیں گزرتا۔ یہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ ہم افسانہ پڑھ رہے ہیں کیونکہ ہم افسانہ پڑھتے نہیں بلکہ افسانے میں سے ہو کر گزرتے ہیں یا افسانے کو اپنے اندر سے گزارتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ہم افسانہ نہیں پڑھتے بلکہ افسانے کے تجربے سے گزرتے ہیں‘۔عمر لا حاصل کا حاصل‘ کے افسانے حیدر قریشی کی زندگی کے متنوع تجربات کا ’ما حاصل‘ ہیں اور اپنے قاری کو اس ’ما حاصل‘ سے گزارتے ہیں۔ پہلا افسانہ ’میں انتظار کرتا ہوں‘ جس کا ترجمہ 'And I wait' کے عنوان سے اسی ٹائٹل کے تحت چھپی ہوئی انگریزی کتاب میں موجود ہے۔عنوان کے واسطے سے میرا ذہن ملٹن کی نظم ’آن ہِز بلینڈنس‘ کی جانب رجوع ہوتا ہے جس کے اختتامی مصرعوں میں ملٹن کہتا ہے:

"They also serve
Who stand and wait!"

حیدر قریشی کی کہانی اس سے کوئی مطابقت نہیں رکھتی اور ہونا بھی یہی چاہیے تھا۔میں نے ’عمر لا حاصل کا حاصل‘ کے حیدر قریشی کو حرکت سے عبارت پایا۔ وہ رکنے یا ٹکنے والا بندہ بالکل نہیں لگتا۔ چنانچہ ’میں انتظار کرتا ہوں‘ ایک ایسی کہانی ہے جس میں مناظر جلدی جلدی بدلتے ہیں اور ہزاروں برسوں کی زمانی قدر کے ساتھ ملکوں ملکوں کی مسافتوں پر مشتمل مکانی قدر پر محیط ہیں۔ یہ مناظر قدیم اساطیر، آسمانی صحائف، قدیم قصائص اور گزری ہوئی تہذیبوں سے متعلق ہیں۔اس افسانے میں مکان وزماں کے ساتھ جو رویہ ملتا ہے وہ حیدر قریشی کی انفرادیت کا بھی ضامن ہے۔ یہاں انتظار حسین کی مثال پیش کرنے کی اجازت دیجئیے۔انتظار حسین اساطیر، قدیم تاریخ، تہذیب و ثقافت کی اپنے افسانے میں پیوند کاری کرتے ہیں جو بعض اوقات دکھائی دینے لگتی ہے لیکن ان کے قلم کا جادو پورے افسانے کو ایک کامل اکائی کا روپ دے کر غیر محسوس بنا دیتا ہے۔حیدر قریشی پیوند کاری نہیں کرتا، شجر کاری کرتا ہے۔ وہ قلم نہیں لگاتا بلکہ اُگاتا ہے۔ زیر نظر افسانے ’میں انتظار کرتا ہوں‘ کی پیشانی پر وہ اپنا شعر درج کرتا ہے۔ ؎

خزاں رسیدہ سہی پھر بھی میں اگر چاہوں　　　جہاں نگاہ کروں اک نئی بہار اُگے

اس شعر میں اگانے کا استعارہ استعمال ہوا ہے جو میرے متذکرہ خیال کو تقویت دے رہا ہے۔

حیدر قریشی کے نظریہ وقت پر بات کرتے ہوئے میں اس حقیقت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں کہ اس نے اپنے زیر مطالعہ

افسانے میں ’مکان وزماں‘ کو آگے پیچھے ہچکولے دے کر ’لا مکاں و لا زماں‘ کی جانب دھکیل دیا ہے۔ یہ صورت حال اس افسانے تک محدود نہیں ہے۔اس کے بیشتر افسانوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔تھامس ایکو نیاس نے خوب کہا ہے۔’’خدا وقت کو نہیں دیکھتا‘‘

حیدر قریشی کی اس ٹیکنیک کے بارے میں یہ کہنا غلط ہو گا کہ انتظار حسین سے تھوڑی بہت مماثل ہے اور نہ ہی اس کو شعور کی رَو سے جوڑا جا سکتا ہے۔ میں نے اس افسانے کو ’’تجرید و تجسیم‘‘ کے باہمی ردو بدل کی آماج گاہ پایا۔ یہ بھی ایک ایسی خصوصیت ہے کہ جو دوسرے افسانوں میں بھی موجود ہے۔اس ردو بدل کے علاوہ کسی کسی افسانے میں (زیر نظر افسانے کے علاوہ بھی) شخصیات اور کردار بھی باہم مبدل دکھائی دیتے ہیں۔ یا بے حد گڈ مڈ ملتے ہیں۔ ’میں انتظار کرتا ہوں‘ ‘میں حضرت اسمٰعیلؑ، حضرت یوسفؑ، سری رام اور بے شمار دوسرے کردار قاری کو حیران کر دیتے ہیں۔ یہ فہرست طویل تر ہو سکتی تھی۔ان افسانوں میں بھی جو حقیقت نگاری کے مزاج کے حامل ہیں وہ صنعت موجود ہے جس کو مغرب کے نقادوں نے (Extended metaphor) وسعت یافتہ استعارے کا نام دیا ہے۔ یہاں میں یہ بھی کہوں گا کہ حیدر قریشی نے رمزیہ استعارے سے بھی کام لیا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ اپنے چاروں اور پھیلی ہوئی زندگی کو اپنی بصیرت (وژن) کی گرفت میں لے کر پڑھنے والوں کی خاطر کاغذ پر اتار دیا ہے۔اس کی ساری تعجب خیزی، اسرار اور رمزیت کے ساتھ زندگی کی سطحیت، عمومیت اور بے معنویت کو بھی پیش نظر رکھتے ہوئے۔ معمولی میں غیر معمولی، غیر معمولی میں معمولی کو دیکھنا اور دکھانا حیدر قریشی کی افسانہ نگاری کا امتیاز ہے۔ مشاہدہ حیات کی بات چل نکلی ہے تو اس پر بھی بات کر لیتے ہیں کہ حیدر قریشی کی نظر کسی بھی چیز کے ظاہر پر بھی ہوتی ہے اور باطن پر بھی اور وہ بیک وقت ظاہر و باطن کا تقابلی مشاہدہ کرنے والا افسانہ نگار ہے۔اس کی اس عادت نے اس کو طنز کی صلاحیت سے نواز دیا ہے۔اس ضمن میں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ طنز کا عنصر وہ پیدا نہیں کرتا۔طنز تو زندگی اسے دیتی ہے اور وہ اس میں نمک مرچ کا اضافہ کئے بغیر جوں کا توں پیش کر دیتا ہے۔اس کے ہاں طنز کا مشاہدہ کرنا ہو تو آپ کو ’دھند کا سفر‘ پڑھنا چاہیے۔ بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ حیدر قریشی کا افسانہ طنز کے تانے بانے سے تیار شدہ لگتا ہے۔ یہ اور بات کہ طنز افسانے پر مسلط کی ہوئی نہیں لگتی۔اس کو افسانے سے الگ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ حیدر قریشی کے چند افسانوں میں وہ موضوع بھی جزیاتی طور پر ملتا ہے جس کو مغربی ادب میں ’مابعدِ ہیروشیما‘ کی اصطلاح کے تحت رکھا گیا ہے۔البتہ اس کو برتنے کا انداز انفرادی ہے تقلیدی یا اکتسابی نہیں۔

’میں انتظار کرتا ہوں‘ کا انجام غیر متوقع ہے۔

’’میں آگ کے مکمل طور بجھنے کا انتظار کرتا ہوں۔ میں انتظار کرتا ہوں جب تھوڑی دیر بعد میرے سارے سوتیلے عزیز مجرموں کی طرح میرے سامنے پیش ہوں گے اور میں اس وقت کے آنے سے پہلے ہی اپنا فیصلہ لکھنے بیٹھ جاتا ہوں۔لا تثریب علیکم الیوم‘‘

حیدر قریشی کا قریب قریب ہر افسانہ اسی طرح کے قطعی غیر متوقع انجام کا حامل ہوتا ہے۔ یوں ان کی سعادت حسن منٹو سے مماثلت نکل آتی ہے۔

’گلاب شہزادے کی کہانی‘ جو روایتی ’چہار درویش‘ کے قصے سے اُ گائی گئی ہے۔ذاتی طور پر مجھے پسند ہے۔اس میں بقول کیون بروک (Kevin Brockmeier) یہ کہانی ایک سابقہ کہانی سے نمو پاتی ہے۔اس سبب سے وہ جو رویہ ماحول،صورتِ حال اور کرداروں سے اختیار کرتی ہے۔ بڑی حد تک قابلِ فہم لگنے لگتا ہے۔ یہ بات کیون نے ایڈورڈ پی جونس (Edward P.Jones) کی مشہور کہانی ’’اولڈ بوائز‘ اولڈ گرلس‘‘ پر تبصرے کے دوران لکھی تھی۔اس کہانی (گلاب شہزادے کی) میں پہلا درویش اپنی کہانی کو موخر کر دیتا ہے اور باری باری باقی درویش اپنی اپنی کہانی سناتے،پانی پیتے اور موت سے ہم کنار ہوتے جاتے ہیں۔چوتھا درویش جو درحقیقت پہلا درویش ہوتا ہے پانی کو تیل سمجھ بیٹھتا ہے۔ایٹمی جنگ کے بعد کی دنیا پر حکمرانی کے خواب دیکھتے ہوئے،پانی کو پانی کے بجائے تیل خیال کر کے پیاسا مر جاتا ہے۔اس کہانی میں گلاب کی اس قلم کا بھی ایک کردار ہے جس کو پہلا درویش لگاتا ہے۔اس میں کھلنے والا سرخ پھول ہر مرتبہ ایک نئی معنویت لے کر آتا ہے۔اس کے علاوہ ہر درویش کی موت کو پانی سے جوڑ کر اور پہلے درویش کی موت کو پانی کے ساتھ تیل سے گڈ مڈ کر کے حیدر قریشی نے پانی کے استعارے کو رمز سے مملو کر دیا ہے۔

’دھند کا سفر‘ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے طنزیہ افسانہ ہے۔اگر آپ سے صرف اس ایک کہانی کی اساس پر اس کے مصنف کے بارے میں پوچھا جائے تو آپ یہی کہیں گے کہ اس افسانے کا مصنف طنز نگار ہے اور اس افسانے میں اس کی طنز نگاری عروج پر ہے۔حیدر قریشی کی طنز کے بارے میں اس سے قبل جو عرض کر چکا ہوں وہ سب کا سب ’دھند کا سفر‘ میں دیکھا جا سکتا ہے۔طنز کے علاوہ اس افسانے میں ’دھند،سفر،غصہ،گالیاں،گالیوں کا بتدریج باقی قوم تک بہاؤ، یک چشم داڑھی والا،ٹرین کو روکنے کے لیے کھینچنے والی زنجیر اور اس کے نیچے لکھی ہوئی انتباہی تحریر سب کچھ علامتی بھی ہے اور حقیقی بھی۔اس طرح کہانی واقعیت کی زبان میں بھی بات کرتی ہے اور استعارے کی زبان میں بھی۔اس کا کلی تاثر لایعنیت کی طرف جھکاؤ رکھتا ہے۔یوں اس کے اندر جدیدیت کے ساتھ ’مابعد جدیدیت‘ بھی سما جاتی ہے۔’مابعد جدیدیت کو آپ کوئی زمانی نسبت نہیں دے سکتے۔وہ جدیدیت کے ساتھ جڑی ہے اور انیسویں صدی سے اکیسویں صدی میں داخل ہو رہی ہے۔میرے ناچیز خیال میں جدیدیت کے خاتمے اور ما بعد جدیدیت کے آغاز کا نظریہ کسی اعتبار کا حامل نہیں ہے۔اس مرحلے پر یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ ہمارے شعر و ادب میں علامت کے جو عناصر پہلے سے چلے آ رہے تھے علامت کی تحریک کے دوران اور علامت کی تحریک کے خاتمے کے بعد بھی زندہ سلامت رہے۔علامت کی تحریک کی آمد و رفت نے ان کا کچھ نہیں بگاڑا۔یوں بھی علامت کا ختم ہونا اس طرح عمل میں نہیں آیا جیسے کسی نے جھاڑو پھیر دی۔شعر و ادب میں کسی بھی تحریک کا مکمل خاتمہ ہوتا ہی نہیں۔علامت ہی کو لیجیے۔افسانوی ادب سے تو اس کا زور ٹوٹا لیکن شاعری اور خاص طور پر جدید نظم میں اس کا سکہ آج بھی چلتا ہے۔

اس سے قبل ایک بظاہر گنجلک سی بات لکھی تھی۔’’اس رد و بدل کے علاوہ کسی کسی افسانے میں (زیر نظر افسانے کے علاوہ بھی) شخصیات اور کردار بھی باہم مبدل دکھائی دیتے ہیں۔یا بے حد گڈ مڈ ملتے ہیں۔‘‘اس مرحلے پر افسانہ ’میں

انتظار کرتا ہوں‘ سے مثالیں پیش کی تھیں۔افسانہ ’آپ بیتی‘ سے ایک اقتباس دیکھیے۔

’’اس وقت رات کے آٹھ بجے ہیں اور میں نے لیٹے ہی لیٹے بائیں طرف کروٹ بدل کر خیال ہی خیال میں اس خوبصورت لڑکی کو اپنے پہلو میں سلا لیا ہے۔میری سانسوں کی رفتار تیز ہو گئی ہے اور میں اس وقت جب میں کلائمکس پر پہنچنے لگا ہوں میں نے اس کا چہرا اپنے ہاتھوں میں تھام کر اس کے ہونٹوں کا بھرپور بوسہ لینا چاہا مگر مجھے جیسے ایک دم کرنٹ لگ گیا ہے۔میرے ہاتھوں میں جو چہرا ہے وہ ہو بہو میری بیٹی کا ہے۔میری ننھی بچی جیسے ایک دم جوان ہو کر میرے ساتھ لیٹی ہو۔‘‘

آپ نے دیکھا دعوت عیش دینے والی لڑکی مبدل ہو رہی ہے بیٹی سے۔اسی افسانے سے ایک اور اقتباس دیکھئے۔

’’وہ خوب صورت لڑکی میرے پہلو میں آ گئی ہے۔۔ یہ چہرا میری بیوی کا ہے۔مجھے پھر کرنٹ لگتا ہے۔میں نے اپنے آپ کو دیکھا تو میری جگہ کوئی اور تھا۔‘‘

افسانہ ’آپ بیتی‘ آویزش اور کشمکش کا افسانہ ہے۔اس افسانے کو بلا تامل کسی پس و پیش کے بغیر منٹو کے دائرہ عمل کے اندر رکھ کر دیکھوں گا لیکن آپ یہ سوال نہ کر بیٹھیں آیا یہ فرائیڈین ہے یا یونگین۔

افراد اور شخصیات کے مبدل ہونے کی صورت (تصوف کے رنگ میں) ان کی ’’ایک کافر کہانی‘‘ میں بھی ملتی ہے۔اس کہانی کے بارے میں یہ عرض کروں گا کہ بظاہر بزرگانِ دین اور صوفیائے کرام کے واقعات پر مبنی یا ان سے ماخوذ معمول کی کہانی اور معمول کے سوال اٹھانے والی اس تحریر کو ایک تکونے چہرے والے اسٹین گن بردار کے ذکر سے ٹوئسٹ کر کے غیر معمولی بنا دیا گیا ہے میں نے غالباً پہلے بھی یہ عرض کیا ہے کہ غیر معمولی کو معمولی اور معمولی کو غیر معمولی بنانا حیدر قریشی کا فن ہے۔’روشنی کی بشارت‘ ایک طاقت سے بھرپور افسانہ ہے۔ذہن اور قلم کی تخلیقی توانائیوں کا مظہر۔اس کو ایک سے زائد مرتبہ پڑھنے سے اس کے رمز آشکار ہوتے ہیں۔جہاں تک ٹیکنیک کا تعلق ہے اس میں بہت کچھ وہی ہے جس پر میں آغاز میں بات کر چکا ہوں۔خاص طور پر وقت کے ساتھ برتاؤ یعنی مکان و زماں کو آگے پیچھے کرتے رہنا اور لا مکاں و لا زماں کی جانب دھکیل دینا۔اس افسانے کے مرکزی کردار کے چند فقرے ملاحظہ کیجئے۔

’’میں بہت پہلے آ گیا ہوں میرا تعلق مستقبل سے ہے۔‘‘

’’میں اپنے وقت سے سولہ سو برس پہلے آ گیا ہوں‘‘

’’مجھے یاد آتا ہے اس سے پہلے ایک دفعہ میں اپنے وقت سے پچاس برس پہلے آیا تھا اور جب پچاس برس بعد میں دوبارہ آیا تھا تو میں نے یہ دیکھا تھا کہ میں اپنے وقت سے ایک صدی پہلے آ گیا ہوں۔پھر جب میں ایک صدی بعد آیا تو میری آمد اپنے وقت سے دو سو سال پہلے تھی۔۔۔۔اور اب جب میں آٹھ سو سال بعد آیا ہوں تو مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میں اپنے وقت سے سولہ سو سال پہلے آ گیا ہوں۔‘‘

میں نے حیدر قریشی کے افسانے جستہ جستہ پڑھے ہیں۔’عمر لا حاصل کا حاصل‘ میں درج شدہ سارے افسانے پڑھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ انہوں نے اردو افسانے کی مروجہ حدوں کو پار کرنے کی ہمت جتائی ہے

۔اس سے قبل ہمت، جسارت اور بغاوت کے القاب ان افسانہ نگاروں کے لیے استعمال کیے جاتے رہے ہیں جو روایتی موضوعِ ممنوعہ یعنی جنس کو اپناتے تھے۔جنس کے بعد سیاسی اور مزاحمتی موضوعات کا معاملہ آتا ہے۔حیدر قریشی ان موضوعات کے دلدادہ نکلے جو مجذوبوں کو ساجتے ہیں۔ وہ ایسے سوالات کے جوابات کے متلاشی معلوم ہوتے ہیں جو قریب قریب لا جواب ٹھہرائے جاتے رہے ہیں۔ یہ بڑا کام ہے اور شاید اسی سبب سے ان کے مختصر لیکن 'بڑے افسانے' قاری کا تعاقب کرتے رہتے ہیں۔آخری سطر پڑھنے پر بھی جان نہیں چھوڑتے سوچنے پر مائل اور دہرانے پر مجبور کرتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ حیدر قریشی کا افسانہ پڑھنا ایسا ہی ہے جیسے ذاتی زندگی کے کسی تجربے سے گزرنا۔ایسے تجربے سے جو سوچ، کشف اور بشارت سے عبارت ہے۔

☆☆☆☆☆

''جب میں چلنے کو تھا، آپ یعنی حیدر قریشی ''جسم اور روح'' پر بزبان تحریر بات کرتے مل گئے۔موضوع میرا اپنا خاص اور بولنے والا اپنا خاص (جو بھی بھلا لگا وہ بڑی دیر سے ملا)، رُکنا ہی پڑا۔ یہ کیسا اسلوبِ بیان ہے کہ بات سے بات جُڑی ہوئی چل رہی ہے، کبھی خراماں خراماں، کبھی رواں، دواں، کبھی بہہ رہی ہے موج در موج، سیل در سیل، جیسے ہوا۔اصل موضوع کا یہ حال کہ چلتے چلتے، بہتے بہتے بالکل غائب اور پھر غیر محسوس طریقے سے دوسری باتوں کے درمیان ایک بار پھر نمودار۔۔خیال، فکر، احساس، ادراک، اپنے طور پر ہر قسم کی قید و بند سے آزاد جیسے سب اپنے طور پر اپنے اپنے کاموں میں مصروف، باہم آمیز ہو کر بھی اور جدا جدا بھی ایک غیر محسوس اسلوب کے بنتّوں (ٹکسچر) میں بندھے ہوئے۔بظاہر دھاگے الجھے الجھے اِدھر اُدھر نکلتے ہوئے اور پھر خود بخود جُڑتے ہوئے، جیسے کبھی اُدھڑے ہی نہ تھے۔عرفانِ روح کے مذہب کے راستے کے علاوہ دوسرے راستوں کی نشاندہی نے مضمون کے دامن کو زیادہ معنی خیز بنا دیا لیکن موضوع کو تشنہ رہنا تھا، سو رہا۔اصل لطف تو طفلانہ معسومیت، حیرانی اور تجسس کی تحت موجی نے دیا جو مجھ سے کم مایہ قاری سے بھی چھپی نہ رہ سکی۔باتوں کا سلسلہ اس دوران آپ کی تحریر ''اپنے وقت سے تھوڑا پہلے'' کی سرحد میں داخل ہو چکا ہے۔جسم اور روح سے بھی زیادہ گھمبیر اور گہرے معاملے سے ہم اور آپ دوچار ہیں لیکن لفظیات کا تانا بانا قطعی مختلف ہے۔حیران کن۔۔عجیب طرح کا ہلکا پھلکا پن، ایک مکمل سپردگی، ایک کامل تسلیم و رضا بلکہ راضی بہ رضا والی کیفیت کی فضا میں ایقان کو چھونے والا یہ احساس کہ انسان کی مساعی ہی قدرت کی پراسرار قوتوں کو مشکل کشائی، تعاون اور سرپرستی کی جانب راغب کرتی ہے۔ لاٹری۔۔نوجوان، رقم سے معمور سوٹ کیس، پولیس۔۔درمیان میں آپ پولیس کے نرغے میں۔۔ٹرین سے چھوٹے بیٹے کا اترنا۔۔تبدیلیٔ شخصیت و شناخت۔۔پراسرار معاملات۔کشف کے، وجدان کے، جذب کے، ماہیت قلبی کے، جیسے کوئی شمسؔ تبریز کسی جلال الدین رومی کو قیل و قال کی پستی سے مرتبۂ حال کی بلندیوں پر لے جا رہا ہو۔''

(اقتباس از مکتوب **عبداللہ جاوید**

مطبوعہ **جدید ادب** جرمنی شمارہ نمبر ۱۱۔جولائی تا دسمبر ۲۰۰۸ء۔ص ۲۶۷،۲۶۸)

Urdu Literature: His life's work

By Sohail Ahmed Siddiqui

Daily Dawn Sunday, 06 Dec, 2009

He bows to his wife and says:

استعارے تو کجا سامنے اس کے حیدر   شاعری ایک طرف اپنی دھری رہتی ہے

Not just metaphors, the entire poetry of mine
Is set aside when she is present

This is a somewhat unusual dedication of Sulagtay Khaab, the first collection of ghazals by Haider Qureshi, an active exponent of Urdu literature living in Germany.The 54-year old poet has published five anthologies of ghazals, nazm, and mahiya. His two collections of short stories, two collections of pen sketches, one book of inshaiya (light essays) and a travelogue of his pilgrimage to Makkah are ample proof of his being a prolific writer. Eleven of his books along with some other writings have recently been gathered included in a literary journal titled Umre-La'haasil ka Haasil (The outcome of futile life),. Haider Qureshi was born on January 13, 1952 in Chenab Nagar, Punjab. The Seraiki-speaking poet's favourite subject in school was Urdu. His maternal uncle, Habibullah Sadique, is also a poet and while growing up Qureshi was greatly impressed by his melodious voice.By the time he was a student of class IX, Qureshi started writing his own verses.

Soon after matriculation in 1968 he wrote his first romantic story. At the time he was also working at a sugar mill.Later he earned a Masters degree in Urdu. He wrote his first ghazal in 1971 which appeared in Weekly, Lahore, some time in 1972. He participated in his first mushaaira in 1974, under the auspices of Bazm-i-Fareed, Khan-pur.He later laid the foundation stone of Halqa-i-Arbab-i-Zauqu-i-Khanpur with Nazr Khaleeque, A.K. Majed and Jameel Mohsin.

Besides playing a dynamic role in regional literary activities he also participated actively in the Anjuman Insedaad-i-Shoara, Khanpur to unmask fake poets. He is still a deadly enemy of pseudo-poets.In 1978 he launched a literary journal called Jadeed Adab at the cost of his wife's ornaments which he sold one after another and continued the magazine until the last of the jewels went to the goldsmith.

However, he revived the journal from Germany after a lapse of several years.

A strong supporter of Urdu mahiya, Haider has gained not only friendship, but also enmity for his extraordinary efforts in the area.He is the pioneer of the mahiya on correct meter movement. To my surprise, he asked me to write an article in English on the history of Urdu mahiya.With his full support, I was able to pen an article titled Mahiya - Language of Love which was published in the daily Dawn of April 25, 2004.

Haider's poetry is a rich blend of traditional Urdu and the local lingo. In it one can find numerous examples of 'linguistic liberty'. He is perhaps the only living poet who deliberately uses an old Punjabi dialect in Urdu ghazal.

مِرے ہی خواب کنورے نہیں رہے اب تو   کہ آرزوئیں تری بھی بیاہیاں نہ گئیں

Not only my dreams are left virgin,

but your wishes too, remain unfulfilled

He believes in Roe'be-Husn, the stunning impact of beauty:

اُس سے آنکھیں چار کرنے کا کہاں ہے حوصلہ   جب وہ اپنے دھیان میں ہو تب اسے تم دیکھنا

I have no courage to look at her directly

Better gaze at her while she is lost in herself

The poet is well aware of the fact that notoriety is the fate of love:

دلوں کے کھیل میں پانسہ پلٹ کر رہ گیا کیسے   ہمیں بے نام ہونا تھا، کسی کا نام ہونا تھا

How tables have been turned in love affairs!

We had to become nobody, for someone had to become famous

The dream viewer does have a complaint too:

بھر کے آنکھوں میں سلگتے خواب اس کی یاد کے   مجھ کو سوتے میں بھی حیدر جاگتا رکھا گیا

Having filled my eyes with burning dreams of hers,

I was made awaken, even in the dreams

However, he knows very well how valuable dreams are:

آنکھ کس طرح کھلے میری کہ میں جانتا ہوں   آنکھ کھلتے ہی سبھی خواب اجڑ جاتے ہیں

How can I open my eyes, as I know that

All dreams get decayed when eyes are open

When we seek a new diction with the novel use of old and much repeated words, phrases and metaphors, Haider does not let us down. Here is just one example of his creativity:

کترائے وہ کبھی تو کبھی میں جھجک گیا   اک بھی کنول کھلا نہ حجابوں کی جھیل میں

She tried to avoid me sometime, so I showed reluctance as well

Not a single lotus bloomed in the 'lake of modesty'

The use of simple words, avoidance of complexity and creating a unique environment are praiseworthy. Be it ghazal, nazm or mahiya, the locale is visible in most of his poetry.

He is one of the few selected Urdu poets whose poetry has been translated into Arabic. An Iraqi admirer has posted a translation of one of his poems on an Iraqi website.

Short story writing is yet another form of catharsis for Haider. He mixes the ordinary narrative style with symbolic or somewhat abstract art.

One can see a galaxy of events, personal experiences and sharp observations in his two collections. Recently an Indian writer translated his short stories into English. One hopes to see the book appearing soon.

Pen sketches are a favourite pastime, as he proves his skill in it more briskly than he does in short stories.

Meri Mohabbatein, his first anthology of pen-sketches is full of lively expressions, deep observations and bittersweet memories. He openly admits his errors and blunders wherever they peep into his writing.

Through his writing, we are able to see a true picture of the late Mirza Adeeb who once

asked him to let him visit the romantic land of Cholistan and never said, 'Oh, I'm the author of Sehra Navard ke Khutoot. Don't you tell me about its magic.'

He has contributed positively to the promotion of inshaiya in Urdu. Faaslay-Qurbatein, his collection of inshaiyas is full of interesting light essays on various topics.

His careful treatment of each subject is commendable. He has also authored a book on the patron of inshaiya, Dr Wazir Agha.

Six books including a research-oriented thesis for his M.A. have been published about the works of Haider Qureshi, besides five special sections dedicated to him in esteemed literary journals. Above all, he is the greatest supporter of premier Urdu literary websites.

....

Haider Qureshi's splendid collection of short stories extends the range of contemporary Urdu writing available in English translation. Qureshi is a philosophical story teller who ranges from the Ramayana to ecological fables and reflections on the experience of immigrant workers in Germany.His is a singular voice which deserves a wider audience. These stories are thoughtful and full of interest.

Dr. Derek Littlewood, Birmingham City University

Haider Qureshi is a Person of exceptional abilitiy and mature intellect.His erudition is praiseworthy.As a creative writer, he has impressed me with the sweep of his imagination and the depth of his emotive stance.

Dr. Wazir Agha, Lahore,Pakistan

CDO_Editor: Is there any particular target market you are trying to reach, and what do you want them to get out of your work?

Haider: Mysticism has always attracted me and I am of the view that it wipes out fanaticism. I am a staunch believer in ideologies and I have been a laborer all my life. I have got a well-knit clan too and all these things are manifested in my writings. But there is one thing. I don't get carried away by castes and creeds and by mythologies and dogmas. Whatever I get from the innards of my soul I present it to the world for its perusal and this is my target. I don't get swayed, at least consciously, by the sectarian dogmas, that are holding the world-peace to ransom now a days. The truth lies in my conscious creativity.

CDO_Editor: Have you ever had writer's block and how do you overcome it?

Haider: It often happens that a lengthy stretch of time passes and nothing oozes out of my pen but being a multi-pronged writer my mind soon intervenes and doesn't allow it to last longer. If the block is for poetry I would write short stories and if it is for fiction then I take to caricatures and reportage. My creativity cannot sit idle for long. But if the block is for the creativity itself I still write this or that on matters more mundane and routine and it acts as a warm up or you can call it 'Foreplay' before a final plunge! I thank God that He has given me that much literary potentiality at least!

(From an INTERVIEW By: Omavi Ndoto (USA) Editor CDO)

حیدرقریشی بحثیت محقق ونقاد

ارشد خالد

تخلیقی حوالے سے حیدرقریشی کا کام اتنا زیادہ اور اہم ہے کہ بحثیت محقق اور نقاد ان کے کام کی طرف زیادہ دھیان نہیں جا سکا۔اگر چہ حیدرقریشی خود بھی تنقید کو تخلیق کار کے تخلیقی عمل کا ایک جزوی حصہ سمجھتے ہیں۔تاہم اس میں شک نہیں کہ دوسری اصناف ادب کی طرح اپنے تنقیدی و تحقیقی مضامین میں بھی حیدرقریشی نے اپنے مجموعی ادبی معیار کو قائم رکھا ہے۔ماہیا پر ان کی تحقیق و تنقید اب سند کا اعتبار حاصل کر چکی ہے۔وزیر آغا اور ہمت رائے شرما پر ان کی کتابیں محبت میں علمی معیار اور وقار کو قائم رکھنے کا ثبوت ہیں تو ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے سرقات کی نشاندہی کرتے ہوئے وہ مناظرہ ومجادلہ کی حالت میں بھی اپنے علمی معیار و وقار کو بدستور قائم رکھتے ہیں۔مطالعۂ کتب کے دوران ان کی تنقیدی بصیرت اور نکتہ آفرینی اپنے نتائج خود اخذ کرتی ہے۔ہرمن ہیسے کے ناول ''سدھارتھ'' کے حوالے سے اردو میں جتنے بھی نامور اور نئے لکھنے والے کوئی تبصرہ یا تذکرہ کر چکے ہیں،حیدرقریشی کے مطالعاتی مضمون میں ان سے بالکل ہٹ کر نئے انداز سے بات کی گئی ہے۔بحثیت نقاد حیدرقریشی کا سامنا کرتے ہوئے قارئین ادب انہیں روایتی سکہ بند نقادوں سے مختلف ہی نہیں پائیں گے بلکہ ان کے اندر کا تخلیق کار اپنے موضوعات کا سنجیدگی اور ایمانداری سے مطالعہ کرتا دکھائی دے گا۔امید ہے حیدرقریشی کی ادبی شخصیت کا یہ زاویہ اہلِ علم کے لیے دلچسپی کا باعث بنے گا۔

حیدر قریشی کی اب تک کی تحقیق و تنقیدکی کتب

۱۔ڈاکٹر وزیر آغا عہد ساز شخصیت ۲۔اردو ماہیے کے بانی۔ہمت رائے شرما

۳۔ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور مابعد جدیدیت ۴۔حاصلِ مطالعہ

۵۔اردو میں ماہیا نگاری ۶۔اردو ماہیے کی تحریک

۷۔اردو ماہیا (پیش لفظ) ۸۔ماہیے کے مباحث (مضامین چھپ چکے،کتب زیر ترتیب)

۹۔اردو ماہیا۔تحقیق وتنقید (ماہیا کی تحقیق وتنقید کی پانچوں کتابیں ایک جلد میں۔زیر اشاعت)

''حاصلِ مطالعہ'' کے ''ابتدائیہ'' کا اقتباس

حیدرقریشی (جرمنی)

میں بنیادی طور پر تخلیق کار ہوں۔تنقید کو ہمارے ہاں سکہ بند نقادوں کا فریضہ بنا کر نقاد کو ادب میں کسی مذہبی پیشوا سے ملتی جلتی حیثیت دے دی گئی ہے۔رہی سہی کسر ان مابعد جدید شارحین رسارقین نے پوری کر دی جنہوں نے مختلف حیلوں سے مصنف اور متن دونوں کو بے وقعت قرار دے کر اپنی تشریحات اور سرقوں ہی کو ادبِ عالیہ قرار دلوانا چاہا۔میں یہاں کسی لمبی چوڑی بحث میں گئے بغیر مختصراً اتنا عرض کروں گا کہ میرے نزدیک تنقید،تخلیقی عمل کا ایک جزوی حصہ ہے۔کسی فن پارے کی تخلیق کے دوران جب تخلیق کار اپنے فن پارے کے اظہار کے ساتھ اس کے الفاظ کے استعمال اور ان کی پیشکش کے انداز کو دیکھتا ہے تو دراصل ایسا دیکھنا،اس کی تنقیدی نگاہ بھی ہوتی ہے۔تخلیق کار کی یہ تنقیدی نظر اپنی تخلیق کے اظہار کے دوران اس کے حسن وقبح کا جائزہ لیتی ہے،تاکہ اسے خوب سے خوب تر صورت میں پیش کیا جا سکے۔اپنے فن پارے کو خوب سے خوب تر صورت میں پیش کرنے والی نظر ہی کسی تخلیق کار کی تنقیدی نظر ہوتی ہے،اور اسی کے نتیجہ میں کسی تخلیق کار کا فن پارہ معرضِ وجود میں آتا ہے۔یوں تنقید،تخلیق سے ہٹ کر کوئی الگ چیز نہیں رہتی۔کوئی تخلیق کار،تخلیقی طور پر جتنا اچھا ہوگا،اس کی تنقیدی سوجھ بوجھ یا تنقیدی بصیرت بھی اسی طرح لازماً عمدہ ہوگی،کیونکہ اسی کی بنا پر وہ اپنے تخلیقی تجربے کو بہتر طور پر اظہار کی صورت دے رہا ہے۔

ایک تخلیق کار کی یہی تنقیدی نگاہ دوسرے تخلیق کاروں کے فن پاروں کو بھی اسی انداز سے دیکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ہر چند دوسروں کی تخلیقات کے مطالعہ کے دوران اتنی وابستگی تو نہیں ہوتی جتنی اپنے تخلیقی عمل کے دوران اپنی تخلیق کے ساتھ ہوتی ہے۔تاہم وہ سوجھ بوجھ کسی نہ کسی طور دوسروں کے مطالعہ میں بھی اپنا اثر دکھاتی ہے۔سو اس زاویے سے آپ میرے ان مضامین کو تنقیدی مضامین کہہ سکتے ہیں۔میں نے زندگی بھر جو کتابیں پڑھیں،ان سب پر رائے دینا تو ممکن نہ تھا۔تاہم جن کے بارے میں رائے لکھنے کا موقعہ ملا وہ مضامین رتبصرے اس **حاصلِ مطالعہ** میں پیش ہیں۔

’’حاصلِ مطالعہ‘‘

منشایاد (اسلام آباد)

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے’’حاصلِ مطالعہ‘‘ حیدرقریشی کے مطالعہ میں آنے والی کتب و رسائل پرغیر روایتی تنقیدی تبصرے ہیں۔ بنیادی طور پر وہ ایک شاعراورافسانہ نگار ہیں لیکن ہرتخلیق کار کے اندرایک نقادبھی چھپاہواہوتا ہے۔حیدرقریشی کے اندر بھی ایک بہت اچھانقاد چھپاہواہے۔انہیں بجاطور پرایک ہمہ گیر شخصیت کہہ سکتے ہیں۔کیوں کہ ان کے اندرایک نقاد کے علاوہ افسانہ نگار‘شاعر‘ خاکہ نگار‘ کالم نگار‘اورایک بہت لائق مدیربھی موجود ہیں اور چھپے ہوئے بھی نہیں ہیں‘ ساری دنیاان کی معترف ہے۔ان کا مطالعہ وسیع اوروژن بسیط ہے اس لئے انہوں نے مختلف ادبی اورعلمی موضوعات پر اپنے تاثرات اورانتقادی محسوسات کو بروئے کارلاتے ہوئے بھرپوراظہارخیال کیاہے۔

اس طرح ’’حاصلِ مطالعہ‘‘شعروادب کی تنقید‘علمی وادبی معاملات پرمکالمہ اورمختلف کتب ورسائل پر تبصروں کاایک گلدستہ سابن گئی ہے۔ سپیشلائزیشن کے اس دور میں کسی ایک شخص میں اتنی بہت سی خوبیاں اورصلاحیتیں جمع ہوجاناغیرمعمولی بات ہے ۔ اورپھر انہوں نے ہرصنفِ ادب سے پوراپورا انصاف کیاہے۔انہوں نے بہت اچھے اوریادگارافسانے لکھے‘ خوب صورت شاعری کی اور ماہیے کی صنف سے رغبت توان کااختصاص ہے۔ماہیے کی تحقیق اورتنقید پران کی پانچ کتابیں شائع ہوچکی ہیں-------

حیدرقریشی انٹرنیٹ میگزین’’جدیدادب‘‘شائع کرتے ہیں(www.jadeedadab.com)جوکتابی صورت میں بھی شائع ہوتاہےاورانٹرنیٹ اورادب کی دنیامیں بے حدوقیع رسالہ سمجھا جاتاہے۔اس کے علاوہ ان کا شمار انٹرنیٹ کے ماہرین میں ہوتاہے۔اوراس میں قطعاً کوئی مبالغہ نہیں کہ اپنے میگزین کی طرح وہ خودبھی اب ایک بین الاقوامی شخصیت ادبی بن چکے ہیں۔’’حاصلِ مطالعہ‘‘دوسوچھپن صفحات پرمشتمل ایک بھرپورکتاب ہےاوراسے ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی نے نہایت اعلیٰ کتابت وطباعت کے ساتھ شائع کیاہے۔

حیدرقریشی: نقدونظر

معید رشیدی (دہلی)

’’میں بنیادی طور پرتخلیق کار ہوں۔تنقید کو ہمارے ہاں سکہ بند نقادوں کافریضہ بنا کرنقاد کوادب میں کسی مذہبی پیشوا سے ملتی جلتی حیثیت دے دی گئی ہے۔‘‘......**حیدرقریشی**

’تقریظی تنقید‘میں ہمہ جہت شخصیت کے الفاظ اتنے عام ہیں کےان سے اعتباراٹھ چکاہے۔یہاں ہرایراغیرا ہمہ جہت بن جاتا ہے۔المیہ یہ ہے کہ جس کی شخصیت کا کوئی ایک جزوبھی مستحکم نہیں،اسے بھی یہاں ہمہ جہتی کی سند بہ آسانی دے دی جاتی ہے۔بعض حضرات کثیر الجہات کہلانے کے شوق میں مختلف اصناف میں طبیعت آزمانا شروع کرتے ہیں اور جب طبیعت ساتھ دینے سے انکار کردیتی ہےتو’ہاتھ مارنا‘شروع کردیتے ہیں۔اس عمل میں جذبے کے بجائے عقل کا بہترین استعمال ہوتا ہے۔اپنی کوششوں سے وہ ہمہ جہت کہلانے میں کامیاب ہوجاتے ہیں لیکن ایسی ہمہ جہتی کس کام کی جس پرفقط ماتم ہی کیا جاسکتا ہو،کہ کاش!ان حضرات کو یہ توفیق ملتی کہ وہ اپنی شخصیت کے کسی ایک پہلو پرزور دیتے۔اس صنف پرزورآزماتے جس میں ان کےفن کا جوہر کھلتا ہو۔اپنی ذات کے نہاں خانوں میں اترتے اور دیکھتے کہ زندگی کیا ہےاوراس کے اسرارکیا ہیں۔سستی شہرت،سطحی ذہنیت اورمعمولی/اشتہاری تحریروں سے ادب میں کسی کا مقام نہیں بنتا۔آج جب میں حیدرقریشی کی ادبی خدمات پرنظر ڈالتا ہوں توان کی ہمہ جہتی کا قائل ہونا پڑتا ہےلیکن انھیں ہمہ جہت لکھتے ہوئےتھوڑا توقف ہوتا ہے کہ قارئین کو کیسے یقین دلایا جائے کہ یہ لفظ یہاں اپنے حقیقی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔میں نے کبھی’تقریظی تنقید‘نہیں لکھی اورنہ آئندہ لکھنے کاارادہ ہےاورنہ ہی مجھے ہمہ جہتی کی سند بانٹنے کا شوق ہے۔میں توفقط حقیقت کو پانے کی کوشش اور اس کااعتراف کرتا ہوں تاکہ میرے قارئین کے اعتماد کوٹھیس نہ پہنچے۔

حیدرقریشی نے شاعری کی اورمتعدد مجموعے لے آئے۔یہ مجموعے یوں ہی نہیں ہیں بلکہ ان میں اچھی شاعری کے نمونے ہیں۔اچھےاورمنفردشاعر کی حیثیت سے ان کااعتراف کیا جاچکا ہے۔آج بھی ان کا یہ شعر میری زبان پررہتا ہے:

تمہارے دل کی بنجرسرزمیں سیراب کرنے کو ہماری خشک آنکھوں ہی کوآخرجھیل ہونا ہے

انھوں نے اردو میں ماہیے کے حوالے سے جوکچھ کیا،اس سے اردودنیاواقف ہے۔ان کے افسانے اورخاکے بھی مشہور ہوچکے ہیں۔وہ مضامین اورتبصرے بھی لکھتے رہے ہیں،جن کا مجموعہ’حاصلِ مطالعہ‘کے نام سے چھپ کر

بازار میں دستیاب ہے۔انھوں نے متعدد شعری ونثری اصناف میں طبع آزمائی کی اور بہت لکھا لیکن اس کثرت کے باوجود ایک خاص سطح سے نیچے نہیں اترے۔یہی ان کی بڑی کامیابی ہے۔فی الحال مجھے ان کے مضامین پر گفتگو کرنی ہے جو'حاصلِ مطالعہ' میں شامل ہیں۔ان کی تحریروں کے مختلف ابعاد میں تنقیدی عناصر موجود ہیں، جو ان کی تحریروں کو اہم بناتے ہیں۔ان کی شکایت بجا ہے کہ ہمارے ہاں تنقید کوتوالی/ پیشوائی بن گئی ہے۔ادبی تنقید میں قبیلہ پروری، جانب داری اور بے ایمانی کی مثالیں بھی سامنے آئی ہیں۔تنقید جب تقریظ/تنقیص بن جائے تو فن پارے کی شرح یا تعینِ قدر میں انصاف نہیں ہوسکتا۔تنقید خوشہ چینی کا نام نہیں ہے۔حیدر قریشی نے تخلیق کار کی حیثیت سے دوسروں کی تخلیقات کو پرکھنے کی کوشش کی ہے۔معائب اور محاسن دونوں پر نظر ڈالی ہے۔معاصر تنقیدی رویوں/ ر جحانات کے افہام وتفہیم میں ان کا ذاتی شعور انھیں کمک پہنچاتا ہے۔ادب کے قاری اور تخلیق کار کی حیثیت سے انھیں حق ہے کہ معاصر میلانات یا نظریات پر اپنی بے لاگ رائے کا اظہار کریں۔ایسا کرنے پر انھیں کوئی نہیں روک سکتا، کیوں کہ جمہوری معاشرے میں فکری اظہاریے پر قدغن لگانا اہلِ علم کا شیوہ نہیں ہے۔ان کے خیالات سے اتفاق کرنا یا نہ کرنا قارئین کا مسئلہ ہے۔انھیں ذاتی رنگ دینا یا بغض وعناد کی عینک سے دیکھنا زیادتی پر مبنی ہے۔علمی اختلاف ہی سے گرہیں کھلتی ہیں۔ایسے اختلافات کا استقبال کرنا چاہیے۔ردوقبول ہی کے ذریعہ کوئی بھی ادب آگے بڑھتا ہے۔آنے والا وقت خود طے کردے گا کہ کون سا ادبی رویہ باقی رہے گا اور کس رویے کو ختم ہوجانا ہے۔'مابعد جدیدیت اور عالمی صورتِ حال' پر جو مکالمہ ان کی کتاب میں شامل ہے، وہ نہ صرف دلچسپ ہے بلکہ بحث کے لیے نئے در بھی وا کرتا ہے۔بحث کا آغاز'جدید ادب' کے اداریے سے ہوا جس کی تعریف میں وزیر آغا نے لکھا جبکہ ناصر عباس نیر نے اختلاف کیا۔دونوں تحریروں کی روشنی میں حیدر قریشی نے مضمون لکھا جس میں واضح طور پر تھیوری کے حوالے سے اپنے موقف کا اظہار کیا اور اس نتیجے پر پہنچے:

''مابعد جدیدیت کے مثبت ادبی ثمرات کو ضرور سامنے لانا چاہیے، ویسے ہی جیسے ترقی پسند تحریک کے مثبت ثمرات سے انکار نہیں کیا جاسکتا، تاہم جیسے اس تحریک کے پسِ پشت سیاسی قوتوں کو مطعون کیا گیا تھا ویسے ہی اس ڈسپلن کے پسِ پشت مخصوص مقاصد کے تحت کام کرنے والے امریکی ذرائع کے وجود یا عدم وجود پر بات کرنے میں کوئی ہرج نہیں۔اگر واقعی ایسا کچھ ہے تو اسے سامنے آنا چاہیے، اگر ایسا کچھ نہیں ہے تو غلط فہمی دور ہونی چاہیے۔اس لیے اس موضوع پر کھل کر گفتگو ہونی چاہیے۔اس پر ناراض نہیں ہونا چاہیے''۔(حاصلِ مطالعہ-ص:۲۳۰)

حیدر قریشی نے جو اداریہ لکھا اس کی تعریف وزیر آغا نے ان الفاظ میں کی ......''آپ کا اداریہ خصوصی طور پر قابلِ تعریف ہے۔اس میں آپ نے ایک ایسا نکتہ اٹھایا ہے جس کے حوالے سے مجھے اپنے مضامین میں بہت کچھ لکھنے کی سعادت حاصل رہی ہے''۔(حاصلِ مطالعہ-ص:۲۲۵)

ترقی پسند ادبی تحریک اردو کی سب سے منضبط اور بڑی تحریک تھی۔اس کی بنیاد مذہبیت، علاقائیت اور لسانی عصبیت پر نہیں تھی۔اردو کے غیر مسلم ادبا بھی اسی دھارے میں شریک تھے۔اس تحریک کے زیرِ اثر رومان اور انقلاب کے امتزاج سے نیا فکری رویہ سامنے آیا۔'اٹھ مری جان مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے' اور 'مجھ سے پہلی سی

محبت مرے محبوب نہ مانگ' جیسے مصرعے یا مجازؔ کا یہ شعر:

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن   تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

اس بات کا روشن ثبوت ہے کہ چوما چاٹی یا سطحی رومانس کی شاعری اب نہیں چلے گی۔اس تحریک نے زندگی کی سفاک حقیقتوں کا بہت قریب سے نظارہ کیا جس سے یہ ادراک حاصل ہوا کہ محبت کے سوا زمانے میں اور بھی دکھ ہیں جن سے پردہ پوشی نہیں کی جاسکتی ۔زمانہ جب انقلابات سے دوچار ہوتا ہے تو ادب پر بھی ان تغیرات کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔اردو ادب نے نئے میلانات کو قبول کر کے اپنے زندہ ہونے کا ثبوت دیا۔ترقی پسند تحریک کی خدمات سے انکار حماقت ہی نہیں، ادبی بد دیانتی بھی ہے لیکن اس امر سے بھی انکار ممکن نہیں کہ کسی بھی تحریک/ رجحان میں شدت پسندی کے عناصر غالب ہونے لگتے ہیں تو مخصوص قسم کی بازاریت/سطحیت در آتی ہے اور تخلیق ہو یا تنقید اشتہار کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔حیدر قریشی نے بہت صحیح لکھا ہے:

''ترقی پسند تحریک نے لکھنے والوں میں ایک نئی روح پھونک دی، اردو ادب کو جتنے اعلیٰ پایے کے تخلیق کار ترقی پسند تحریک کے ذریعے نصیب ہوئے بعد میں کسی اور تحریک کے ذریعے اتنی تعداد میں نہیں مل سکے۔اس میں شک نہیں کہ اس تحریک کے ذریعے مقصد کو ادب پر نہ صرف فوقیت دی جانے لگی بلکہ ادب کو محض آلۂ کار کے طور پر استعمال کیا جانے لگا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اتنے بڑے فورم کی طرف سے بے شمار ٹریش بھی ادب کے نام پر پیش کیا جانے لگا۔تاہم ترقی پسند تحریک نے ادب کے دھارے کا رخ تبدیل کر کے ایک انقلابی کارنامہ انجام دیا۔بیسویں صدی کے ادب پر سب سے گہرے نقش ترقی پسند تحریک کے ہیں''۔(حاصلِ مطالعہ-ص:۱۴)

یہ اقتباس ان کی کتاب کے پہلے مضمون 'یہ ایک صدی کا قصہ ہے' سے ماخوذ ہے جس میں انھوں نے بیسویں صدی کے ادبی تغیرات پر اچٹتی سی نگاہ ڈالی ہے لیکن چار صفحے کے اس مختصر مضمون میں انھوں نے اہم ادبی/ تاریخی حقائق کو نشان زد کیا ہے۔ترقی پسند تحریک کے بعد جدیدیت عصری مظہر کی صورت میں جلوہ گر ہوئی لیکن بعض معاملات اور رویوں میں کلیسے کے قانون جیسی صورت کی جھلک بھی نظر آئی۔علامتی پیچیدگی اور تجریدی الجھاؤ کے شعوری اطلاق سے تحریر گنجلک ہوئی اور یقیناً قارئین کا دائرہ بھی مخصوص ہوگیا۔لسانی شکستگی اور تجرید ہی کو جدیدیت سے مختص کر کے دیکھا گیا۔اس عمل میں بھی وہی شدت پسندی کارفرما ہے جو آخر کلیسائی اصولوں کا درجہ پالیتی ہے۔جدیدیت نے انسان کے باطن/ داخل میں اتر کر اس کی شناخت کی اور ان عناصر کو اہمیت دی جو داخلی بحران کو نمایاں کرتے ہیں۔جدیدیت کے متوازن میلان نے یقیناً فکر کا دائرہ وسیع کیا اور نئے زاویے عطا کیے۔حیدر قریشی نے اسی توازن کو نیک فال قرار دیا ہے:

''معتدل اور متوازن جدیدیت ادب کے لیے نیک فال تھی لیکن پھر یہاں جدید علامتی پیرایے کی جگہ گہرے تجریدی بادل چھا گئے۔ادب کی تخلیقی سحر انگیزی کی جگہ الفاظ کا مداری پن نمایاں ہوا۔قاری ادب سے ہی بیزار ہونے لگا۔خدا خدا کر کے یہ دور گزرا، اور اب بیسویں صدی کا آخری کنارہ ہے۔اس دور کو مابعد جدیدیت کہہ لیں، چاہے جدیدیت کی توسیع کہہ لیں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ادیبوں کی نئی نسل لفظ ومعنی سے ہم رشتہ

ہونے ہی میں اپنی ادبی بقا سمجھتی ہے اور اس میں ادب کی بقا بھی ہے''۔ (حاصلِ مطالعہ-ص:۱۵)

اپنی کتاب کے پہلے ہی مضمون میں حیدر قریشی نے یہ بنیادی سوال اٹھایا ہے کہ اکیسویں صدی میں صرف اردو ادب ہی کا نہیں، دنیا بھر میں ادب کا مستقبل کیا ہوگا؟ آج دنیا عالمی گاؤں میں تبدیل ہو چکی ہے۔ جدید ترین ایجادات نے اذہان کو چونکا کر رکھ دیا ہے۔ مادیت غالب آتی جا رہی ہے۔ معاشرے میں ہر شے کا رشتہ بازار کے بھاؤ سے جوڑنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اقدار کی پامالی اور رشتوں کے بحران میں ادب کی معنویت پر سوالیہ نشان قائم ہوا ہے۔ حیدر قریشی نے نہایت اہم مسئلے کی طرف توجہ مرکوز کی ہے لیکن اسی سوال پر انھوں نے مضمون ختم کر دیا ہے۔ اس امید پر کہ اہلِ ادب اس سوال پر سنجیدگی سے غور کریں گے۔ اگر وہ اس مسئلے کو پھیلاتے تو یقیناً نئے ابعاد پر نظر جاتی اور مختلف مسائل طشت از بام ہوتے۔ انھیں اچھی طرح علم ہے کہ وہ جن اہلِ ادب سے اس موضوع پر غور و فکر کرنے کا تقاضا کر رہے ہیں، شاید ہی ان میں سے کوئی سنجیدگی سے ایسے موضوعات پر قلم اٹھائے۔ یہاں تو حال یہ ہے کہ گروہ بندی/ دشنام طرازی اور ایک دوسرے کو کم تر ثابت کرنے کی کوشش میں توانائی اور صلاحیتیں ضائع کی جا رہی ہیں۔ اس دوڑ میں سبقت حاصل کرنا اصل مقصد بنا ہوا ہے۔

اردو زبان و ادب کے مسائل پر حیدر قریشی کی نگاہ گہری ہے۔ ان کا خیال بالکل درست ہے کہ جب تک اردو لکھنے، بولنے اور سمجھنے والے موجود ہیں اردو ایک زبان کی حیثیت سے موجود رہے گی۔ اردو اپنے آغاز سے لے کر کئی ادوار سے گذری۔ اس دوران نہ صرف اس کی ساخت میں تبدیلی آئی بلکہ اسے مختلف ناموں سے بھی پکارا گیا...... ہندوی/ ہندی/ ریختہ/لشکری/ دکنی/ ہندوستانی/ اردو وغیرہ۔ لسانی تشکیل کے مراحل میں ۱۸۰۰ء کے بعد رسمِ خط کے مسئلے نے بھی سر اٹھایا۔ فورٹ ولیم کالج کے احاطے میں اسی زبان کو جسے ہم اردو کہتے ہیں محض رسمِ خط کی تبدیلی سے ایک نئی زبان 'کھڑی بولی ہندی' کی شکل دی گئی۔ اس موضوع پر مرزا خلیل احمد بیگ نے اپنی کتاب 'ایک بھاشا...... جو مسترد کر دی گئی' میں سیر حاصل بحث کی ہے اور اس امر کا مدلل جواب دیا ہے کہ فورٹ ولیم کالج سے قبل دیوناگری والی کھڑی بولی ہندی (ایک الگ زبان کی حیثیت سے) کا وجود نہیں تھا۔ پھر کالج میں اس نئی زبان کا شعبہ کیسے قائم ہوتا اور اس میں کن متون کی تدریس ہوتی؟ حقیقت یہ ہے کہ ۱۸۰۱ء میں کالج کے ہندی طالب علموں کے لیے اردو شاعر عبداللہ مسکین کا ایک مرثیہ دیوناگری رسمِ خط میں شائع کیا گیا جو درس و تدریس کی بنیاد بنا۔ دیگر کئی اردو کتابیں بھی اسی مقصد کے تحت دیوناگری میں منتقل کی گئیں۔ کالج کا احاطہ لسانی تقسیم کی پہلی منزل تھا جبکہ تقسیمِ ہند نے ہندوستانی/اردو کو زبردست نقصان پہنچایا۔ اردو کو مسلمانوں کی زبان سمجھ لیا گیا اور 'ہندی، ہندو، ہندوستان' کا نعرہ بلند کیا گیا۔ حیدر قریشی کے بقول اردو کو یہ سزا قیامِ پاکستان کے جرم میں دی گئی اور پاکستان میں بھی اسے اس کا حق نہیں مل سکا۔ وہاں اشرافیہ کی زبان انگریزی ہی رہی۔ پھر رسمِ خط کی تبدیلی کی تجاویز پیش کی گئیں۔ کسی نے دیوناگری رسمِ خط کی حمایت کی اور کسی نے رومن کے حق میں رائے دی لیکن اس وقت سے لے کر آج تک اردو والوں کا بڑا طبقہ اسی بات پر قائم ہے جس کی طرف حیدر قریشی نے اشارہ کیا ہے:

''اردو کی پہچان اس کے اصل رسم الخط ہی میں ہے کہ اس کے ساتھ اس کا پورا ثقافتی پس منظر جڑا ہوا

ہے۔ تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ قوموں کے عروج و زوال کی طرح زبانوں کو بھی عروج و زوال سے گذرنا پڑتا ہے''۔ (حاصلِ مطالعہ-ص:۲۰)

زبانوں کا بننا یا ختم ہو جانا تاریخی تسلسل پر مبنی ہے۔ قدیم اردو کی مثال ہمارے سامنے ہے لیکن کیا معلوم کہ آنے والے زمانے میں اس کی فطری شکل کیا ہوگی۔ زبان کے ساتھ ادب کا مسئلہ بھی ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ مشاعرے پہلے تہذیبی ادارے ہوا کرتے تھے لیکن اب محض تفریح کا سامان بن چکے ہیں۔ یہاں حیدر قریشی کے اس جملے سے اتفاق کرنا پڑتا ہے کہ یہ رویہ خود ادیبوں کی ادب سے بے رغبتی کو ظاہر کرتا ہے۔ زبان و ادب کی موجودہ صورتِ حال پر انھوں نے چار اہم مضامین سپردِ قلم کیے جن کے عنوان یہ ہیں...... 'یہ ایک صدی کا قصہ ہے'، 'اردو زبان اور ادب کے چند مسائل'، 'تیسرے ہزاریے کے آغاز پر اردو کا منظر'، 'یورپی ممالک میں اردو شعر و ادب-ایک جائزہ'۔ ان تمام مضامین میں انھوں نے ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش، مغربی ممالک، عرب ممالک اور ان سے ہٹ کر باقی ممالک اور جزائر میں اردو کے حالات پر نظر ڈالنے کی کوشش کی ہے اور وہاں کی لسانی/ ادبی صورتِ حال کے احتساب کی سعی کی ہے۔ مغربی ممالک میں اردو زبان و ادب کی جو پوزیشن ہے اس سے وہ نہایت اچھی طرح باخبر ہیں۔ گاہے گاہے وہاں کے جعلی ادبا کا پردہ بھی انھوں نے فاش کیا ہے کہ انھیں قیمتاً لکھ کر دینے والے ہندوستان/ پاکستان میں موجود ہیں۔ بعض اہم ادبا جو وہاں جا کر بس گئے ہیں ان کی شناخت ادب کے مرکزی دھارے سے ہے۔ وہ وہاں کے پروردہ نہیں ہیں۔ مغرب کے اردو ادیبوں کا اہم موضوع ہجرت یا جنس ہے لیکن ان موضوعات کو نبھانے میں انھیں زیادہ کامیابی نہیں ملی۔ بہ قول حیدر قریشی:

''یہاں کے افسانہ نگاروں کا ایک اہم موضوع ہجرت یا ترکِ وطن ہے۔ اس موضوع پر بہت کہانیاں لکھی گئی ہیں۔ لیکن ہجرت کے موضوع پر ۱۹۴۷ء کے بعد پاکستان اور ہندوستان میں جس پایے کی کہانیاں لکھی جا چکی ہیں، مغرب کے ہمارے اردو افسانہ نگار اس سطح کو مس بھی نہیں کر سکے۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ ۱۹۴۷ء کی ہجرت نے دلوں میں گہرے گھاؤ پیدا کیے تھے...... سب دکھی تھے۔ جبکہ مغرب میں آ بسنے والے وطن سے زیادہ آرام کی دنیا میں آتے ہیں۔ یہاں کا کھلا ماحول انھیں شاید ان کیفیات سے آشنا ہونے ہی نہیں دیتا جو تخلیقی کرب کا لازمہ ہے۔ مغربی چکا چوند میں جنس نگاری کی طرف رغبت فطری بات ہے لیکن اس میں بھی خرابی یہ ہوئی کہ منٹو، عصمت چغتائی اور ممتاز مفتی اس حوالے سے جتنا کچھ اردو کو دے گئے ہیں، اس کے بعد مغرب کے اردو افسانہ نگار جنسی لذت تو کشید کر لیتے ہیں لیکن فن کی اس سطح تک نہیں پہنچ پاتے جو ایک معیار کے طور پر پہلے سے اردو میں موجود ہے''۔ (حاصلِ مطالعہ-ص:۲۷)

حیدر قریشی نے انٹرنیٹ پر اردو کے فروغ کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ مضمون 'اردو نظم روایت سے جدیدیت تک' میں انھوں نے محمد حسین آزاد اور حالی کی نئی نظم نگاری کی تحریک کا ذکر تصدق حسین خالد، احمد ندیم قاسمی، میراجی، ن۔م۔راشد، فیض، فرحت نواز، سلیم احمد، جیلانی کامران، غالب احمد، اظہر جاوید، مجید امجد، وزیر آغا وغیرہ کو حوالہ بنایا ہے۔ 'اوراقِ گم گشتہ' کے عنوان سے انھوں نے 'دیوانِ ریختی عرف رنگیلی

بیگم‘ مصنفہ محسن خان پوری کا تحقیقی مطالعہ پیش کیا ہے جس میں تجزیاتی اسلوب کو مرکزی اہمیت دی گئی ہے۔ان کے دیگر مضامین تاثراتی /تبصراتی / تعارفی /شخصی نوعیت کے ہیں۔غزل اور نظم کی انفرادی حیثیت پر بھی انھوں نے لکھا ہے۔’غزل بمقابلہ نظم‘ میں انھوں یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ غزل کا نظم سے نہ کوئی مقابلہ ہے اور نہ مخاصمت۔غزل پر بے جا اعتراضات مناسب نہیں۔البتہ یہ ضرور ہے کہ غزل کے نام پر جگالی کرنے والے شعرا سے لے کر مجروں جیسی مشاعرہ بازی (کرتب بازی) کرنے والوں تک کی سرکوبی کی جانی چاہیے۔اپنی کتاب میں انھوں نے کئی معاصر ناولوں کا تجزیہ بھی کیا ہے۔مثلاً نادید(جوگندر پال)، پار پرے(جوگندر پال)،کئی چاند تھے سرِ آسماں (شمس الرحمٰن فاروقی)،ایک دن بیت گیا(صلاح الدین پرویز)،مورتی(ترنم ریاض)،سفر جاری ہے(ثریا شہاب)۔تین اہم شخصیات وزیر آغا، ہمت رائے شرما اور جوگندر پال سے انھیں دلی قرابت رہی ہے۔ہمت رائے شرما اور جوگندر پال کے فکر وفن پر انھوں نے متعدد مضامین لکھے اور کئی جہات سے ان کا مطالعہ کیا۔شخصی تحریروں میں ان کا خلوص صاف جھلکتا ہے۔

آخر میں پھر کہوں گا کہ حیدرقریشی کی شخصیت ہمہ جہت ہے۔انھوں نے اپنی تنقید کے لیے کسی طرح کا دعویٰ نہیں کیا۔وہ خود کو تخلیق کار کی حیثیت سے دیکھتے ہیں اور تخلیق ہی ان کا اصل میدان ہے۔فن کار بھی اسی ماحول کا پروردہ ہوتا ہے جس میں وہ سانسیں لیتا ہے۔اس کے سامنے بھی مسائل سر اٹھائے کھڑے رہتے ہیں ۔ایسی صورت میں حیدرقریشی نے بھی معاصر صورتِ حال اور اپنے معاصرین کی تحریروں کو اپنی نظر سے دیکھنے کی کوشش کی ہے جس کا اعتراف انھوں نے اپنی کتاب کے’ابتدائیہ‘ ہی میں کیا ہے۔

سب سے پہلے، حیدر بھائی مجھے’ کتاب نما‘ کے ایک شمارے میں ملے تھے۔ یہ کئی برس پہلے کی بات ہے۔اس ایک کتاب نما میں انہوں نے سال بھر کے کتاب نماؤں کا تفصیلی جائزہ اس سنجیدگی سے لیا تھا کہ میں چونک گیا۔جب اس جائزے کا میں نے بغور جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ اتنی محنت تو ادیبوں نے اپنی تخلیقات میں بھی نہ کی ہوگی جتنی موصوف نے تمام تر جزئیات کے ساتھ ان کا جائزہ لینے میں فرمادی تھی۔مضمون پڑھ کر میرے منھ سے وہی جملہ نکلا جو کسی زمانے میں ملک راج آنند کی تقریر سن کر اسرار الحق مجاز کی زبان سے نکلا تھا۔یعنی یہ کہ کوئی بڑا ہی قابل آدمی معلوم ہوتا ہے۔ پھر جب دھیرے دھیرے ان کی ادبی تخلیقات یہاں وہاں پڑھیں تو ان کے اور جوہر کھلتے گئے۔اور حال ہی میں ان کی کلّیات کا مطالعہ شروع کیا تو خود اپنا جہل بھی کھل کر سامنے آ گیا کہ ایک شخص اتنے خلوص، وارفتگی، سنجیدگی، ایمانداری، محنت اور جانکاہی سے ادب تخلیق کرتا رہا، اور کاغذ کی زمین سے لے کر انٹرنیٹ کے آسمان تک ہر طرف دھومیں مچاتا رہا اور تمہیں اب تک خبر نہ ہوئی۔یقین کیجئے ادب کے معاملے میں اپنی نامعلومات پر اس وقت اتنی شرم آئی کہ دیر تک یوں محسوس ہوتا رہا جیسے میں کوئی عام قاری نہیں بلکہ کسی یونیورسٹی کا لیکچرر ہوں ۔پروفیسر اس لئے محسوس نہیں کیا کہ وہ پھر بھی تھوڑے پڑھے لکھے ہوتے ہیں۔(**نصرت ظہیر** کے مضمون ’’**حیدر بھائی پر ایک ادھورا مضمون**‘‘ سے اقتباس۔مطبوعہ ’’**تادیب**‘‘ بریڈفورڈ، انگلینڈ جولائی تا ستمبر۲۰۰۶ء)

’’وزیر آغا۔۔۔عہد ساز شخصیت‘‘

صفدر رضا صفی (سرگودھا)

شخصیات کے عہد ساز ہونے یا نہ ہونے کا قطعی فیصلہ یقیناً وقت ہی کے ہاتھوں میں ہے لیکن ہر گزرتا ہوا لمحہ اپنے تئیں شخصیات سے متعلق کچھ مواد تاریخ کے سپرد کرتا رہتا ہے تا کہ آنے والے وقت کو فیصلہ کرنے میں دقت اور دشواری محسوس نہ ہو۔اس گزرتے ہوئے لمحے کے فطری نظام کار میں بعض اوقات ارد گرد سے اڑائی جانے والی غیر مصدقہ افواہیں اور عدم واقفیت پر مبنی بیانات عارضی تعطل پیدا کر دیتے ہیں۔لیکن اس زمانے کے فہیم اور زیرک اہلِ نظر فوراً تاریخ کے قدرتی بہاؤ میں پیدا ہونے والے اس غیر ضروری اور گمراہ کن بھنور کا ادراک کر لیتے ہیں اور اپنا فریضہ ادا کرتے ہوئے تاریخ دانوں اور دوسرے اہل علم تک اصل حقائق پہنچاتے رہتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی ہر سطح پر بالعموم اور ادبی منظر نامے پر بالخصوص کم وبیش یہی صورت حال رہی ہے۔ ہر دور کسی ادیب یا شاعر کی تکذیب اور تعریف کے دوراہے پر کھڑا نظر آتا ہے۔عہدِ حاضر میں ڈاکٹر وزیر آغا کو اسی صورت حال کا سامنا ہے۔ان کی موافقت اور مخالفت میں جتنا کچھ لکھا جا چکا ہے وہ اس بات کو تو یقینی بناتا ہے کہ ان کی شخصیت نظر انداز ہر گز نہیں کی جا سکتی لیکن پھر بھی مخالفین کی طرف سے اڑائی جانے والی گرد کو صاف کرنے اور حقیقتِ حال کو اجاگر کرنے کے لئے دستاویزی ثبوت پیش کرنا ضروری ہو جاتے ہیں۔

حیدرقریشی صاحب کی تازہ کتاب ’’وزیر آغا۔عہد ساز شخصیت‘‘ بھی ایک ایسے ہی دستاویزی ثبوت کی حیثیت رکھتی ہے، جسے نہ صرف آنے والا وقت ایک حوالے کے طور پر استعمال کرے گا بلکہ نسلِ نَو بھی بعض شخصیات کے علمی و ادبی قد کو متعین کرتے ہوئے اس کتاب سے مدد لے گی۔حیدرقریشی صاحب نے کتاب کے عنوان کو بیان ہر گز نہیں بننے دیا۔ بلکہ اپنے عالمانہ مضامین سے یہ اثبات مہیا کیا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے ادبی کام کے تناظر میں انہیں عہد ساز شخصیت قرار دینا بالکل درست ہے۔

قریشی صاحب نے وزیر آغا کی خودنوشت سوانح ’’شام کی منڈیر سے‘‘ سے لے کر ان کی نظموں کے تجزیاتی مطالعات، شعری کلیات، تنقید اور آغا صاحب کی غزلوں کا مطالعہ کرتے ہوئے جس اعلیٰ قرأت کا ثبوت دیا ہے وہ

اپنی مثال آپ ہے۔کتاب کا سب سے اہم مضمون ’’اردو انشائیہ اور اس کے بانی کی انشائیہ نگاری‘‘ ہے۔اس لئے کہ اس مضمون میں حیدر قریشی صاحب نے اردو انشائیہ کو اس صنف کے رائج کرنے والی اوّلین شخصیت کی ذاتی تخلیقات کی روشنی میں دیکھا ہے۔اور یہ زاویہ نگاہ یقیناً لائقِ تحسین ہے۔کیونکہ آغا صاحب نے بذات خود جس سطح پر انشائیہ کے مزاج کو مس کیا ہے اسے منظر عام پر لایا جانا چاہئے تھا،تاکہ نئے انشائیہ نگار یا قارئین انشائیہ اس صنف کے محاسن کا صحیح ادراک کر سکیں۔

’’وزیر آغا۔عہد ساز شخصیت‘‘ پڑھنے کے بعد قاری۔۔۔حیدر قریشی صاحب سے ایک نیا تعارف حاصل کرتا ہے اور قریشی صاحب کا یہ تعارف ایک منجھے ہوئے اور متوازن ادبی نقاد کا تعارف ہے۔امید کی جانی چاہئے کہ قریشی صاحب دیگر ادباء کے مطالعات سے بھی قارئین کو نوازیں گے۔

حاصلِ مطالعہ

ڈاکٹر شفیق انجم (اسلام آباد)

چند روز قبل ڈاکٹر رشید امجد صاحب کی وساطت سے آپ کی کتابیں:’حاصلِ مطالعہ‘اور’ادھر ادھر سے‘ موصول ہوئیں۔بہت بہت شکریہ۔دونوں کتابیں مجھے بہت پسند آئیں اور جستہ جستہ دیکھنے پر بھی بار بار ایسا ہوا کہ مندرجات نے مجھے کھینچ لیا۔تفصیلی مطالعے کے بعد زیادہ بہتر انداز میں کچھ کہنے کے قابل ہوں گا لیکن فوری طور پر یہ کہنے میں کوئی امر مانع نہیں کہ آپ کا مطالعہ وسیع اور تجزیہ بے لاگ ہے۔آپ کی باخبری اور گہری بصیرت ان کتابوں سے واضح طور پر نمایاں ہے۔سیاسی وسماجی حالات ہوں یا ادبی مکاشفات۔۔۔آپ نے بڑی عمدگی سے صورتحال کو دیکھا دکھایا ہے۔دونوں کتابوں میں ایک اور خوبی اسلوب اور اظہار و بیان کا فرق بھی ہے۔صحافتی تجزیوں اور تبصروں اور ادبی تنقید و تفہیم میں آپ نے جو تفریق روا رکھی ہے،عموماً اس طرف توجہ نہیں دی جاتی۔آپ نے ہر دو کے لیے علیحدہ لحن کے انتخاب کے ساتھ ایک متوازن معیار کی پیش کش بھی ملحوظ رکھی ہے۔

میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو سلامت رکھے۔آمین۔کتابیں عنایت فرمانے پر ایک بار پھر شکریہ قبول فرمائیے۔

حیدر قریشی: بحیثیت نقاد

منزہ یاسمین (بہاولپور)

تنقید کسی فن پارے کے حسن و قبح کو پرکھ کر منصفانہ اظہار رائے کا نام ہے۔تنقید کو نقدِ حیات کا منصب حاصل ہے کیونکہ ہر فن پارہ زندگی یا اس کے کسی نہ کسی پہلو کی ترجمانی وعکاسی کرتا ہے۔اس لئے تنقید کے مقاصد تبھی حاصل کیے جا سکتے ہیں۔اگر نقاد زندگی کی صداقتوں کا شعور وادراک رکھتا ہو۔خود اِن صداقتوں کے تخلیقی اظہار کی قدرت رکھتا ہو اور سب سے اہم بات یہ کہ اس تجزیاتی شعور تعصب سے پاک اور غیر جانبدارانہ ہو۔اردو ادب میں صحت مند تنقید کی روایت کی بدولت لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی ہوتی رہی ہے اور ان کا تخلیقی جوہر ترقی کی منزلیں طے کرتا رہا ہے۔تنقید کی اسی صحت مند روایت کی پاسداری کرنے والوں میں حیدر قریشی کو شمار کیا جا سکتا ہے۔حیدر قریشی کا تنقیدی شعور اگرچہ ان کی شعری ونثری نگارشات میں بھی جلوہ گر ہے مگر اُن کی تنقیدی کتب میں اُن کا یہ جوہر خاص طور پر نمایاں نظر آتا ہے۔حیدر قریشی کی تنقیدی کتب مندرجہ ذیل ہیں۔

(الف) ڈاکٹر وزیر آغا۔عہد ساز شخصیت

(ب) اُردو میں ماہیا نگاری

(ج) اُردو ماہیے کی تحریک

(د) اُردو ماہیے کے بانی۔ہمت رائے شرما

آئندہ صفحات میں ان کتب کا الگ الگ جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

۱۔ڈاکٹر وزیر آغا۔عہد ساز شخصیت:

’’ڈاکٹر وزیر آغا۔عہد ساز شخصیت‘‘ حیدر قریشی کے تنقیدی مضامین پر مشتمل کتاب ہے جس میں انہوں نے ڈاکٹر وزیر آغا کی ہمہ جہت اور ہمہ رنگ شخصیت اور اس کے فنی وفکری گوشوں کو فکر انگیز عقیدت سے بیان کیا ہے۔حیدر قریشی اپنی اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں۔

’’میری یہ کتاب ان مضامین کا مجموعہ ہے جو میں نے گزشتہ دس برس کے دوران ڈاکٹر وزیر آغا کے

فن کی مختلف جہات پر وقتاً فوقتاً تحریر کیے ہیں۔ جب مجھے انہیں یکجا کرنے کا خیال آیا تب اندازہ ہوا کہ یہ بکھرے ہوئے مضامین الگ الگ ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور ان سے علم و فن کی کسی سطح کا سہی، ڈاکٹر وزیر آغا کے بارے میں ایک واضح تاثر سامنے آتا ہے۔(۱)

۱۹۹۵ء میں نایاب پبلی کیشنز خان پور کی جانب سے شائع ہونے والی اس کتاب ''ڈاکٹر وزیر آغا۔ عہد ساز شخصیت'' میں حیدر قریشی نے ''ابتدائیہ'' کے نام سے دیباچہ خود تحریر کیا ہے۔ اس ابتدائیہ میں ڈاکٹر وزیر آغا کے بارے میں حیدر قریشی لکھتے ہیں۔

''ڈاکٹر وزیر آغا ہمارے ادب کی عہد ساز شخصیت ہیں۔ عہد ساز شخصیت کے الفاظ میں نے محبت یا مروت میں نہیں لکھے بلکہ ایک حقیقت بیان کی ہے۔ یوں تو ان کی مجموعی ادبی کارکردگی کے اثرات پاکستان اور ہندوستان کے ادب پر اتنے نمایاں ہیں کہ سنجیدہ ترقی پسند ناقدین نے بھی برملا طور پر اس کا اقرار کیا ہے تاہم جیسے جیسے وقت گزرے گا ان کے گہرے اثرات کا دائرہ وسیع تر ہوتا جائے گا۔'' (۲)

''ابتدائیہ'' کے بعد حیدر قریشی نے ڈاکٹر وزیر آغا کے مختصر کوائف زمانی تسلسل سے تحریر کیے ہیں جو کہ اُن کی وسیع خدمات کا ثبوت ہیں۔

مضمون ''عہد ساز شخصیت'' میں حیدر قریشی نے ڈاکٹر وزیر آغا کی شخصیت کے بارے میں اپنے تاثرات اور تجربات کو بیان کرتے ہوئے ناقدانہ رائے کا اظہار کیا ہے۔ مضمون کے آغاز میں حیدر قریشی خود کو ادبی دنیا کا نو وارد کہتے ہوئے، ڈاکٹر وزیر آغا سے اپنی ذہنی اور علمی ملاقاتوں کا ذکر کرتے ہیں۔

''میں ادبی دنیا میں نو وارد تھا......اس دوران مجھے ''تنقید اور احتساب'' پڑھنے کا موقع ملا تو یوں لگا میرے مبہم اور غیر واضح تصورات کو اصل صورت ملنے لگی ہے۔ یہ ڈاکٹر وزیر آغا سے علمی سطح پر میری پہلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد ''نظم جدید کی کروٹیں'' اور ''نئے مقالات'' کے ذریعے ڈاکٹر وزیر آغا سے مزید دو ملاقاتیں ہوئیں اور مجھے احساس ہوا کہ ادب کے بارے میں جو کچھ میں سوچتا ہوں مگر میری گرفت میں نہیں آیا وہ سب وزیر آغا کی گرفت میں ہے۔ (۳)

پھر جب حیدر قریشی نے باقاعدہ طور پر ادبی دنیا میں قدم رکھا اور ادبی رسالہ ''جدید ادب'' کے اجراء کا پروگرام بنایا تو ڈاکٹر انور سدید کے ذریعے حیدر قریشی کی باقاعدہ قلمی ملاقات ہوئی اور ڈاکٹر وزیر آغا نے معمولی سی درخواست پر نہ صرف محبت سے اپنی نگارشات ''جدید ادب'' کے لیے دے دیں بلکہ ایک استاد اور رہنما کے طور پر حیدر قریشی کو ادبی دنیا میں آگے بڑھنے میں مدد بھی دی۔ اسی رہنمائی کی بدولت حیدر قریشی نے انشائیہ نگاری کی صنف کو اپنایا۔ اس کے علاوہ اُن کی اکثر تخلیقات بھی ڈاکٹر وزیر آغا کے مجلّہ ''اوراق'' میں شائع ہونے لگیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے مشفقانہ رویے اور پُر خلوص رہنمائی نے حیدر قریشی پر اُن کی شخصیت کے متعدد پہلوؤں کو اُجاگر کیا۔

حیدر قریشی ''ابتدائیہ'' میں ڈاکٹر وزیر آغا کی زندگی اور اُن کی شخصیت کے بارے میں اپنی رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''وزیر آغا دشمن کے تیر سہنے کا حوصلہ رکھتے ہیں مگر دوستوں کے مارے ہوئے پھول نہیں سہہ سکتے۔ ہاں اگر دوست کھل کر دشمن بن جائے تو پھر ان کی زہریلی مخالفت کو بھی ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ پی لیتے ہیں۔'' (۴)

ڈاکٹر وزیر آغا کی سوانح عمری ''شام کی منڈیر سے'' پر اپنے تنقیدی مضمون میں حیدر قریشی نے نہ صرف اُن کی زندگی کے چھپے ہوئے گوشوں کو کھولنے کی کوشش کی ہے بلکہ قارئین کے لیے بھی ڈاکٹر وزیر آغا کو سمجھنے کا موقعہ فراہم کیا ہے۔ ''شام کی منڈیر سے'' کے بارے میں اپنی ناقدانہ رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''شام کی منڈیر سے'' ادب کے ان قارئین کے لیے گائیڈ بک کا کام بھی دیتی ہے جنہیں عام طور پر یہ شکایت ہے کہ وزیر آغا کی شاعری پوری طرح انہیں سمجھ نہیں آتی۔ مجھے یقین ہے اگر ایسے قارئین ایمانداری سے ''شام کی منڈیر سے'' پڑھ لیں تو ان کی عدم تفہیم کی شکایت نہ صرف دور ہو جائے گی بلکہ انہیں وزیر آغا کے تصورات کو ان کے حقیقی روپ میں دیکھنے کا موقع بھی ملے گا۔''(۵)

''شام کی منڈیر سے'' میں موجود ڈاکٹر وزیر آغا کی زندگی کے پہلوؤں کو ''اُن کی تخلیقات کا ایک نیا جہان معنی'' قرار دیتے ہوئے حیدر قریشی ڈاکٹر وزیر آغا کے سائنسی، اسلامی اور فلسفیانہ اندازِ بیان کے بارے میں اظہارِ رائے کرتے ہیں۔

''سائنس کو وہ اس کے وسیع تر مفہوم میں لیتے ہیں اور کائناتِ اصغر کی نئی نئی دریافتوں سے خوش گوار حیرتوں میں مبتلا ہوتے ہیں......روحانیت اور سائنس کے حیرت افزاء انکشافات کو وہ ادبی زاویے سے بھی دیکھتے ہیں اور اپنی تخلیقات کو ان سے منور بھی کرتے ہیں۔ یوں ان کے ہاں ادب محض حسن وعشق کا بیان یا محض احتجاج نہیں بنتا بلکہ وہ تو زندگی اور کائنات کے بے شمار اسرار و رموز کی نقاب کشائی کا موجب بنتا ہے پھر وہ اپنے کشف کو اپنے تک محدود نہیں رکھتے بلکہ اپنے قارئین کو بھی اس کی حیرتوں اور مسرتوں میں شریک کرتے ہیں۔'' (۶)

''شام کی منڈیر سے'' میں موجود ادبی اور روحانی موضوعات کا مطالعہ کرنے سے حیدر قریشی اپنے اندر پیدا ہونے والی نئی کیفیت کا اقرار بھی کرتے ہیں۔

''اس کتاب کے مطالعہ نے نہ صرف نئی سائنسی معلومات کے باعث مجھے بارہا حیرت زا مسرت سے دوچار کیا ہے، بلکہ روحانی سطح پر بھی میرے اندر ایک تبدیلی پیدا کی ہے۔ میرے الہیاتی تصورات میں ٹوٹ پھوٹ ہوئی ہے اور پھر ایک نئی تعمیر کا عمل بھی جاری ہوا ہے۔'' (۷)

محمد وسیم انجم بھی حیدر قریشی کی تخلیقات اور ڈاکٹر وزیر آغا کی سوانح عمری ''شام کی منڈیر سے'' میں

موجود مشترکہ کیفیات کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''شام کی منڈیر سے'' جہاں دیہات کی زندگی کی عکاسی ہوتی ہے، وہاں اسلامی واقعات، سائنسی انکشافات، روحانی اسرار ورموز بڑے دلکش انداز میں قارئین کے سامنے پیش کرتی ہے اور یہی کیفیات حیدر قریشی کی نگارشات میں بدرجہءِ اُتم پائی جاتی ہیں۔'' (۸)

حیدر قریشی اپنے مضمون ''شام کی منڈیر سے'' میں وزیر آغا کی زندگی کے چند واقعات اور اُن کے ذہنی ارتقاء کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر وزیر آغا کی سوانح عمری کے اسلوبیانی انداز کے بارے میں بھی اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔

''شام کی منڈیر سے'' اپنے اسلوب کے لحاظ سے سوانح عمری، سیاحت نامہ اور سفر نامہ نگاری کا خوب صورت امتزاج ہے۔ وزیر آغا نے عمرِ رفتہ کو آواز نہیں دی بلکہ اب تک کی بیتی ہوئی زندگی کے نہاں خانے میں اپنے سارے سفر کو دہرایا ہے۔ یہ سفر کہیں ایک مسافر کے انداز میں سر ہوا ہے تو کہیں کسی سیاح کے روپ میں۔'' (۹)

حیدر قریشی اپنے چوتھے مضمون ''دو نظموں کا مطالعہ'' میں ڈاکٹر وزیر آغا کی دو طویل نظموں ''آدھی صدی کے بعد'' اور ''اک کتھا انوکھی'' کا فنی وفکری نقطہءِ نظر سے تجزیہ کرتے ہیں۔

''آدھی صدی کے بعد'' ڈاکٹر وزیر آغا کی منظوم آپ بیتی کے طور پر ۱۹۸۱ء میں منظرِ عام پر آئی جبکہ ''اک کتھا انوکھی'' منظوم جگ بیتی کے روپ میں ۱۹۹۰ء میں شائع ہوئی۔ اِن دونوں نظموں کا تنقیدی تجزیہ کرتے ہوئے حیدر قریشی اپنے نقطہءِ نظر کا اظہار کرتے ہیں۔

''آدھی صدی کے بعد'' وزیر آغا کی منظوم آپ بیتی ہے جبکہ ''اک کتھا انوکھی'' منظوم جگ بیتی ہے۔ آپ بیتی کا کمال یہ ہے کہ اس میں جگ بیتی کی ایک زیریں لہر ساتھ ساتھ چلی جاتی ہے جبکہ موجودہ جگ بیتی کا کمال یہ ہے کہ اس میں آپ بیتی کی ایک زیریں لہر ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ دونوں نظموں کے سفر اندر کے رستے سے طے ہوئے ہیں۔'' (۱۰)

دونوں طویل نظمیں اپنے اندر رمزیت اور اشاریت کے ساتھ ساتھ زندگی کے اُتار چڑھاؤ کو لیے ڈاکٹر وزیر آغا کی داستانِ حیات بیان کرتی محسوس ہوتی ہیں۔ اِسی لیے حیدر قریشی دونوں نظموں ''آدھی صدی کے بعد'' اور ''اک کتھا انوکھی'' کو ڈاکٹر وزیر آغا کے ''اندر کا سفر'' قرار دیتے ہوئے، قارئین پر اِن کی اہمیت یوں اجاگر کرتے ہیں۔

''دونوں نظمیں وزیر آغا کی بہترین ہی نہیں جدید ادب کی اعلیٰ ترین اور خوبصورت ترین نظمیں ہیں۔ ''آدھی صدی کے بعد'' نے نو سال کے عرصہ میں جدید نظم نگاروں پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ ''اک کتھا

انوکھی'' بھی جدید نظم نگاروں کی ایک نسل کو متاثر کرے گی اور نظم نگاری میں مزید تبدیلیاں پیدا کرے گی۔'' (۱۱)

''چھک اُٹھی لفظوں کی چھاگل'' ڈاکٹر وزیر آغا کے ۱۹۴۶ء سے لے کر ۱۹۹۰ء کے دوران تخلیق کردہ مطبوعہ شعری مجموعوں پر مشتمل کلیات ہے جو ۱۹۹۱ء میں منظرِ عام پر آیا۔ حیدر قریشی نے اس کلیات میں موجود نظموں کا فنی اور فکری تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر وزیر آغا کی شاعری کے ساتھ ساتھ، اُن کی شخصیت کے متعدد پہلوؤں کو بھی اپنے قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔

اپنے مضمون ''چھک اُٹھی لفظوں کی چھاگل'' میں حیدر قریشی ڈاکٹر وزیر آغا کی کائناتی اور سماجی دائروں میں سانس لیتی فلسفیانہ انداز وفکر سے بھرپور نظموں سے وزیر آغا کو ملنے والی اہمیت اور عظمت کی پیش گوئی کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''مجید امجد کی زندگی میں اس کی تفہیم پر توجہ نہیں دی گئی تھی لیکن اب مجید امجد کو سمجھا جانے لگا ہے۔ جب مجید امجد کو پوری طرح سمجھ لیا جائے گا تب وزیر آغا کی نظموں کی اہمیت اور عظمت کا بھی کھل کر اعتراف کیا جائے گا کیونکہ وزیر آغا کی نظم مجید امجد کی نظم سے آگے کی تخلیق ہے۔ تب ادبی سیاست دانوں کی سیاست گری کا طلسم وزیر آغا کی عظمت کی تخلیقات کے سامنے اسی طرح دھواں ہو جائے گا جس طرح مجید امجد کی نظم کے سامنے ہوا ہو گیا ہے۔'' (۱۲)

اپنے مضمون ''وزیر آغا کی غزلیں'' میں حیدر قریشی ڈاکٹر وزیر آغا کی روایت اور جدت سے مزین موضوعات اور علامتوں سے بھرپور غزلوں کو موضوعِ بحث بناتے ہوئے اپنے تنقیدی خیالات بیان کیے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی غزلیں اپنے فطری اور جدت وندرت سے ہم آہنگ نئی جہتوں کو روشناس کراتی ہے۔ غزلوں کے اس حقیقی اور فطری اظہار پر حیدر قریشی لکھتے ہیں۔

''وزیر آغا کی منزل اپنے عصر کو عبور کرنے کے بعد زیادہ بامعنی ہو جائے گی اور ایک عرصہ تک اس کے منفرد لہجے اور ذائقے سے نئی غزل کی عزت اور توقیر بنی رہے گی۔'' (۱۳)

''پہلا ورق'' ڈاکٹر وزیر آغا کے مجلّہ ''اوراق'' کے اداریوں پر مشتمل مرتب کردہ کتاب پر ہے۔ اس کو حیدر قریشی اور راغب شکیب نے اپنی مشترکہ کوششوں سے ترتیب دیا۔ اِس میں اوراق کے سب سے پہلے شمارہ کے اداریہ، ۱۹۶۶ء سے لے کر شمارہ جون، جولائی ۱۹۸۹ء تک کے تمام اداریے شامل کیے گئے ہیں۔ حیدر قریشی نے اس کتاب کا پیش لفظ ''پہلا ورق'' کے عنوان سے تحریر کیا اور یہی پیش لفظ حیدر قریشی کی کتاب ''ڈاکٹر وزیر آغا۔ عہد ساز شخصیت'' میں شامل کیا گیا ہے۔ ''پہلا ورق'' میں حیدر قریشی دعویٰ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''عہد آفریں رسالہ'' ''اوراق'' کے اداریوں کا یہ مجموعہ غالباً کسی ادبی جریدے کے اداریوں کا پہلا مجموعہ ہے۔'' (۱۴)

حیدر قریشی اِس مضمون میں ''اوراق'' کی اہمیت اور افادیت کی وضاحت کے ساتھ ساتھ اُردو انشائیہ

کے فروغ میں اہم کردار ادا کرنے پر ''اوراق'' کے اداریوں کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''تخلیقی سچائی کے اظہار میں ''اوراق نے آسمان کو نظر انداز نہیں کیا، لیکن زمین کی اہمیت کو بھی اجاگر کیا۔'' (۱۵)

''پہلا ورق'' کو ''ڈاکٹر وزیر آغا کی شخصیت کا اظہار'' کہتے ہوئے حیدر قریشی اپنی ناقدانہ بصیرت کا یوں اظہار کرتے ہیں۔

''اُن کے مزاج کا دھیما پن ''پہلا ورق'' کے ایک ایک لفظ سے عیاں ہے۔ تنقید میں ان کا انداز عموماً تمثیلی ہوتا ہے، چنانچہ ''پہلا ورق'' کا اسلوب بھی تمثیلی ہے۔ انشائیہ کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں مزید سوچ کی گنجائش بھی رہتی ہے۔...... انشائیہ ایک صنفِ ادب ہونے کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر وزیر آغا کی شخصیت کا ایک رنگ بھی ہے اور اس رنگ کی چمک ''پہلا ورق'' میں بھی نظر آتی ہے۔'' (۱۶)

اپنی کتاب ''ڈاکٹر وزیر آغا۔ عہد ساز شخصیت'' کے مضمون ''اردو انشائیہ اور اس کے بانی کی انشائیہ نگاری'' میں حیدر قریشی اُردو ادب میں انشائیہ نگاری اور ڈاکٹر وزیر آغا کو انشائیہ نگاری کے بانی کے طور پر متعارف کراتے ہیں۔ حیدر قریشی انشائیہ کے سلسلے میں کی جانے والی کوششوں اور وزیر آغا کو انشائیہ کا ''اظہار اولین'' قرار دیئے جانے پر اصرار کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

''وزیر آغا پہلے انشائیہ نگار بھی ہیں اور کمالِ فن کے لحاظ سے آخری بھی، لیکن انہوں نے اس صنف کے ارتقاء میں اپنی ذمہ داریوں سے کبھی پہلوتہی نہیں کی۔'' (۱۷)

اس کے ساتھ ساتھ ہی حیدر قریشی انشائیہ نگاری کے بارے میں دوٹوک لفظوں میں اپنا نقطہ نظر پیش کرتے ہیں۔

''معترفین اور مخالفین کی تمام تر منفی کاوشوں کے باوجود اُردو انشائیہ کے بانی وزیر آغا ہی رہیں گے۔'' (۱۸)

حیدر قریشی زیرِ تبصرہ مضمون میں ڈاکٹر وزیر آغا کی نظموں اور انشائیوں کے درمیان موجود ربط اور مشترک موضوعاتی رجحانات کے بارے میں بھی تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر وزیر آغا کی ناقدانہ صلاحیتوں کا بھی اعتراف کرتے ہیں۔ حیدر قریشی زیرِ تبصرہ کتاب کے مضمون ''ڈاکٹر وزیر آغا کی تنقید نگاری کا اجمالی جائزہ'' میں ڈاکٹر وزیر آغا کی ادبی زندگی کے آغاز و ارتقاء کے منفرد پہلوؤں کو اُن کی تصانیف کے حوالے سے پیش کرتے ہیں۔ حیدر قریشی اپنے اس مضمون میں وزیر آغا کی ادبی زندگی کے پہلے قلمی نام کا انکشاف کرتے ہیں۔

''وزیر آغا شروع میں نصیر آغا کے قلمی نام سے ''ادبی دنیا'' میں مضامین لکھتے رہے۔ ''محبت کا تدریجی ارتقاء'' ان کا پہلا مضمون تھا جو ان کے موجودہ نام کے ساتھ شائع ہوا۔'' (۱۹)

مضمون ''ڈاکٹر وزیر آغا کی تنقید نگاری کا اجمالی جائزہ'' میں حیدر قریشی نے ڈاکٹر وزیر آغا کی جس تنقیدی کتب پر روشنی ڈالی ہے، اُن کی ایک فہرست محمد وسیم انجم اس ترتیب سے پیش کرتے ہیں۔

''(۱) مسرت کی تلاش ۱۹۵۳ء (۲) اُردو ادب میں طنز و مزاح ۱۹۵۸ء (۳) نظم جدید کی کروٹیں

۱۹۶۳ء (۴) اُردو شاعری کا مزاج ۱۹۶۵ء (۵) تنقید اور احتساب ۱۹۶۸ء (۶) تخلیقی عمل ۱۹۷۰ء (۷) نئے تناظر ۱۹۷۹ء (۸) نئے مقالات ۱۹۷۲ء (۹) تصوراتِ عشق و خرد (اقبال کی نظر میں) ۱۹۷۷ء (۱۰) تنقید اور مجلسی تنقید ۱۹۸۱ء (۱۱) دائرے اور لکیریں ۱۹۸۶ء (۱۲) تنقید اُردو تنقید ۱۹۸۹ء (۱۳) انشائیہ کے خدوخال ۱۹۹۰ء (۱۴) ساختیات اور سائنس ۱۹۹۱ء۔'' (۲۰)

''ڈاکٹر وزیر آغا۔ ایک مطالعہ'' ڈاکٹر انور سدید کی ڈاکٹر وزیر آغا پر ایک تنقیدی کتاب ہے۔ زیرِ تبصرہ مضمون میں حیدر قریشی کے وزیر آغا سے عقیدت و محبت سے بھرے تعلق اور اُن پر تنقیدی کتب تحریر کرنے پر ڈاکٹر انور سدید کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''ڈاکٹر انور سدید مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ڈاکٹر وزیر آغا ایسی عہد آفریں ادبی شخصیت کی زندگی میں ہی ان کے بارے میں ایک پُر مغز کتاب لکھ دی۔'' (۲۱)

کتاب ''ڈاکٹر وزیر آغا۔ عہد ساز شخصیت'' کے آخر میں حیدر قریشی نے ڈاکٹر وزیر آغا سے کیے گئے انٹرویو کو ''وزیر آغا سے کچھ باتیں'' کے عنوان سے شامل کیا ہے۔ یہ انٹرویو وزیر آغا کے فکر و فن کے متعدد گوشوں کو بے نقاب کرتا ہے اور ساتھ ہی اُن کے تصوف، سائنس، انشائیہ نگاری، ماہیا نگاری اور اُن کی تخلیقات کے بارے میں تاثرات و خیالات کا احوال بھی پیش کرتا ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب میں حیدر قریشی ڈاکٹر وزیر آغا کو ''عہد ساز شخصیت'' کا خطاب دیتے ہوئے اُن کی تخلیقی شخصیت کے بارے میں اپنی عقیدت و محبت کا یوں اظہار کرتے ہیں۔

''اُردو انشائیہ کے بانی۔ جدید تر نظم کے پیش رو، اُردو تنقید کی منفرد اور عالمانہ آواز۔ ڈاکٹر وزیر آغا عہد ساز شخصیت ہیں۔ اپنی بعض بشری کمزوریوں کے باوجود ہمارے ادب اور ہمارے عہد کا بہت بڑا سرمایہ ہیں۔ مجھے فخر ہے کہ مجھے ان سے اکتسابِ علم اور نیاز مندی کا شرف حاصل ہے۔'' (۲۲)

حیدر قریشی کے تنقیدی فکر و فن کو دیکھتے ہوئے اُن کی کتاب ''ڈاکٹر وزیر آغا۔ عہد ساز شخصیت'' کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اپنے ذاتی تعلقات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے وزیر آغا کی شخصیت کے متعدد گم شدہ پہلوؤں کو قاری کے سامنے پیش کیا ہے۔ اِسی لیے حیدر قریشی کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''میری اس کتاب کا مقصد وزیر آغا کو منوانا نہیں ہے کیونکہ وہ ماننے منوانے کی سطح سے بہت اُوپر ہیں۔ اس کا مقصد صرف اتنا ہے کہ جو لوگ وزیر آغا سے واقف نہیں ہیں وہ ان سے ملاقات کر سکیں اور جو پہلے سے واقف ہیں وہ ایک نئی ملاقات محسوس کر سکیں۔'' (۲۳)

محمد وسیم انجم بھی حیدر قریشی کی اِس کتب ''عہد ساز شخصیت'' کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''بحیثیت مجموعی حیدر قریشی کا ایسی شخصیت پر قلم اٹھانے کا مقصد تعارف کرانا نہیں بلکہ اُن کی زندگی کے بعض ایسے گوشے بے نقاب کرنا مقصود ہے جو قاری کے لیے دلچسپی کا باعث ہیں۔ چنانچہ شخصیت نگار کو زیرِ بحث

شخصیت سے قربت کا دعویٰ ہے......جس کی بدولت ڈاکٹر وزیر آغا ایسی مشہور شخصیت کے بارے میں یہ کتب معتبر دستاویز کی حیثیت اختیار کرگئی ہے۔'' (۲۴)

بلاشبہ حیدر قریشی کی یہ کتاب ڈاکٹر وزیر آغا سے متعلق تمام معلومات فراہم کرتی ہے۔اپنی سادہ زبان اور مخصوص تنقیدی انداز کی بدولت ادب میں خاص اہمیت کی حامل سمجھی جائے گی۔

(ب)اُرد و میں ماھیا نگاری:

''اُردو میں ماہیا نگاری'' حیدر قریشی کی تحقیقی وتنقیدی تصنیف ہے۔۱۵۹ صفحات پر مشتمل اِس کتاب کی اشاعت ۱۹۹۷ء میں فرہاد پبلی کیشنز اسلام آباد کی جانب سے کی گئی۔کتاب کا انتساب حیدر قریشی نے یوں تحریر کیا ہے۔

''قمر جلال آبادی اور ساحر لدھیانوی کے نام جنہوں نے اُردو میں درست ماہیا نگاری کے مثالی نمونے عطا کیے اور خوبصورت گلوکاروں محمد رفیع، آشا بھونسلے اور مسرت نذیر کے نام جن کے گائے ہوئے ماہیے، ماہیا نگاری کی بحث میں مستقل حوالہ بن گئے ہیں۔''(۲۵)

''اُردو میں ماہیا نگاری'' کے ابتدائیہ میں حیدر قریشی ماہیا نگاری کی تحریک اور ماہیا کے بارے میں اختلافات پر اظہار رائے کرتے ہوئے اپنی کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''ماہیا'' کتابِ دل ہے۔اس کتاب میں ماہیے کی .... پنجابی اور اُردو ماہیے کی مختصر سی کہانی کے ساتھ ''کتاب دل'' کی چھوٹی سی تفسیر بھی کی گئی ہے۔''(۲۶)

زیر تبصرہ کتاب میں حیدر قریشی اپنی تحقیق وتنقید کے جوہر دکھاتے ہوئے ماہیا کو پنجاب لوک گیت کا نام دیتے ہیں۔ماہیا کا لفظ ماہی سے نکلا ہے جو کہ محبوب، عاشق وغیرہ کے معنوں میں استعمال ہوتا آیا ہے۔حیدر قریشی ماہیے کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''ماہیے میں پنجاب کے عوام کے جذبات، احساسات اور خواہشات کا خوب صورت اور براہ راست اظہار ملتا ہے۔عوام نے اپنی امنگوں، آرزوؤں اور دعاؤں کو اس شاعری کے ذریعے سینہ بہ سینہ آگے بڑھایا اور زندہ رکھا۔ اسی لیے یہ عوامی گیت اپنی ظاہری صورت میں انفرادی ہونے کے باوجود اپنی سوسائٹی کی ترجمانی کرتا ہے۔''(۲۷)

ماہیے کے وزن کا مسئلہ بیان کرتے ہوئے حیدر قریشی ماہیا کی تحریری صورت کے بارے میں اختلاف رائے کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''جب ماہیے کو تحریری صورت میں دیکھنے کے باعث اس کے دوسرے مصرعہ کے وزن کا مسئلہ اتنا الجھا ہوا ہے تو کسی درست نتیجے تک کیسے پہنچا جا سکتا ہے؟......اس سلسلے میں میرا مؤقف یہ ہے کہ ماہیا اصلاً لوک گیت ہے جس کی اپنی مخصوص دھن ہے۔بس اسی دھن میں ہی اس کا اصل وزن موجود ہے۔''(۲۸)

پھر انہی دھنوں کو ماہیے کے اصل وزن کا معیار بنا کر حیدر قریشی ماہیا کے اصل وزن کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''ماہیے کا پہلا مصرع اور تیسرا مصرع ہم وزن ہوتے ہیں لیکن دوسرا مصرع ان کے وزن سے ایک سبب یعنی دو حرف کم ہوتا ہے۔''(۲۹)

ماہیا نگاری کے فن میں حیدر قریشی کی اس قدر عمدہ تنقید وتحقیق کی تعریف کرتے ہوئے ڈاکٹر انور سدید اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔

''یہ بات نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ بعض شعراء نے محض لاعلمی میں ماہیا کے تین مصرعوں کو ہم وزن کر دیا تو جناب حیدر قریشی نے اس ''بےشعوری'' غلطی کی طرف نہ صرف توجہ دلائی بلکہ غلطی کے استیصال کے لیے تحریک بھی جاری کر دی......کوششیں رنگ لا رہی ہیں اور اب ماہیا اوزان کی صحیح تکنیک میں لکھا جا رہا ہے۔''(۳۰)

مذکورہ کتاب میں حیدر قریشی ''اُردو میں ماہیا نگاری کی ابتداء'' مضمون میں ابتدائی ماہیا نگاروں چراغ حسن حسرت اور قمر جلال آبادی کے ماہیوں کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے بحث کرتے ہیں۔ چراغ حسن حسرت کے ماہیوں کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''چراغ حسن حسرت...... نے ۱۹۳۷ء میں پنجابی ماہیے کے حسن سے متاثر ہو کر اُردو میں چند ''ماہیے'' کہے......پنجابی ماہیے کی جادوگری اور چراغ حسن حسرت کی ماہیے سے محبت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن حسرت پنجابی ماہیے کے وزن کی نزاکت کا خیال نہیں رکھ سکے۔''(۳۱)

چراغ حسن حسرت کے ماہیوں کے تقریباً ۲۰ سال بعد فلم پھاگن کے لیے پہلی بار اُردو ماہیے قمر جلال آبادی سے لکھوا کر پیش کیے گئے۔ان ماہیوں کو محمد رفیع اور آشا بھونسلے نے بڑی مہارت سے گایا تھا۔ماہیوں کے بول یہ تھے۔

تم روٹھ کے مت جانا
ترا مرا کیا رشتہ
دیوانہ ہے دیوانہ
کیوں ہو گیا بے گانہ
مجھ سے کیا شکوہ
یہ تو نے نہیں جانا (۳۲)

قمر جلال آبادی کے ان ماہیوں کے وزن پر حیدر قریشی تبصرہ کرتے ہوئے اِس بات کو تسلیم کرتے ہیں۔

''یہ ماہیے اُردو کے سب سے پہلے ماہیے ہیں جو پنجابی ماہیے کے وزن پر پورے اترتے ہیں۔اس لحاظ سے قمر جلال آبادی اُردو کے سب سے پہلے ماہیا نگار قرار پاتے ہیں۔'' (۳۳)

چراغ حسن حسرت اور قمر جلال آبادی کی ماہیا نگاری پر بات کرنے کے ساتھ ساتھ حیدر قریشی ایسے ماہیا نگاروں پر بھی تبصرہ کرتے ہیں جنہوں نے تین ہم وزن مصرعوں کے ثلاثی ماہیے تخلیق کیے۔حیدر قریشی اِن ثلاثی ماہیا نگاروں میں علی محمد فرشی، نصیر احمد ناصر اور سیدہ زاہدہ حنا کا ذکر کرتے ہیں۔

''ماہیے کے وزن اور مزاج کی بحث ۱۹۹۲ء تا ۱۹۹۳ء'' مضمون میں حیدر قریشی ۱۹۹۲ء سے لے کر ۱۹۹۳ء کے دورانیہ میں ماہیا نگاری کے فن پر چھپنے والے مضامین کا تنقیدی تجزیہ کرتے ہوئے اِن مضمون نگاروں

کی آراءکو بیان کرتے ہیں۔زیرِ بحث مضمون میں ہی حیدر قریشی ۱۹۹۲ءتا ۱۹۹۳ءمیں چھپنے والے مضامین اور نئے درست وزن پر لکھنے والے ماہیا نگاروں کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔

''۹۳۔۱۹۹۲ءاُردو ماہیے کی تاریخ میں اس لحاظ سے بے حد اہم برس ہیں کہ ان دو برسوں میں ماہیے کے خدوخال اور مزاج کی بحث کے سلسلے میں نو مضامین لکھے گئے اور ہر مضمون میں ہمارے بیان کردہ وزن کو بہر حال تسلیم کیا گیا...... اِن دو برسوں میں درست وزن میں ماہیا نگاری کی طرف سے بھی پیش قدمی ہوئی۔امین خیال،سعید شباب،خاور اعجاز،نذیر فتح پوری،رشید اعجاز،غزالہ طلعت،رانا غلام شبیر،نوید رضا،تنویر نوازش،اجمل جنڈیالوی،شبہ طراز،ارشد نعیم،نذر عباس ان دو برسوں میں ماہیا نگار کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آئے۔''(۳۴)

مضمون ''ماہیے کے وزن اور مزاج کی بحث (۱۹۹۴ءتا ۱۹۹۶ء)'' میں بھی حیدر قریشی مختلف ماہیا نگاروں کے خطوط اور مضامین کو پیش کرتے ہیں اور اُن کے ماہیے کے بارے میں فنی وفکری سوچ اور خیالات کو موضوع بناتے ہیں۔۱۹۹۴ءتا ۱۹۹۶ءکے دورانیہ میں ماہیا نگاری پر ہونے والی بحث وتکرار کو سامنے رکھتے ہوئے حیدر قریشی یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔

''۱۹۹۶ءکے آخر تک ماہیے کے وزن اور مزاج کو سمجھنے کے لیے اور حقیقت کو واضح کرنے کے لیے جو مخلصانہ کوششیں ہوئیں ان سے نہ صرف ان مسئلوں کے کئی پہلو کھل کر سامنے آئے بلکہ اصل حقائق بھی روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گئے...... ماہیے کے مزاج کی تفہیم میں بھی پیش رفت ہوئی۔وزن اور مزاج کو ملحوظ رکھتے ہوئے ماہیے کے موضوعات میں بتدریج وسعت پیدا ہو رہی ہے،الفاظ کے برتاؤ میں بھی عمدہ تجربے ہو رہے ہیں۔یہ ساری صورت حال خوش کن ہے۔''(۳۵)

مذکورہ کتاب میں حیدر قریشی ماہیا نگاری کے فروغ کے لیے کی گئی کوششوں اور بحثوں کو اپنے مضمون ''حاصل بحث''میں حتمی انداز سے بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''ماہیے کے وزن کے بارے میں اب پورے یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ تین یکساں وزن کے مصرعوں والے''ماہیے'' حقیقتاً ماہیے نہیں۔ماہیے کی پنجابی اور عوامی دھن سے یہ وزن اُردو ماہیے کے لیے بالکل واضح ہو چکا ہے۔''

فعلن فعلن فعلن
فعلن فعلن فع
فعلن فعلن فعلن

''اس کی رو سے ماہیے کے دوسرے مصرعہ میں ایک''سبب''یعنی دو حرف کا کم ہونا ضروری ہے اس وزن میں ماہیا پنجابی دھن کے مطابق پوری طرح رواں دواں ہو جاتا ہے۔یہ دوسرا وزن بھی ماہیے کے لیے قابل قبول ہے۔

مفعول مفاعیلن
فعل مفاعیلن

مفعول مفاعیلن''(۳۶)

ماہیا نگاری میں حیدر قریشی کے تحقیقی وتنقیدی رجحانات اور کوششوں کو تسلیم کرتے ہوئے عارف فرہاد لکھتے ہیں۔

''مجھ سمیت ماہیا نگاروں کا پورا قبیلہ اس بات کو تسلیم کر چکا ہے کہ حیدر قریشی نے ماہیا نگاروں کو درست وزن کی نشاندہی کرانے کے ساتھ ساتھ اُردو ادب کی تاریخ میں ماہیے کی ہیئت،مزاج اور وزن کے حوالے سے انفرادی نوعیت کا نہایت اہم تحقیقی اور تنقیدی کام کیا ہے۔''(۳۷)

مضمون''ہمارے ماہیا نگار''میں حیدر قریشی نے اُردو ادب کے معلوم تمام ماہیا نگاروں کے تعارف کے طور پر اُن کے ماہیوں کو درج کیا ہے۔ان ماہیا نگاروں کی کل تعداد کے بارے میں حیدر قریشی لکھتے ہیں۔

''قاضی اعجاز محور سے شاہدہ ناز تک درج ماہیا نگاروں کی تعداد ۶۲ بنتی ہے۔اس کی تعداد میں قمر جلال آبادی،ساحر لدھیانوی اور حیدر قریشی کے نام بھی شامل کر لیں تو تادم تحریر ماہیا نگاروں کی تعداد ۶۵ تک جا پہنچتی ہے۔ان ماہیا نگاروں میں قمر جلال آبادی اور ساحر لدھیانوی کو اُردو ماہیے کے بانی قرار دیا جاسکتا ہے۔''(۳۸)

مضمون''اُردو ماہیے کے موضوعات''میں حیدر قریشی مختلف ماہیا نگاروں کے ماہیوں کے موضوعاتی برتاؤ پر تبصرہ کرتے ہوئے اُن کے ماہیوں کو بطور مثال پیش کرتے ہیں۔حمد،نعت،دعا،رشتے داریاں،دھرتی،دیہاتی ماحول،تقریبات،زندگی کے مسائل،محبت اور اس سے جڑے ہوئے مضامین سب ماہیے کے موضوعات کی ترجمانی کرتے ہیں۔

متعدد شعراء کرام کی ماہیے کے لیے رغبت کو دیکھتے ہوئے حیدر قریشی اپنی رائے کا اظہار یوں کرتے ہیں۔

''یہ ابھی اُردو ماہیے کی ابتداء ہے۔مجھے امید ہے کہ آنے والے برسوں میں ماہیا اپنے خدوخال اور مزاج کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے موضوعات میں وسعت پیدا کرے گا اور پنجاب کا یہ لوک گیت اپنے رس اور مٹھاس کے باعث''اُردو شاعری کی ایک مقبول صنف''قرار پائے گا۔''(۳۹)

کتاب''اُردو میں ماہیا نگاری''کے آخر میں حیدر قریشی نے''خصوصی مطالعہ''میں چند ماہیا نگاروں کے فن پر تنقیدی اور فکری تجزیہ کیا ہے۔اِن ماہیا نگاروں کے نام مندرجہ ذیل ہیں۔(۱)امین خیال(۲)عارف فرہاد(۳)ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی(۴)پروفیسر قمر ساحری(۵)پروین کمار اشک(۶)نذیر فتح پوری(۷)یوسف اختر(۸)انور مینائی(۹)سعید شباب۔کتاب کے آخری حصے میں اختتامیہ اور فہرست کتب، رسائل اور اخبارات شامل ہیں۔

کتاب''اُردو میں ماہیا نگاری''میں حیدر قریشی نے اپنی تنقیدی اور تحقیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے مستقبل کے ماہیا نگاروں کے لیے علمی،ادبی اور تحقیقی سطح پر ہزاروں در کھول دیئے ہیں جن میں سے ہر در اپنے اندر محققانہ انداز وبیاں اور جدت وندرت کو سموئے اپنے قارئین اور ساتھی نقادوں کو متاثر کرتا محسوس ہوتا ہے۔اِسی لیے حیدر قریشی اپنی تصنیف''اُردو میں ماہیا نگاری''کے بارے میں دعویٰ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''اُردو میں ماہیا نگاری''کا یہ اختتامیہ ماہیے کی بحث کا اختتام نہیں ہے بلکہ علمی،ادبی اور تحقیقی زبان

میں بات کرنے والوں کے لیے ایک بڑی سطح پر یہ نقطۂ آغاز ہے۔ مجھے امید ہے کہ ماہیے کے خدوخال کو نکھارنے اور سنوارنے کے لیے تخلیقی اور تحقیقی دونوں لحاظ سے مزید پیش رفت ہوگی۔'' (۴۰)

(ج) اُردو ماہیے کی تحریک:

''اُردو ماہیے کی تحریک'' حیدر قریشی کے تنقیدی مضامین اور خطوط پر مبنی کتاب ہے جو فرہاد پبلی کیشنز، راول پنڈی سے ۱۹۹۹ء میں شائع ہوئی۔ حیدر قریشی نے اس کا انتساب ''اُردو ماہیے کے بانی، ہمت رائے شرما جی کے نام'' کیا ہے۔ ۱۶۶ صفحات پر مشتمل اِس کتاب میں حیدر قریشی نے متعدد مضامین اور خطوط کو شامل کیا ہے جو ماہیا نگاری کے فن کے کئی اسرار و رموز کو قاری پر فاش کرتے ہیں۔

حیدر قریشی کتاب کے ''حرف اول'' میں ''اُردو ماہیے کی تحریک'' کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''اُردو میں ماہیا نگاری'' یک موضوعی کتاب تھی۔ اسے لکھتے وقت میں ۱۹۹۴ء کے پائیدان پر کھڑا ہو کر گزشتہ چھ برسوں کی بحث کا منظر دیکھ رہا تھا۔ جبکہ ''اُردو ماہیے کی تحریک'' کے مضامین فاصلے سے منظر کو دکھانے کی بجائے لمحہ لمحہ کی کہانی سناتے ہیں۔ ماہیے کی بحث کے ریکارڈ کی درستی کے لیے چند اہم خطوط بھی اس مجموعہ میں شامل ہیں۔ ان مضامین اور خطوط سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ماہیے کو سمجھنے کے عمل میں بتدریج بہتری آتی گئی ہے۔'' (۴۱)

حیدر قریشی ماہیا اور اس کے دوسرے مصرعے کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ ماہیا بنیادی طور پر گائی جانے والی صنف ہے اور مختلف دھنوں میں گائے جانے کے باوجود ہر دھن میں اس کا اصل وزن واضح ہوجاتا ہے۔ گانے کی دھن پر ماہیے کے مصرعوں کے وزن کے بارے میں حیدر قریشی لکھتے ہیں۔

''کسی بھی گانے کی دھن میں ماہیے کا پہلا مصرعہ اٹھاتے وقت جو لے ہوتی ہے تیسرے مصرعے کو بھی اسی طرح اٹھایا جاسکتا ہے لیکن دوسرے مصرعے کو پہلے مصرعہ کے انداز میں اٹھانا چاہیے تو لے ٹوٹ جاتی ہے اور آخری دونوں مصرعے یکساں وزن کے ہیں لیکن دوسرا مصرعہ اس وزن میں نہیں ہے۔'' (۴۲)

اِسی طرح مضمون ''ماہیے کے بارے میں چند باتیں'' میں حیدر قریشی ماہیے کے وزن پر واضح انداز سے اظہار خیال کرتے ہیں۔

''ماہیے کو گہری نظر سے نہ دیکھا جائے تو یہ تین مساوی الوزن مصرعوں کی مختصر نظم دکھائی دیتی ہے لیکن اس کی مخصوص دھن میں چھپے ہوئے اس کے اصل وزن کو دریافت کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا پہلا اور تیسرا مصرعہ مساوی الوزن ہیں لیکن درمیان والا دوسرا مصرعہ اس وزن سے دو حرف کم ہے۔'' (۴۳)

زیر تبصرہ کتاب میں حیدر قریشی ماہیا کو بنیادی طور پر لوک شاعری قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

''ایسے تمام اُردو ماہیے جو پنجابی ماہیے کی دھن پر آسانی سے گنگنائے جاسکتے ہیں وہی درست ماہیے ہیں۔ اُردو میں تین یکساں مصرعوں کے ثلاثی کو اور جو نام دے دیا جائے لیکن وہ ماہیے نہیں ہیں۔'' (۴۴)

مجموعہ کلام ''محبت کے پھول'' کے پیش لفظ میں حیدر قریشی ماہیے کے وزن کو ایک مثال سے واضح کرتے ہیں۔

''اُردو میں ماہیے کا وزن ابھی تک دو صورتوں میں سامنے آیا ہے اور یہ دونوں وزن پنجابی ماہیے کے مطابق درست ہیں۔

(۱) فعلن فعلن فعلن
کچھ رشتے ٹوٹ گئے
فعلن فعلن فع
برتن مٹی کے
فعلن فعلن فعلن
ہاتھوں سے چھوٹ گئے

(۲) مفعول مفاعیلن
مل مہکی فضاؤں سے
فعل مفاعیلن
یار نکل باہر
مفعول مفاعیلن
اندر کے خلاؤں سے'' (۴۵)

حیدر قریشی اپنے مضامین ''اُردو ماہیا ۱۹۹۶ء میں'' اور اُردو ماہیا ۱۹۹۷ء میں'' اُردو ماہیا کے اصل وزن کے مطابق شاعری کرنے والوں کی طویل فہرست کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی رائے کا کچھ یوں اظہار کرتے ہیں:

''پنجابی ماہیے کے وزن والا ماہیا اب اُردو میں نہ صرف ٹھیک طرح پہچانا جاچکا ہے بلکہ تمام تر مخالفتوں کے باوجود شعراء کرام میں مسلسل مقبولیت بھی حاصل کر رہا ہے۔ مجھے امید ہے کہ اب ماہیے کی تفہیم اور ترویج کے لیے بات اس کے وزن کی بحث سے آگے بڑھے گی اور ادب میں اس کے ادبی اور ثقافتی کردار کی اہمیت پر غور کیا جائے گا۔'' (۴۶)

مضمون ''ماہیے کی کہانی'' میں حیدر قریشی نے ڈاکٹر کرسٹینا اوسٹر ہیلڈ کے ماہیا پر اٹھائے جانے والے سوالات کے جوابات درست ماہیا لکھنے والے ماہیا نگاروں کے ذریعے اور خود اپنے تنقیدی اور شعوری اندازِ بیان کے ذریعے دیئے ہیں۔ حیدر قریشی ڈاکٹر کرسٹینا کے سوالات کو ماہیا نگاروں کے لیے مشعل راہ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر کرسٹینا نے اپنے اہم سوالات اٹھا کر ماہیے کی تحریک کو مزید آگے کی راہ سجھائی ہے۔ امید کرتا ہوں کہ ماہیے سے دلچسپی رکھنے والے سنجیدہ ناقدین اور خود ہمارے ماہیا نگار بھی ادب میں ماہیے کے رول پر غور و فکر سے کام لیں گے''۔ (۴۷)

زیر تبصرہ کتاب میں حیدر قریشی ماہیا کی پابند لے پر اپنے موقف کو مزید دہراتے ہیں کہ ماہیا پنجابی لوک گیت ہے۔ اس کی مخصوص لے ہے اور ماہیا اپنی لے کا پابند ہے۔ اگر اس لے کے مطابق کہے گئے ماہیے تحریری

صورت میں دیکھ کر کسی کو جھٹکا لگتا ہے یا اس کی ''موزونیءطبع'' متاثر ہوتی ہے تو صرف اس لیے کہ اس نے ماہیا لوک گیت کے طور پر نہیں سنا۔ (۴۸)

فن ماہیا نگاری میں ان تنقیدی اور تحقیقی نکتوں کو'' اُردو ماہیے کی تحریک'' میں بیان کرنے کے علاوہ حیدر قریشی نے اس کتاب میں'' اردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما'' کے بارے میں بھی اپنا تحقیقی مضمون شامل کیا ہے جو اُن کی تحقیقی تصنیف'' اردو ماہیے کے بانی، ہمت رائے شرما'' میں بھی موجود ہے۔اس کے علاوہ حیدر قریشی نے'' اردو ماہیے کی تحریک'' کے سلسلے میں چند خطوط بھی شامل کیے ہیں جو کہ اُردو ماہیا کے رجحانات اور اُن کے بارے میں ماہیا نگاروں کی مختلف آراء کی ترجمانی کرتے ہیں۔

بحیثیت مجموعی حیدر قریشی کی یہ کتاب اُردو ماہیا اور اس کی تحریک کے متعلق معلومات سے بھرپور ہے اور تحقیقی وتنقیدی موضوعات نے اس کی مقبولیت اور ادبی قدر و قیمت میں اضافہ کر دیا ہے۔

(د) اُردو ماھیے کے بانی ،ھمت رائے شرما:

''اُردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما'' حیدر قریشی کی تحقیق وتنقید پر مشتمل کتاب ہے۔ ۷۲صفحات پر مبنی یہ کتاب ۱۹۹۹ء میں'' معیار پبلی کیشنز، دہلی'' کی جانب سے شائع ہوئی۔زیر تبصرہ کتاب کا انتساب ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کے نام ہے جنھوں ے اُردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما جی کو پہلی بار دریافت کیا۔ (۴۹)

کتاب کی ترتیب میں پیش لفظ'' اردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما''،'' اُردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما''، فلم'' خاموشی'' کے گیت اور تحقیق مزید، ''میاں آزاد'' کا سفر نامہ''،'' ہمت رائے شرما کی شاعری۔ ایک تعارف''، ''ہمت رائے شرما کی دو کتابیں''،'' ہمت رائے شرما بنام حیدر قریشی'' اور آخر میں'' ہمت رائے شرما کے ماہیے'' شامل کیے گئے ہیں۔

حیدر قریشی زیر تبصرہ کتاب کے'' پیش لفظ'' میں'' ارد ماہیے کے بانی'' کے بارے میں اپنی سابقہ تحقیق جو چراغ حسن حسرت اور قمر جلال آبادی کے متعلق تھی کو مدلل انداز سے رد کرتے ہوئے اس کا جواز پیش کرتے ہیں:

''اب قمر جلال آبادی کی جگہ ہمت رائے شرما جی ہی اردو ماہیے کے بانی ہیں،کسی بھی دوسری'' سہ مصرعی صنف'' کے مصنف کو اردو ماہیے کے بانی، ہمت رائے شرما جی کی جگہ نہیں دی جا سکتی''۔(۵۰)

اپنے مضمون'' اردو ماہیے کے بانی۔۔۔ہمت رائے شرما'' میں حیدر قریشی، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی تحقیق و تنقید کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی تازہ تحقیق اور ہمت رائے شرما جی کی اولیت پر ہونے والے اعتراضات کا جواب دیتے ہیں۔

مذکورہ مضمون میں حیدر قریشی، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی تحقیق کے معاملے میں آنے والے دو ردعملوں کا ذکر کرتے ہیں کہ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی تحقیق کے بعد ایک ردعمل یہ آیا کہ اکثر ماہیا نگاروں نے ان کی تحقیق کو سراہتے ہوئے تسلیم کیا کہ'' ہمت رائے شرما'' ہی اردو ماہیا کے بانی ہیں۔دوسرا ردعمل، حسرت کے ثلاثی ماہیوں کی پیروی کرنے والے ماہیا نگاروں مثلاً علی محمد فرشی، نصیر احمد ناصر، سیدہ حنا، دیپک قمر کی طرف سے یہ آیا کہ

ڈاکٹر مناظر نے اردو ماہیے کے بنیاد گزاروں میں قمر جلال آبادی اور ساحر لدھیانوی کے ساتھ چراغ حسن حسرت کو بھی تسلیم کیا ہے اور ساتھ ہی یہ موقف بھی بیان کیا گیا کہ اولیت کا سہرا پھر بھی حسرت کے سر بندھتا ہے۔ کیونکہ شرما جی کہتے ہیں۔فلم'' خاموشی ۱۹۳۹ء میں آئی جب کہ فلم'' باغباں'' میں حسرت کے ماہیے ۱۹۳۷ء میں آ گئے تھے۔ (۵۱)

مزید تحقیقی کوششوں اور چند ادبی شواہد کو مدنظر رکھتے ہوئے'' ہمت رائے شرما'' کے بارے میں حیدر قریشی لکھتے ہیں:

''۱۹۱۹ء میں ۱۷ سال جمع کیے جائیں تو فلم'' خاموشی'' کے ماہیے لکھنے کا سال ۱۹۳۶ء بنتا ہے جب تک کوئی نیا تحقیقی ثبوت نہیں ملتا تب تک فلم'' خاموشی'' کے لیے شرما جی کے اردو ماہیے لکھنے کا سال ۱۹۳۶ء ثابت ہے۔'' (۵۲)

ڈاکٹر عاشق ہرگانوی کی تحقیق کو مزید موثر بنانے کے لیے حیدر قریشی نے خود'' ہمت رائے شرما'' سے براہ راست رابطہ قائم کیا، جس سے حاصل ہونے والی معلومات اور حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے حیدر قریشی اپنی رائے کا اظہار ان لفظوں میں کرتے ہیں:

''ان تمام شواہد اور حقائق کی بنیاد پر یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ قمر جلال آبادی اور ساحر لدھیانوی سے بھی پہلے اردو ماہیے کے درست وزن کا اولین اظہار ہمت رائے شرما جی نے ۱۹۳۶ء میں کیا تھا۔۔۔سو بلاشک و شبہ ہمت رائے شرما اردو ماہیے کے بانی ہیں۔'' (۵۳)

'' اردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما''، فلم'' خاموشی'' اور تحقیقِ مزید'' مضمون میں حیدر قریشی ہمت رائے پوری کے بارے میں اپنی مزید تحقیق کو بیان کرتے ہیں۔اس تحقیق کا اہم سبب فلم'' خاموشی'' کی بک لیٹ تھی۔جس سے یہ تصدیق ہوئی کہ:

'' فلم'' خاموشی'' کی بک لیٹ پر مئی ۱۹۳۶ء کا اندراج یہ ثابت کرتا ہے کہ ہمت رائے شرما جی نے ۱۹۳۶ء میں پہلی بار اس فلم کے لیے اردو ماہیے لکھے''۔ (۵۴)

اس تصدیق کے علاوہ حیدر قریشی نے فلم'' خاموشی'' کی بک لیٹ (Booklet) پر درج گیتوں کو بھی اپنے مضمون کا حصہ بنایا۔

اپنے مضمون'' میاں آزاد کا سفر نامہ'' میں حیدر قریشی نے ہمت رائے شرما کو بطور ایک عمدہ پیروڈی نگار، خوبصورت مزاح نگار اور زبان پر حیرت انگیز قدرت رکھنے والا ادیب قرار دیتے ہوئے ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا اعتراف کیا ہے جو'' میاں آزاد کا سفر نامہ'' لکھ کر سامنے آتی ہیں۔حیدر قریشی اس کتاب کا تحقیقی وتنقیدی تجزیہ کرتے ہوئے'' ہمت رائے شرما'' کے بارے میں لکھتے ہیں:

'' ہمت رائے شرما جی نے رتن ناتھ سرشار کے انداز بیان کو اپنانے میں اپنی مہارت کا کمال دکھایا۔ '' میاں آزاد کا سفر نامہ'' صرف پیروڈی ہی نہیں ہے۔پیروڈی کے روپ میں ہمیں اپنے کلاسیکل لٹریچر کی اہمیت کا احساس دلایا گیا ہے۔اس کی طرف راغب کرنے کے لیے ایک تخلیقی کاوش کی گئی ہے۔'' (۵۵)

زیرتبصرہ کتاب کے مضمون ''ہمت رائے شرما کی شاعری۔ایک تعارف'' میں حیدر قریشی، ہمت رائے شرما جی کے شعری مجموعہءکلام ''شہابِ ثاقب'' کا تنقیدی اور فکری تجزیہ کرنے کے ساتھ ساتھ ہمت رائے شرما جی کی تعریف کرتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں:

''ہمت رائے شرما جی کا یہ بیان سو فی صد درست ہے کہ شاعری فقیروں کا حصہ ہے ہمت رائے شرما نے خوبصورت شاعری کی، جب فلمی دنیا میں مقتدر ہستی تھے تب اپنے اس فقیری اثاثے کو چھپائے رکھا۔جب فلمی دنیا سے الگ ہوگئے تو اپنا فقیری سرمایہ لے آئے۔میں سمجھتا ہوں کہ ۱۹۶۴ء کی بجائے ۱۹۸۴ء میں اپنا مجموعہ چھپوانے کی اصل وجہ یہی فقیرانہ جذبہ تھا۔'' (۵۶)

شاعری کے علاوہ حیدر قریشی نے مذکورہ کتاب میں ہمت رائے شرما کی دو کتابوں ''ہندو مسلمان'' اور ''نکات زباندانی'' پر بھی اپنا نقطہءنظر پیش کیا ہے۔اس کے علاوہ حیدر قریشی نے اپنے نام لکھے گئے ہمت رائے شرما کے خط کو بھی صفحہ ۵۲ پر شامل کیا ہے جو کہ ان دونوں کے درمیان رابطے کا ثبوت پیش کرتا ہے۔

کتاب ''اردو ماہیے کے بانی۔ہمت رائے شرما'' کے آخر میں حیدر قریشی نے ہمت رائے شرما کے ماہیے تحریر کیے ہیں۔جن میں سے چند ایک مندرجہ ذیل ہیں:

''ماہیے کی کہانی ہے
ماہیے کی دھن میں
ماہیے کی زبانی ہے''

دو پھول گلاب کے ہیں
بھنگڑا اور ماہیا
تحفے پنجاب کے ہیں (۵۷)

جی کو بہلاتے ہیں
پیار بھرے ارماں
ماہیے کہلاتے ہیں

ٹھنڈک بھی، حرارت بھی
ہوتی ہے ماہیے میں
شوخی بھی، شرارت بھی (۵۸)

''ہمت رائے شرما'' نے انہی ماہیوں میں حیدر قریشی کے لیے بھی ایک ماہیا تخلیق کیا ہے جو حیدر قریشی کی ماہیا نگاری

میں اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔

''فن میں لاثانی ہیں
حیدر ''ماہیے کی
تحریک'' کے بانی ہیں (۵۹)

''ہمت رائے شرما'' پر اس قدر مکمل اور تنقیدی کتاب لکھنے پر ڈاکٹر وزیر آغا، حیدر قریشی کو مبارک باد دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہمت رائے شرما'' پر آپ کا مضمون بہت متوازن ہے اور متاثر کرتا ہے۔آپ کی شاعر، افسانہ نگار، انشائیہ نگار اور خاکہ نگار کی حیثیت تو پہلے ہی مسلم ہے اور ان اصناف کے سلسلے میں آپ کے دستخط با آسانی پہچانے جا سکتے ہیں مگر اب تنقید کے میدان میں بھی آپ کسی سے پیچھے نہیں رہے بلکہ اگلی صف میں نظر آ رہے ہیں۔'' (۶۰)

نذیر فتح پوری بھی حیدر قریشی کو ''لفظوں کا مسیحا'' کا خطاب دیتے ہوئے ان کے تنقیدی ذوق و شوق کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جرمنی میں بیٹھے بیٹھے موصوف نے بمبئی جیسے گنجان شہر میں کھوئے ہمت رائے شرما جی کو دریافت کر کے نئی زندگی عطا کی ہے۔ہم اسے حیدر قریشی کا مسیحانہ عمل قرار دیتے ہیں کہ ۱۹۳۶ء سے فلمی دنیا میں نام کمانے والے شرما جی آج پھر قرطاس و قلم سے منسلک ہو گئے ہیں اور خوبصورت ماہیے کہہ رہے ہیں۔'' (۶۱)

مختصر یہ کہ اس کتاب کو اردو ماہیا نگاری کی تاریخ میں ایک دستاویز کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔جس سے حیدر قریشی کی اردو ماہیا سے وابستگی اور شیفتگی کے ساتھ ساتھ اس کے مقام و مرتبہ کا تعین بھی ممکن ہو گیا ہے جو بلاشبہ قابل قدر ہے۔

حوالہ جات

۱۔ حیدر قریشی، ''ڈاکٹر وزیر آغا۔عہد ساز شخصیت''، ص نمبر ۸، نایاب پبلی کیشنز، خان پور ۱۹۹۵ء

۲۔ حیدر قریشی، ''ڈاکٹر وزیر آغا۔عہد ساز شخصیت''، ص نمبر ۷

۳۔ حیدر قریشی، ''ڈاکٹر وزیر آغا۔عہد ساز شخصیت''، ص نمبر ۱۹

۴۔ حیدر قریشی، ''ڈاکٹر وزیر آغا۔عہد ساز شخصیت''، ص نمبر ۲۴

۵۔ حیدر قریشی، ''ڈاکٹر وزیر آغا۔عہد ساز شخصیت''، ص نمبر ۲۹

۶۔ حیدر قریشی، ''ڈاکٹر وزیر آغا۔عہد ساز شخصیت''، ص نمبر ۳۰

۷۔ حیدر قریشی، ''ڈاکٹر وزیر آغا۔عہد ساز شخصیت''، ص نمبر ۳۱

۸۔ محمد وسیم انجم، ''حیدر قریشی۔فکر و فن'' ص نمبر ۵۰، انجم پبلی کیشنز، راول پنڈی، ۱۹۹۹ء

۹۔ حیدر قریشی، ''ڈاکٹر وزیر آغا۔عہد ساز شخصیت''، ص نمبر ۳۶

۱۰۔ حیدرقریشی، ''ڈاکٹر وزیر آغا۔عہد ساز شخصیت''، ص نمبر ۳۷

۱۱۔ حیدرقریشی، ''ڈاکٹر وزیر آغا۔عہد ساز شخصیت''، ص نمبر ۷۰

۱۲۔ حیدرقریشی، ''ڈاکٹر وزیر آغا۔عہد ساز شخصیت''، ص نمبر ۱۰۸

۱۳۔ حیدرقریشی، ''ڈاکٹر وزیر آغا۔عہد ساز شخصیت''، ص نمبر ۱۲۲

۱۴۔ حیدرقریشی، ''ڈاکٹر وزیر آغا۔عہد ساز شخصیت''، ص نمبر ۱۲۳

۱۵۔ حیدرقریشی، ''ڈاکٹر وزیر آغا۔عہد ساز شخصیت''، ص نمبر ۱۲۴

۱۶۔ حیدرقریشی، ''ڈاکٹر وزیر آغا۔عہد ساز شخصیت''، ص نمبر ۱۲۶

۱۷۔ حیدرقریشی، ''ڈاکٹر وزیر آغا۔عہد ساز شخصیت''، ص نمبر ۱۳۳

۱۸۔ حیدرقریشی، ''ڈاکٹر وزیر آغا۔عہد ساز شخصیت''، ص نمبر ۱۳۴

۱۹۔ حیدرقریشی، ''ڈاکٹر وزیر آغا۔عہد ساز شخصیت''، ص نمبر ۱۴۴

۲۰۔ محمد وسیم انجم، ''حیدر قریشی۔فکر و فن'' ص نمبر ۵۴

۲۱۔ حیدرقریشی، ''ڈاکٹر وزیر آغا۔عہد ساز شخصیت''، ص نمبر ۱۵۳

۲۲۔ حیدرقریشی، ''ڈاکٹر وزیر آغا۔عہد ساز شخصیت''، ص نمبر ۲۶

۲۳۔ حیدرقریشی، ''ڈاکٹر وزیر آغا۔عہد ساز شخصیت''، ص نمبر ۹

۲۴۔ محمد وسیم انجم، ''حیدر قریشی۔فکر و فن'' ص نمبر ۵۶

۲۵۔ حیدرقریشی، ''اردو میں ماہیا نگاری''، ص نمبر ۳،فرہاد پبلی کیشنز اسلام آباد۔۱۹۹۷ء

۲۶۔ حیدرقریشی، ''اردو میں ماہیا نگاری''، ص نمبر ۸

۲۷۔ حیدرقریشی، ''اردو میں ماہیا نگاری''، ص نمبر ۹

۲۸۔ حیدرقریشی، ''اردو میں ماہیا نگاری''، ص نمبر ۱۷

۲۹۔ حیدرقریشی، ''اردو میں ماہیا نگاری''، ص نمبر ۱۸

۳۰۔ حیدرقریشی، ''اردو میں ماہیا نگاری''، پس ورق از ڈاکٹر انور سدید

۳۱۔ حیدرقریشی، ''اردو میں ماہیا نگاری''، ص نمبر ۲۱

۳۲۔ حیدرقریشی، ''اردو میں ماہیا نگاری''، ص نمبر ۲۱

۳۳۔ حیدرقریشی، ''اردو میں ماہیا نگاری''، ص نمبر ۲۲

۳۴۔ حیدرقریشی، ''اردو میں ماہیا نگاری''، ص نمبر ۳۹۔۴۰

۳۵۔ حیدرقریشی، ''اردو میں ماہیا نگاری''، ص نمبر ۵۹

۳۶۔ حیدرقریشی، ''اردو میں ماہیا نگاری''، ص نمبر ۶۰

۳۷۔ حیدرقریشی، ''اردو میں ماہیا نگاری''، ص نمبر ۳۳

۳۸۔ حیدرقریشی، ''اردو میں ماہیا نگاری''، ص نمبر ۶۷

۳۹۔ حیدرقریشی، ''اردو میں ماہیا نگاری''، ص نمبر ۹۹

۴۰۔ حیدرقریشی، ''اردو میں ماہیا نگاری''، ص نمبر ۱۵۷

۴۱۔ حیدرقریشی، ''اردو ماہیے کی تحریک''، ص نمبر ۷، فرہاد پبلی کیشنز، راول پنڈی،۱۹۹۹ء

۴۲۔ حیدرقریشی، ''اردو ماہیے کی تحریک''، ص نمبر ۱۴

۴۳۔ حیدرقریشی، ''اردو ماہیے کی تحریک''، ص نمبر ۲۵

۴۴۔ حیدرقریشی، ''اردو ماہیے کی تحریک''، ص نمبر ۳۲

۴۵۔ حیدرقریشی، ''اردو ماہیے کی تحریک''، ص نمبر ۳۳۔۳۴

۴۶۔ حیدرقریشی، ''اردو ماہیے کی تحریک''، ص نمبر ۹۷

۴۷۔ حیدرقریشی، ''اردو ماہیے کی تحریک''، ص نمبر ۱۰۰

۴۸۔ حیدرقریشی، ''اردو ماہیے کی تحریک''، ص نمبر ۱۰۳

۴۹۔ حیدرقریشی،''اردو ماہیے کے بانی۔ہمت رائے شرما''،ص نمبر ۳،معیار پبلی کیشنز،دہلی،۱۹۹۹ء

۵۰۔ حیدرقریشی،''اردو ماہیے کے بانی۔ہمت رائے شرما''،ص نمبر ۹

۵۱۔ حیدرقریشی،''اردو ماہیے کے بانی۔ہمت رائے شرما''،ص نمبر ۱۲

۵۲۔ حیدرقریشی،''اردو ماہیے کے بانی۔ہمت رائے شرما''،ص نمبر ۱۵

۵۳۔ حیدرقریشی،''اردو ماہیے کے بانی۔ہمت رائے شرما''،ص نمبر ۲۱

۵۴۔ حیدرقریشی،''اردو ماہیے کے بانی۔ہمت رائے شرما''،ص نمبر ۲۴

۵۵۔ حیدرقریشی،''اردو ماہیے کے بانی۔ہمت رائے شرما''،ص نمبر ۳۶

۵۶۔ حیدرقریشی،''اردو ماہیے کے بانی۔ہمت رائے شرما''،ص نمبر ۴۵

۵۷۔ حیدرقریشی،''اردو ماہیے کے بانی۔ہمت رائے شرما''،ص نمبر ۵۳

۵۸۔ حیدرقریشی،''اردو ماہیے کے بانی۔ہمت رائے شرما''،ص نمبر ۵۴

۵۹۔ حیدرقریشی،''اردو ماہیے کے بانی۔ہمت رائے شرما''،ص نمبر ۵۷

۶۰۔ حیدرقریشی،''اردو ماہیے کی تحریک''، پس ورق از ڈاکٹر وزیر آغا

۶۱۔ مرتبین نذیر فتح پوری۔سنجے گوڑ بولے، ''حیدر قریشی۔فن اور شخصیت''، ص نمبر ۲۰۔ اسباق پبلی کیشنز۔پونا۔۲۰۰۲ء

اردو کے سب سے بڑے سرقے کو بے نقاب کرنے والی کتاب

’ڈاکٹر نارنگ اور مابعد جدیدیت‘

شاہد الاسلام نیوز ایڈیٹر ’ہندوستان ایکسپریس‘ (دہلی)

معروف شاعر اور ادیب حیدر قریشی کی تازہ ترین کتاب ’’ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور مابعد جدیدیت‘‘ پیش نظر ہے۔قبل اسکے کہ اس کتاب کے بارے میں اپنے تأثرات کا اظہار کروں،اس بات کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب کیوں اور کن حالات میں مجھے دستیاب ہوئی!

قصہ یہ ہے کہ آج سے تقریباًایک سال قبل ممبئی سے نکلنے والے سہ ماہی ادبی رسالہ ’’اثبات‘‘(شمارہ ۳) پر ناگاہ میری نظر پڑ گئی۔رسالہ اتنا دیدہ زیب اور پرکشش تھا کہ ادب سے لاتعلق رہنے والے مجھ جیسے صحافی نے بھی اس کی ورق گردانی شروع کردی۔اندر کے صفحات کی ترتیب و تنظیم بھی خاصی متأثر کن معلوم ہوئی۔ابھی رسالے کی ظاہری خوبیوں کے سحر سے نکل بھی نہیں پایا تھا کہ اس میں شامل ایک سرخی پر نگاہ ٹک گئی۔سرخی کچھ اس طرح تھی:’’جدید ادب کے شمارہ نمبر۱۲ کی کہانی (ڈاکٹر گوپی چند نارنگ صاحب کی مہربانی درمہربانی)‘‘۔حیدر قریشی کے تحریر کردہ اس مضمون کو میں نے پڑھنا شروع کیا تو پڑھتا ہی چلا گیا۔میں مضمون نگار کے نام سے مانوس تو تھا،تاہم ان سے متعلق میری معلومات نہیں کے برابر تھیں۔چنانچہ مضمون پڑھنے کے بعد اندازہ ہوا کہ موصوف جرمنی میں مقیم ہیں اور وہاں سے ’’جدید ادب‘‘ نام کا ایک رسالہ بھی نکالتے ہیں۔اس مضمون میں انھوں نے جو کچھ تحریر کیا تھا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ ’’جدید ادب‘‘ کے شمارہ ۹، ۱۰ اور ۱۱ میں عمران شاہد بھنڈر کے جو مضامین ڈاکٹر نارنگ کی کتاب ’ساختیات،پس ساختیات اور مشرقی شعریات‘ سے متعلق شائع ہوئے تھے اور جن میں دلائل اور شواہد کے ساتھ یہ ثابت کیا گیا تھا کہ ڈاکٹر نارنگ بہت بڑے پیمانے پر سرقہ کے مرتکب ہوئے ہیں،اس کے نتیجے میں نارنگ صاحب نے رسالہ ’جدید ادب‘ (جو دہلی کے ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس کے زیر اہتمام شائع ہوتا ہے) کے شمارہ ۱۲ کی اشاعت میں رخنہ ڈالنے کی غرض سے پبلشر پر ہر طرح کا دباؤ ڈالا اور اپنے ذاتی اثر و رسوخ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس شمارے پر اپنی سنسر شپ عائد کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔اس معاملے کی پوری روداد لکھنے کے بعد صاحب مضمون نے کھلے ڈلے الفاظ میں یہ بھی تحریر کیا تھا کہ ’’میں حکومت ہند سے درخواست کرتا ہوں کہ......ایک علمی کمیٹی بٹھائی جائے جو تحقیق کرے کہ نارنگ صاحب نے واقعی یہ شرمناک سرقے کیے ہیں یا ان پر بے جا الزام ہیں۔اگر وہ پاک صاف ثابت ہوں....تو میں انڈیا کے قانون کے مطابق بخوشی ہر سزا بھگتنے کے لیے تیار ہوں‘‘

یہ تفصیل پڑھ کر حیرت کے ساتھ افسوس بھی ہوا کہ اردو کا ادبی ماحول اتنا پست ہو گیا کہ ایک نامی گرامی

صاحب قلم اپنے اوپر لگے سرقہ کے الزام کی تردید علمی سطح پر کرنے کے بجائے سرقہ کی بات سامنے لانے والوں کا ناطقہ بند کرنا چاہتا ہے۔اس حیرت اور افسوس کی ملی جلی کیفیت میں،میں نے اس مضمون کو ’’ہندوستان ایکسپریس‘‘ کے ویب ایڈیشن میں شامل کرلیا۔خیال تھا کہ علمی حلقوں سے اس متنازعہ مضمون پر جو رائے بھی آئے گی اسے صحافتی دیانتداری کے تحت نذر قارئین کر دیا جائے گا،...مگر یہ کیا؟. نارنگ صاحب کی حمایت پر کمر بستہ ٹیم حرکت میں آگئی اور ’ہندوستان ایکسپریس‘ کے ایڈیٹر احمد جاوید کو اس بات کے لیے آمادہ کرلیا گیا کہ اس مضمون کو ویب سائٹ سے ہٹا دیا جائے۔چنانچہ ایڈیٹر موصوف نے اس ’کار خیر‘ کو انجام دینے کے لئے مجھے ہدایت جاری کردی۔گوکہ حفظِ مراتب کا تقاضہ تھا کہ ’فرمانِ مدیر‘ کو ’فرمانِ خدا‘ سمجھ کر سر تسلیم خم کر دیا جائے لیکن میں نے بھی اپنے ذاتی استحقاق کو بطور ڈھال استعمال کیا اور جواباً یہ عرض کیا کہ آپ کا حکم اپنی جگہ،تاہم کسی مضمون کو میں ناجائز دباؤ کے تحت نہیں ہٹا سکتا....ویب ایڈیشن کے جملہ امور مجھ سے متعلق ہیں اور چونکہ آپ یا ادارہ کے دیگر افراد کی (ہندوستان ایکسپریس) ویب سائٹ کے حوالے سے کوئی عملی شراکت نہیں ہے،لہذا ویب سائٹ میں کیا چیزیں دینی ہیں اور کیا نہیں،اس تعلق سے کسی بھی مشورے کی مجھے ضرورت نہیں۔ہاں! یہ یقین دہانی میں نے ایڈیٹر کو ضرور کرائی کہ اس مضمون کی تردید میں اگر کسی گوشے سے کچھ موصول ہوا تو اسے بھی انٹرنیٹ ایڈیشن میں اسی اہتمام سے شامل کیا جائے گا جس طرح حیدر قریشی کی تحریر شائع کی گئی ہے۔اس طرح نارنگ صاحب کے حامیوں کا غیر اخلاقی حربہ ناکام ہوا اور مدیر محترم خاموش ہو گئے۔

نارنگ صاحب کے حامیوں کی طرف سے اس غیر متوقع دباؤ نے تھوڑی دیر کے لیے مجھے ذہنی خلجان میں ضرور مبتلا کیا تاہم اس کا یہ فائدہ ہوا کہ اس کے بعد حیدر قریشی کے مضمون کی حقانیت مجھ پر پوری طرح واضح ہوگئی اور ’ہندوستان ایکسپریس‘ کے ویب ایڈیشن میں اس کی اشاعت پر مجھے ایک طرح کی طمانیت کا احساس ہوا۔اس دوران حیدر قریشی کو ’ہندوستان ایکسپریس‘ کے ویب ایڈیشن میں اپنے مضمون کی اشاعت کا علم ہوا تو ’شکریہ‘ پر مبنی ان کی ایک ای۔میل ملی جس میں دیگر باتوں کے علاوہ اس خدشے کا اظہار بھی تھا کہ عجب نہیں آپ پر یہ دباؤ ڈالا جائے کہ ویب سائٹ سے اس مضمون کو ہٹا دیں،میں نے فوراً جواب دیا کہ خاطر جمع رکھیں،وہ مرحلہ آکر گزر چکا ہے،آپ کی تحریر ویب سائٹ پر موجود رہے گی،انشا اللہ۔اس طرح برقی مراسلت کے ذریعہ حیدر قریشی صاحب سے جو رابطہ قائم ہوا تو اس کے نتیجے میں اسی سلسلے کی ان کی ایک اور تحریر ’’پرویزی حیلوں کی روداد‘‘ ہندوستان ایکسپریس کے ویب ایڈیشن میں شائع ہوئی اور یہ اطلاع بھی ملی کہ نارنگ صاحب کے سرقوں کی بابت مدیر موصوف کی ایک کتاب عنقریب منظر عام پر آنے والی ہے جس کی ایک کاپی مجھے ارسال کی جائے گی اور مزید ایک کاپی ’ہندوستان ایکسپریس‘ کے پرنٹر و پبلشر پرویز صہیب احمد صاحب کے لیے بھیجی جائے گی کیونکہ اس میں بطور خاص ’ہندوستان ایکسپریس‘ کا شکریہ ادا کیا گیا ہے۔

....اور پھر وہ کتاب (بعنوان ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور مابعد جدیدیت) مجھے بذریعہ ڈاک موصول ہوگئی۔اس کے مشمولات پر ایک نظر ڈالی تو یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ اس کا نام مابعد جدیدیت سے کیوں جوڑا گیا جبکہ اس کا اصل اور واحد موضوع ڈاکٹر نارنگ کا ’سرقہ‘ ہے۔ممکن ہے اس میں کوئی مصلحت دخیل رہی ہو۔وہ جو کہتے

ہیں کہ دودھ کا جلا چھاچھ پھونک پھونک کر پیتا ہے،تو اس کی روشنی میں ایک گمان یہ گزرتا ہے کہ شاید اس ڈر سے یہ نام رکھا گیا ہو کہ 'سرقہ' کے عنوان سے چھپنے والی یہ کتاب کہیں نارنگ صاحب کے عتاب کا شکار نہ ہو جائے، اسلئے ایسا نام رکھا جائے کہ کتاب طباعت کے مراحل سے بعافیت گزر کر قارئین تک پہنچ جائے۔ بہر حال 'نام میں کیا رکھا ہے' سوچ کر میں نے اس کے سارے مضامین پڑھ ڈالے، اور اندازہ ہوا کہ حیدر قریشی اس کتاب کے مصنف بھی ہیں اور مؤلف بھی، کیونکہ نارنگ صاحب کے سرقوں سے متعلق تحریر کردہ اپنے مضامین کے علاوہ اس موضوع پر سامنے آنے والے اور کئی مضامین بھی انھوں نے اس کتاب میں شامل کیے ہیں۔

اس کتاب میں شامل تمام تحریروں کو پڑھنے کے بعد 'سرقہ' سے متعلق سارا قضیہ کچھ اس طرح سامنے آتا ہے کہ پھر کسی شک وشبہے کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ ڈاکٹر نارنگ کی کتاب 'ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات' سرقوں کا مجموعہ ہے۔ حیدر قریشی کی زیر نظر کتاب ہمیں یہ بتاتی ہے کہ اس حقیقت پر پردہ ڈالنے کے لیے ڈاکٹر نارنگ کے حامیوں نے جو بے تکی باتیں سپرد قلم کیں، یا انتہائی بھونڈے انداز میں خود نارنگ صاحب نے جو دوسرے غیر علمی حربے استعمال کیے ان سے سرقوں کے الزام کی تردید تو خیر کیا ہوتی، ہاں اتنا ضرور ہوا کہ ان ساری چیزوں نے اس معاملے کو اور ہوا دی، یہاں تک کہ مجھ جیسے ادب سے بے تعلق شخص کو بھی اس کی پوری واقفیت ہو گئی ۔ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی، اور اس پر مستزاد نارنگ صاحب کی مسلسل خاموشی نے سرقے کی تحقیق کرنے اور اسے اردو عوام کے سامنے لانے والوں کا کام آسان کر دیا۔

زیر تبصرہ کتاب سے ہمیں یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ نارنگ صاحب کے حامیوں نے کج بحثی سے کام لیتے ہوئے اس پورے قضیے کو نارنگ اور فاروقی کے مابین تنازعہ کا نام دینا چاہا تو کبھی یہ کہہ کر سرقوں کی حقیقت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی گئی کہ حیدر قریشی فلاں فلاں بات کی بنیاد پر نارنگ صاحب کے تئیں اپنے دل میں پرخاش رکھتے ہیں اور یہ سارا معاملہ اسی کدورت کی دین ہے وغیرہ وغیرہ۔ جب یہ سارے حربے غیر مؤثر ثابت ہوئے تو پھر اسے مذہبی تعصب کا نام دے کر یہ کہا گیا کہ ڈاکٹر نارنگ جیسے غیر مسلم ادیب کو کچھ متعصب قسم کے مسلمان خواہ مخواہ ہدف ملامت بنا رہے ہیں۔ لیکن ایک تجربہ کار مدیر اور زمانہ شناس ادیب حیدر قریشی نے معاملے کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے اس سارے قضیے کو کچھ اس خوش اسلوبی سے Manage کیا کہ سرقوں کا اصل معاملہ نظروں سے اوجھل نہ ہو سکا۔

بلاشبہ سرقوں کی حقیقت کو سامنے لانے کی غرض سے عمران شاہد بھنڈر نے مغربی مفکرین کی متعلقہ کتابوں کو کھنگالنے میں جو عرق ریزی کی اور جو کلیدی رول ادا کیا اس کے لیے وہ ہمیشہ یاد کیے جائیں گے، بلکہ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ایک اردو کے طالب علم کے سامنے جب جب نارنگ صاحب کا نام آئے گا تو اس کے ساتھ اسے عمران شاہد بھنڈر کی یاد بھی ضرور آئے گی، تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ بھنڈر کی یہ ساری کاوشیں اس مؤثر اور مدلل انداز میں شاید سامنے نہ آپاتیں اگر انھیں حیدر قریشی جیسا تجربہ کار اور دھن کا پکا ادیب اور مدیر نہ ملتا۔ ڈاکٹر نارنگ کے حامیوں نے اپنی بساط بھر پوری کوشش اس بات کی کر لی کہ ادھر اُدھر کی باتوں میں الجھا کر اصل موضوع کو گول کر دیا جائے، لیکن حیدر قریشی نے پوری فہم و فراست سے کام لیا، اور ان الجھاووں سے بچتے

بچاتے پوری حکمت اور تدبر کے ساتھ اپنی گاڑی آگے بڑھاتے رہے، یہاں تک کہ سرقہ بے نقاب ہو کر رہا اور ایک عام قاری سے لے کر اردو کے خاص الخاص ادیب کو یہ نتیجہ اخذ کرنے میں کوئی تأمل نہیں رہا کہ ''عمران شاہد بھنڈر کے نشان زد کیے بے شمار صفحات...صاف بتاتے ہیں کہ پروفیسر نارنگ نے سو فیصد لفظی ترجمہ کر کے 'سرقہ' کیا ہے'' (زبیر رضوی، سہ ماہی 'اثبات'، شمارہ ۵۔۴)۔

نارنگ صاحب کے وہ مداح جو ان کی اس ''شاہکار تصنیف'' کو حالؔی کے 'مقدمہ شعر و شاعری' کے بعد اردو تنقید کا سب سے بڑا 'کارنامہ' کہہ رہے تھے ان کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں ہوگی کہ اس 'شاہکار تصنیف' کو محض چند برسوں کے اندر عمران شاہد جیسا ایک نسبتاً غیر معروف لیکن ذہین اور محنتی محقق ایک جی دار مدیر کے تعاون سے (نارنگ صاحب کے 'مقام' و 'مرتبہ' سے مرعوب ہوئے بغیر) سرقوں کا پلندا ثابت کر کے رکھ دے گا۔

یہ کتاب ہمیں یہ بھی باور کراتی ہے کہ اس پورے دو ڈھائی سال کے عرصے میں جبکہ سرقہ والی بات موضوع سخن بنی ہوئی تھی، ڈاکٹر نارنگ کے حامیوں نے حیدر قریشی کو زیر کرنے کے لیے ہر حربے استعمال کیے، سرزمین ہندو پاک سے لے کر کناڈا، امریکہ اور انگلینڈ ہر طرف سے ان پر تابڑ توڑ حملے ہوئے لیکن انھوں نے اپنی جانب سے پوری بردباری کا ثبوت دیا، اپنے خلاف لکھی گئی بے سروپا باتوں کو پڑھ کر مشتعل نہیں ہوئے بلکہ ان باتوں کا مدلل جواب دھیرج کے ساتھ مختصر طور پر دیتے رہے، یہ سمجھتے ہوئے کہ اگر ان بے ہودہ باتوں کو طول دیا گیا تو سرقہ والی بات پس پشت چلی جائے گی۔ اپنے قلم کو غیر ضروری طور پر جذباتی ہونے سے بچائے رکھا، نارنگ صاحب کا ذکر جب بھی کیا انکے مرتبے کا خیال رکھا۔ ہاں، جب نارنگ صاحب نے 'جدید ادب' کے شمارہ ۱۲ کی اشاعت میں انتہائی بے شرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے رخنہ اندازی کی تو اس کی روداد تحریر کرتے ہوئے حیدر صاحب کا قلم مضمون کے اخیر میں قدرے جذباتی ہو گیا۔ اسی طرح انگلینڈ کے طباطبائی نام کے کسی شخص نے جب ان کے خلاف اوٹ پٹانگ باتیں لکھیں تو اس کا ذکر کرتے ہوئے بھی حیدر صاحب اپنی تحریر میں برہم نظر آتے ہیں، یہاں تک کہ اس شخص کا نام لینا بھی گوارا نہیں کرتے، لیکن یہ خفگی یا برہمی عین فطری ہے۔ جب کسی سے ناحق اذیت پہنچتی ہے تو نہ چاہتے ہوئے بھی تحریر میں کچھ نہ کچھ درشتی آ ہی جاتی ہے۔

مختصر یہ کہ حیدر قریشی کی زیر تبصرہ کتاب نہ صرف یہ کہ 'مشرقی شعریات' کے حوالے سے نارنگ صاحب کے سرقوں کی قلعی کھول رہی ہے بلکہ لسانیات کے میدان میں بھی پروفیسر موصوف نے اب تک جو کام کیے ہیں ان کی اصلیت کو بھی مشکوک بتاتے ہوئے یہ اعلان کر رہی ہے کہ ''لسانیات پر نارنگ صاحب کا سارا کام بھی 'مشرقی شعریات' جیسا ہی نکل آیا ہے۔.....جب وہ سرقے بے نقاب ہوں گے تو اردو دنیا خود دیکھ لے گی''۔ یقین ہے کہ اردو ادب کے اب تک کے سب سے بڑے سرقہ کو سامنے لانے والی اس کتاب کا علمی حلقے میں بڑے پیمانے پر خیر مقدم ہوگا اور اس کا ذکر اس زبان کی ادبی تاریخ میں پورے اہتمام سے کیا جائے گا، اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس کے مندرجات کی روشنی میں ڈاکٹر نارنگ کا مقام و مرتبہ نظر ثانی کا محتاج ہو گیا ہے۔

ایوب خاور (لاہور)

حیدر قریشی کے نام

(**نوٹ**: حیدر قریشی کے شعری و نثری تخلیقی کام پر مشتمل گیارہ کتابوں کے مجموعہ ''عمرِ لاحاصل کا حاصل'' کی اشاعت کے بعد ماہیا پر تحقیق و تنقید کی پانچ کتابوں کا مجموعہ ''اردو ماہیا تحقیق و تنقید'' بھی منظرِ عام پر آ گیا ہے۔ دونوں کتابیں علمی و ادبی حلقوں میں زیرِ مطالعہ ہیں اور ان کے حوالے سے تدریجاً ردِعمل بھی موصول ہو رہا ہے۔ ایوب خاور، نعیم الرحمٰن اور افضل چوہان کے تین نئے مضامین اسی حوالے سے ملے ہیں جو قارئین کی خدمت میں پیش ہیں۔ **ارشد خالد**)

یہ 1981-82ء کی بات ہے جب میں کراچی سے لاہور ٹرانسفر ہوا۔ لاہور پیروں اور ولیوں کا شہر تو ہے ہی لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ ادیبوں اور شاعروں اور فن کاروں کا شہر بھی ہے۔ بڑے سے بڑے ادیب، شاعر، پینٹر، صحافی، پروفیسر، نقاد، موسیقار، مجسمہ ساز، گیت کار، گلوکار، فلم ساز، ہدایت کار، اداکار، سیکڑوں نام ہیں جن کی خوشبو لاہور کے گلی کوچوں میں آج بھی مہک رہی ہے۔ جب میں لاہور آیا تو میں بہت مسحور تھا، ٹی ہاؤس، گورنمنٹ کالج، اورئنٹل کالج، نیشنل کالج آف دی آرٹس، پنجاب یونی ورسٹی، لاہور ٹیلی وژن سینٹر یہ وہ جگہیں تھیں جہاں ایسی ہی نابغہ ہائے روزگار شخصیات سے ملاقات کے نتیجے میں مجھے ایک ادبی ماہ نامے کا خیال آیا اور اپنے جنرل منیجر کو بصری ادبی جریدے کا آئیڈیا پیش کر دیا۔

اس ادبی ماہ نامے میں مختلف فنون کے تخلیق کار تو ہوتے ہی تھے لیکن وہ نوجوان تخلیق کار جو اُس وقت اپنے سینئرز کی توجہ کا مرکز بن رہے تھے، اُنھیں بھی میں اس پروگرام کے ذریعے میں ٹیلی وژن دیکھنے والوں سے متعارف کروا رہا تھا۔ چناں چہ کئی نوجوان شعرا کے ساتھ ساتھ حیدر قریشی سے میری ملاقات اس ادبی ماہ نامے ہی کے پلیٹ فارم پر ہوئی۔ حیدر قریشی سے میرا تعارف دراصل محترم و مکرم ڈاکٹر وزیر آغا صاحب کے موقر جریدے ''اوراق'' کے صفحات میں چھپنے والی اس کی غزلوں اور نظموں نے کروایا تھا اور میں نے اُسے خان پور سے

بلا لیا...... حیدر قریشی کی شخصیت نے میرا دل موہ لیا۔ سو ٹیلی وژن پر ایک نئے شاعر اور ایک نئے پروڈیوسر ڈائریکٹر کا یہ عارضی رشتہ پرخلوص دوستی میں ایسے ڈھلا کہ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا یہ اور گہرا ہوتا چلا گیا۔ حیدر قریشی کا 'جدید اَدب' اِسی دہائی کی زندہ نشانی ہے جسے حیدر نے خان پور کی آب و ہَوا میں جیسے تیسے زندہ رکھا اور پھر وہ کب جرمنی چلا گیا مجھے معلوم نہ ہو پایا۔

ابھی ایک سال پہلے حیدر کے ٹیلی فون نے مجھے چونکا دیا۔ آواز میں وہی تازگی، پہچان، دوستانہ اور تعلقِ خاطر...... حیدر نے اپنا نام لیا تو میں ششدر رہ گیا۔ اور ہمارے بیچ میں سے ستائیس اٹھائیس سال چپکے سے سرک کر ایک طرف کو ہو گئے۔ میں سمجھا کہ حیدر خان پور ہی سے بول رہا ہے اور جدید اَدب کے لیے کسی تازہ نظم کی فرمایش کرنے والا ہے...... مگر وہ تو جرمنی سے فون کر رہا تھا مجھے...... وہی ستائیس اٹھائیس سال جو ہمارے بیچ میں سے روئی کے گالے کی طرح اُڑ کر ایک طرف کو ہو گئے تھے، چند منٹ میں 13 انچ موٹے شیشے کی دیوار کی طرح دھڑام سے ہمارے درمیان دوبارہ کھڑے ہو گئے، فاصلے کا احساس بھی کتنا خوف ناک ہوتا ہے۔

حیدر اور اس کا 'جدید اَدب' ذہن سے محو تو ہرگز نہ ہوا تھا لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ پاکستان ٹیلی وژن کا ایک مصروف ترین اور مقبول ترین پروڈیوسر ڈائریکٹر بننے کے لیے جس طرح میں نے زندگی کے شب و روز کو اتھل پتھل کیا۔ اُس اتھل پتھل کے گرد و غبار نے شیشے کی اُس دیوار کو جس کے آرپار ہم بہت آسانی سے ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے۔ اتنا میلا ضرور کر دیا تھا کہ حیدر کے ساتھ ساتھ اسکول، کالج، یونی ورسٹی کے کچھ اور دوست بھی تھے جن کے چہرے دھندلے ہو گئے تھے۔ زندگی ہے ہی کچھ ایسی کمینی چیز کہ انسان کو اپنے گھیرے میں یوں جکڑ لیتی ہے کہ سانس کا ردھم بھی بعض اوقات ٹوٹنے لگتا ہے اور اب تو زندگی خود ایک ناگہانی کے گھیرے میں ہے۔ بہت ڈر گئی ہے، سہم گئی ہے۔ خودکش حملہ آوروں، دہشت گردوں، ڈاکوؤں اور لٹیروں کے محاصرے میں اس ڈری ہوئی زندگی کو اوڑھے ہوئے لوگوں کے کانوں میں اگر کوئی شناسا آواز پڑ جائے تو غنیمت ہے۔ لیکن حیدر کی آواز غنیمت نہیں بیش قیمت تھی۔ وہی خان پوریہ سا لہجہ...... وہی خلوص، وہی شعر و ادب کا چسکا، وہی 'جدید ادب'۔

'جدید اَدب' جو خان پور سے ایک چھوٹے سے چھاپہ خانے کی سیاہی سے روشن ہوتا تھا اب انٹرنیشنل ہو چکا ہے...... جن بڑی شخصیات سے بات کرنے کا ہم خواب دیکھتے تھے وہ ادبی شخصیات اس جدید اَدب میں اپنی تخلیقات کے ساتھ جلوہ انداز ہوتے ہیں۔ حیدر کا رابطہ دنیا بھر کے اردو دان طبقے سے استوار ہے اور وہ خود نہ صرف یہ کہ غزل گو اور نظم گو ہے بلکہ افسانہ نگار ہے، انشائیہ نگار ہے۔ گمبھیر ادبی معاملات پر ایک ثقہ قسم کے نقاد کی طرح اس کی گہری نظر ہے، یادداشتیں، سوانحی خاکے، اپنی زندگی، اپنے پورے خاندان کے افراد کے ساتھ اپنے میل جول اور رشتوں کی تفسیرات، سفرنامے، حج بیت اللہ کی روداد، اپنے ذاتی روز و شب، اپنے قریب ترین شے یعنی بیوی بچوں

کے بارے میں اپنے قاری کو اتنا کچھ اتنی آسانی سے بتا چکا ہے جیسے کھانے کی میز پر بیٹھے اپنے ذاتی دوستوں کو اپنے گھر کے در و دیوار میں لگی ایک ایک اینٹ کے بارے میں بتا رہا ہو۔اس کی سینتیس سالہ ادبی زندگی گیارہ مختلف النوع تخلیقی کتابوں میں سجی ہوئی ہے۔اُس نے بہت اہتمام سے زندگی کو، زندگی کے معاملات کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو، رشتے ناتوں کو، کہانی، شعر، نظم اور تنقید کو آپ بیتی اور جگ بیتی کو ہمارے ادبی منظر نامے کا حصہ بنایا ہے۔

قریباً ایک سال پہلے حیدر قریشی سے میرا رابطہ بحال ہوا۔تب سے میری حیرانیوں کو سانس لینے کا موقع نہیں ملا۔ایک تو اُس نے مجھے چھپنے چھپانے کے معاملے میں بہت Active کر دیا ہے...... Active تو میں پہلے بھی تھا لیکن اپنے آپ میں گم، ڈراما، میوزک، ادب، سب کو نئے رخ سے دیکھنے کی لگن اور دو نمبر منافقینِ ادب سے کوسوں دور اپنی کٹیا تک محدود رہنا میرا شیوہ تھا۔اس شخص نے میرے دل و جان میں بجلی بھر دی۔یہ شخص جب تک دو نمبر کو دو نمبر ثابت نہ کر دے چین کا سانس نہیں لیتا، یقین نہ آئے تو اپنے وقت کی معروف ترین شخصیت نارنگ صاحب سے پوچھیے۔دوسری طرف ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ حیدر نے تب تک اپنے حلق سے نوالہ نہیں اتارا جب تک کسی جینوین ادیب یا شاعر کو اس کے حصّے کی داد نہ پہنچا دی۔اور ان کاموں کو اس نے اپنا بہت سارا وقت دیا ہے۔سوچتا ہوں اگر حیدر جرمنی نہ گیا ہوتا تو اتنے ڈھیر سارے کام کیسے کر لیتا......اس کی تحریریں پڑھتے ہوئے بار بار میرے اندر یہ سوال اٹھا کہ میں حیدر کو ادب کے کس خانے میں فِٹ کروں مگر شاعری میں، افسانہ نگاری میں، خاکہ نگاری، انشائیہ، تنقید، سبھی خانوں میں یہ فٹ ہے اور قابلِ تحسین ہے۔تحقیق کے میدان کو بھی نہ چھوڑا اور اپنی سرزمین کی مٹی سے، اس کی آب و ہوا سے، اُس کے روز و شب سے، اس کی گرمیوں، سردیوں، کھیتوں کھلیانوں کی خوشبو سے صورت پذیر ہونے والی ایک شعری صنف 'ماہیا'' کی ہیئت، اس کے اوزان اور اس کے موضوعات کے حوالے سے ہندوستان اور پاکستان ہی کے نہیں یورپ و امریکا تک کے ادبی حلقوں کو بھی سرگرم کر دیا۔اب حیدر قریشی کا نام ''ماہیا'' لکھنے اور پڑھنے والوں میں اتنا ہی مقبول ہے جتنا خود حیدر قریشی۔بلکہ جدید ادب کے ہر شمارے کے ٹائٹل پیج پر اس کا کوئی 'ماہیا' ضرور درج ہوتا ہے۔

حیدر کی کلیات ''عمرِ لا حاصل کا حاصل'' کو پڑھتے ہوئے مجھ پر کھلا کہ میری زندگی کا ابتدائی زمانہ اور حیدر قریشی کی زندگی کا ابتدائی زمانہ کس حد تک ایک دوسرے سے مشابہہ ہے۔حیدر نے مختلف جگہوں پر اپنی زندگی کے ابتدائی دور کی تفصیل بیان کی ہے۔میں نے بھی بارہا اپنے انٹرویوز میں بلکہ اپنی پہلی کتاب گُلِ موسمِ خزاں کے Preface میں بھی لکھا ہے کہ میں پرائمری اسکول میں پڑھتے وقت ہر اتوار کو چکوال شہر میں مزدوری کیا کرتا تھا۔میں نے اپنے ٹیچرز کے بچوں کو پڑھا کر اپنے اسکول کی فیس ادا کی ہے۔میٹرک کے بعد میں نے بھی پرائمری اسکول میں مبلغ ساٹھ روپے ماہانہ تنخواہ کی بنیاد پر ملازمت کی ہے۔حیدر کی ابتدائی زندگی بھی مزدوری کرنے میں گزری

،فرق یہ کہ حیدر ایک فیکٹری میں مزدوری کیا کرتا تھا اور میں اپنے گاؤں کے پروفیشنل مزدوروں کے ساتھ اینٹ گارا ڈھویا کرتا تھا۔ٹیچنگ اِس نے بھی کی، میں نے بھی کی۔ابتدائی زندگی کی اس مماثلت نے بھی ہمارے درمیان دوستی کا یہ گل زار کھلائے رکھا ہے۔اور یہ جو بہت طویل عرصے تک ہم ایک دوسرے سے نہ مل پائے تو یوں سمجھیے کہ زندگی کی تیز دھوپ سے بچنے کے لیے ہم نے اپنی اپنی دوستی کے اس گل زار کو اُن سبز چادروں سے ڈھانپ رکھا تھا جو عموماً گھریلو پودوں کو مرجھانے سے بچانے کے کام آتی ہیں اور ہم خود اپنی اپنی جگہ ایک نئی زمین کی گوڈی کرنے اور اس پر اپنی اپنی زندگی کا ایک نیا باغ تعمیر کرنے میں لگے رہے۔اب جو اس دوستی کے گل زار پر سے وقت کی یہ سبز چادر ہٹی تو دیکھا کہ سارے کے سارے گملوں میں، سارے کے سارے پھول ویسے کے ویسے ہی تازہ ہیں۔

حیدر قریشی کل بھی راضی بہ رضائے الٰہی تھا اور آج بھی۔اس کے بہت سارے دوست ہیں اور یہ سب جانتے ہیں کہ حیدر نے کچھ عرصہ پہلے ایک خواب دیکھا تھا کہ اس کی موت واقع ہونے والی ہے۔اس نے ہماری بھابی مبارکہ کو، بچوں کو اور سبھی دوستوں کو نہ صرف بتایا بلکہ اس خواب کے مطابق اپنی زندگی کے بہت سے معاملات کو عملی طور پر سمیٹنا بھی شروع کر دیا۔اس عمل میں حیدر کی طرف سے خواب پرستی کا اشارہ کہیں نہیں ہے۔حیدر کی یادداشتوں کا تازہ Chapter ثابت کرتا ہے کہ زندگی کی بے ثباتی اور موت کے برحق ہونے پر حیدر کا یقینِ کامل کس درجے کا ہے۔اس کی زندگی مسلسل محنت سے عبارت ہے اور اس خوف سے عاری ہے کہ نہ جانے کل کیا ہوگا۔اسی درویشانہ سوچ کی برکت ہے کہ اس بے ثبات زندگی میں قدرت نے اس کو آلایشوں سے پاک اور بنیادی آسایشوں والی زندگی میں علم و اَدب کی خدمت اور دوستوں سے محبت کرنے کا موقع دے رکھا ہے۔اللہ اِسے خوش رکھے۔

میں اس کی ساری کتابیں تفصیل سے تو ابھی نہیں پڑھ سکا لیکن سب کتابوں کو دیکھا ضرور ہے......مثلاً اس کی جو کہانیاں میں اب تک پڑھ سکا ہوں اُن میں ''میں انتظار کرتا ہوں'' ایک ایسی علامتی کہانی ہے جس میں ایک فردِ واحد کے ساتھ انسانی معاشرے کے عمومی رویّے کو انسانی تاریخ کے Perspective میں دیکھا گیا ہے۔

ماں باپ کی آپس کی Relationship اور بچے۔اس مجموعی تعلق کو ایک ایسی تکون میں دیکھا گیا ہے جس کے تینوں زاویے وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ اپنی شکلیں بدلتے رہتے ہیں جیسے تینوں لائینیں نہ صرف یہ کہ ایک دوسرے سے جڑی ہیں بلکہ ایک دوسرے کا پرتو بھی ہیں۔

''کاکروچ'' حیدر کی ان کہانیوں میں سے ہے جو کہانی کے لیے نئے کرداروں کی تخلیق کی ایک ممکنہ جستجو ہے ،اس کہانی کو پڑھ کر پتا چلا کہ اگر ایٹمی طاقتیں اس بیچاری دنیا کی انسانی آبادی کو قیامت سے پہلے ہی ختم کر دیں ،کوئی انسان باقی نہ بچے تو مکھی کا ایک جوڑا یا کاکروچ کا جوڑا اس کرۂ ارض پر ایک نئی دنیا آباد کرے گا اگر ایسا ہوا تو قیامت کے دن کا کروچ......حیدر کی کہانی کے آخر میں دو جملے پڑھ کر مزید یہ بھی کہنے کو جی چاہ رہا ہے کہ اگر کسی

ابتدائی زمانے میں انسان چوپایا ہوسکتا ہے تو کاکروچ اپنے ترقی یافتہ زمانے میں دوپایہ کیوں نہیں ہوسکتا۔''انکل انیس''اور''بابا جمال شاہ کا جلال'' بھی اپنی سادگی اور معنی خیزی کے حوالے سے بہت اچھی کہانیاں ہیں۔

حیدر نے بے شمار دوستوں اور رشتے داروں اور ادیبوں کے خاکے لکھے ہیں لیکن جن دو خاکوں نے مجھے صحیح معنوں میں اسیر کرلیا وہ''برگد کا پیڑ''اور''مائے نی میں کہنوں آکھاں'' دو ایسے خاکے ہیں جن کا کوئی نہ کوئی پہلو ہر انسان کی زندگی میں موجود ہے۔

حیدر کے شعری مجموعوں میں جو نظمیں مجھے پسند آئیں اُن میں''درد''،''پھاگن کی سفاک ہوا''،''ایبٹ آباد''،''منی پلانٹ''،''ایک دراوڑ کا پیغام آریانوں کے نام''،''قیامت''،''چلو اک نظم لکھتے ہیں''اور بہت سے 'ماہیئے'......نظمیں ساری کی ساری تو یہاں درج کرنا ممکن نہیں۔حیدر کی غزلوں کے کچھ اشعار آپ سے ضرور شیئر کروں گا۔

روشنی روشنی سی ہرسُو ہے
یہ ترا دھیان ہے کہ خود تُو ہے

خود اپنے ہونٹوں پہ صدیوں کی پیاس رکھتا ہے
وہ ایک شخص جو مجھ کو اداس رکھتا ہے

دلوں کا خون کرنے لگ گئے ہو
بڑے سفاک ہوتے جا رہے ہو

اُس نے آنا ہی نہیں تھا اس محلے کی طرف — ہم سجاتے ہی رہے بے سُو دگھر کے راستے
ابرِ رحمت اب کے حیدر، بن گیا جیسے عذاب — کردیے برسات نے مسدود گھر کے راستے

وہ بھی اپنے آئینے میں دیکھتا ہوگا مجھے
جس کو اپنے آئینے میں دیکھتا رہتا ہوں میں
دل کے دروازے پہ دستک دے کے چھپ جاتا ہے وہ
اور اپنے سامنے حیدر کھڑا رہتا ہوں میں

ہوا شہکار جب اس کا مکمل — وہ اپنے خون میں ڈوبا ہوا تھا
شبِ تنہائی میں اک شخص دل پہ — اُجالے کی طرح پھیلا ہوا تھا

میرے، اُس کے درمیاں جو فاصلہ رکھا گیا — اس کے طے کرنے کو بھی اک راستہ رکھا گیا
بھر کے آنکھوں میں سلگتے خواب اس کی یاد کے — مجھ کو سوتے میں بھی حیدر جاگتا رکھا گیا

وہ موم ہے اگر تو اُسے دھوپ سے بچا — پتھر ہے اس کا دل تو اُسے پاش پاش کر

اُس میں مل جائے گا جاکر میرے اندر کا خلا
اور بڑھ جائے گا باہر کا خلا میرے بعد

کعبۂ دل کو کہاں چھوڑ چلے ہو حیدر — تم تو کہتے تھے یہ ہجرت نہیں ہوئے والی

اے خدا ڈر ہے مجھے طے ہی نہ ہو جائے کہیں — منزلِ عشق کو دو چار قدم رہنے دے

نہیں تو صرف مرے حال سے نہیں واقف — وہ بے خبر جو جہاں بھر کے راز رکھتا ہے

جب اس نے خاک اڑانے کا ارادہ کرلیا ہے
تو ہم نے دل کے صحرا کو کشادہ کرلیا ہے

اگلی نسلوں میں چلی جائے روانی اپنی — زندگی! ختم نہیں ہوگی کہانی اپنی
آج اولاد کے آئینے میں حیدر ہم نے — تازہ کرلی ہے ہراک یاد پرانی اپنی

اب کے اُس نے کمال کرڈالا — اک خوشی سے نڈھال کرڈالا
اک حقیقت کے روپ میں آ کر — مجھ کو خواب و خیال کرڈالا

____

نعیم الرحمٰن (کراچی)

''عمرلا حاصل کا حاصل''

حیدرقریشی کی ادبی کائنات

حیدرقریشی ایک ہمہ جہت شاعروادیب ہیں۔شاعری میں نظم،غزل اوراردو ماہیا اگرحیدرقریشی کی پہچان ہیں تو نثر میں افسانہ، انشائیہ ،خاکے،تنقید،سفرنامہ اورکالم نگاری ہرطرز میں انہوں نے اپنی دھاک بٹھائی ہے۔حیدرقریشی کی شاعری روایت اوردھرتی سے جڑی ہے،انکی غزل میں پنجابی اورسرائیکی الفاظ کا استعمال انہیں ایک منفرد انداز دیتا ہے، پھراردو ماہیے کے فروغ کیلئے توانہوں نے بے پناہ کاوشیں کی ہیں۔شاعروادیب کے علاوہ جرمنی سے ''جدیدادب'' جیسابے مثال ادبی جریدے کے ذریعے حیدرقریشی نے مدیر کےطور پر بھی نہ صرف اپنی بے پناہ صلاحیتوں کالوہا منوایا ہے بلکہ اردودنیا کے دوراورانتہائی کم وسائل میں پرچہ کو باقاعدگی سے شائع کرکےاردوادب سےاپنےلگاؤ کاثبوت بھی پیش کیا ہے۔

1971ء میں پہلی غزل کہنے والےاورخانپور میں ''حلقہ ارباب ذوق'' کے بانی حیدرقریشی کی پانچ شعری اور چھ نثری کتب کا مجموعہ ''عمرلا حاصل کا حاصل'' حال ہی میں دہلی سے شائع ہوا ہے۔اس کلیات کی اشاعت کے ساتھ حیدرقریشی نے ایک بار پھراپنی انفرادیت کا ثبوت دیا ہے۔شعری کلیات کی اشاعت کی روایت تو کافی پرانی ہے،گذشتہ چند دہائیوں میں نثری کلیات بھی بڑی تعداد میں سامنے آئی ہیں،جن کی ابتدااردو کے عظیم افسانہ نگاروں سعادت حسن منٹو،پریم چندوغیرہ کے ادبی سرمایے کو یکجا کرنے سے ہوئی پھردورحاضر کے ادیبوں کی کلیات بھی شائع ہوئیں۔حیدرقریشی نےنظم،غزل اور ماہیے پرمشتمل اپنی چار کتابوں ''سلگتے خواب''، ''عمر گریزاں''، ''دعائے دل'' ''دردسمندر'' اور ماہیے کے مجموعے ''محبت کے پھول''،افسانوی مجموعوں ''روشنی کی بشارت''، ''قصے کہانیاں''،شخصی خاکوں اور یادوں کی کتابوں ''میری محبتیں'' اور ''کھٹی میٹھی یادیں'' انشائیوں کی کتاب ''فاصلے اورقربتیں'' اورسفرنامہ حج ''سوئے حجاز'' کوایک ہی جلد میں مجتمع کردیا ہےاوراس طرح لاحاصل

سے حاصل کرنے کا ہنر بھی حیدرقریشی ہی کے حصے میں آیا،اس مجموعے میں انہوں نے اپنی گیارہ کتابوں کے بعد کی تحریریں بھی شامل کردی ہیں۔یوں بڑے سائز کے 616 صفحات کی اس کلیات کے ذریعےحیدرقریشی کا اب تک کامکمل ادبی سفرقاری کے سامنے آ گیا ہے۔

اردو ماہیے کے فروغ میں حیدرقریشی نے غیرمعمولی کردارادا کیا ہےاوران کے اپنے ماہیوں میں مٹی کی خوشبوالگ سے پہچانی جاتی ہے۔ان ماہیوں میں حمد،عشق رسولؐ،دھرتی سے محبت،رشتوں کی اہمیت، داستانیں، شادی بیاہ کی رسوم،ذاتی اور اجتماعی دکھ اور جرمنی میں بیتے برسوں کا بیان، کیا کچھ نہیں ہے۔اوران ماہیوں کے ہرلفظ میں ایک جیتا جاگتا حیدرقریشی دھڑکتا محسوس ہوتا ہے۔

حیدرقریشی کی غزل روایتی کلاسیکی غزل سے وابستہ ہےاوراس میں پنجابی اورسرائیکی لہجہ اسے ایک نیا آہنگ دیتا محسوس ہوتا ہےاور یہ غزل اردولفظیات میں کچھ دلکش اضافے بھی کرتی نظر آتی ہے۔انکی غزل میں عشق حقیقی اورعشق مجازی کے دوش بدوش غم دنیااورغم روزگاراوردیگر مسائل بھی نمایاں ہیں۔انکی نظموں کے موضوعات ''ایک اداس کہانی''، ''درد'' ''ایبٹ آباد'' اور''حاصل زندگی'' اپنے عنوانات ہی سے قاری کی توجہ اپنی جانب مبذول کرلیتے ہیں اوران میں عملی زندگی کی تصویریں نظرآتی ہیں۔حیدرقریشی کی شاعری میں قنوطیت کے بجائے امید کا دیا جگمگاتا ہے۔ڈاکٹرکرسٹینا اوسٹر ہیلڈ کا کہنا ہے کہ حیدرقریشی کی شاعری میں بے ساختہ پن اور روانی ہےایک بار پڑھنا شروع کیا تو جی چاہا پڑھتی چلی جاؤں۔دوسراوصف بے باکی اور وارفتگی کا ہے۔

حیدرقریشی کے افسانے انسانی جذبات ،احساسات سے بھرپور ہیں اوران میں ہمارے اردگرد کی زندگی اور جیتے جاگتے کردار بکھرے نظرآتے ہیں۔علامت کا استعمال وہ لایعنی انداز میں نہیں کرتے بلکہ بے معنی تجرید کے بجائے علامت بیحد جاندار انداز میں سامنے آتی ہے۔دیوندراسر کے مطابق حیدرقریشی کی کہانیوں کی دنیا ایسے کرداروں سے آباد ہے،سچائی کاالمیہ جن کی قسمت بن چکا ہے۔یہ کہانیاں کائناتی انسان، خدا، روح، ثقافت اورثقافتی وراثت کےازلی سوالوں کی کہانیاں ہیں۔

کھٹی میٹھی یادیں اورمیری محبتیں کے خاکے دراصل حیدرقریشی کی عمرگذشتہ کا احوال ہے۔جس میں قریبی رشتہ داروں اوراحباب کا تزکرہ انتہائی جذبے اورخلوص سے کیا گیا ہےاورکسی شخصیت کے بیان میں کوئی لگی لپٹی نہیں رکھی۔سوئے حجاز حیدرقریشی کا سفرنامہ حج ہےجس میں سات عمرے اورایک حج کا بیان کیا گیا ہے۔اس سفرنامے میں تصوف کارنگ،واردات قلبی اورروحانی تجربات کاذکرقاری کوایک نئی دنیامیں پہنچادیتا ہے۔

عمرلاحاصل کا حاصل ایک ایسی کتاب ہےجس کا مطالعہ ہرادب دوست قاری کوکرنا چاہئے اور میں حیدر قریشی کی اس خواہش کے پورے ہونے کی دعا کرتا ہوں کہ انہیں پاکستان میں بھی کوئی ایماندار پبلشرمل جائے تاکہ یہ کتاب پاکستان میں بھی شائع ہوسکے۔

افضل چوہان (مظفر گڑھ)

برگد مثال حیدر قریشی

(جس طرح بعض لوگ دوسروں کے بارے میں تعصب و نفرت آمیز تحریر لکھتے ہیں،اسی طرح ادبی محبت رکھنے والے اپنے محبّ کے بارے میں محبت آمیز تحریر لکھتے ہیں۔افضل چوہان کا یہ مضمون حیدر قریشی کے بارے میں ان کی ادبی محبت کا اظہار ہے۔**ارشد خالد**)

یوں تو ہر درخت جڑ،تنا،پتے،چھال اور پھل وغیرہ پر مشتمل ہوتا ہے۔حیدر قریشی سے رابطہ ہونے کے بعد میں نے جب بھی برگد کے درخت کے بارے میں سوچا یا دیکھا تو مجھے حیدر قریشی کی شخصیت برگد کے ایک پیڑ کی مانند لگی۔حیدر قریشی کی ادبی قد آوری کی بات کی جائے تو برگد کا قد اس کا پھیلاؤ اور عاجزانہ جھکاؤ ان پر صد فی صد منطبق ہوتا ہے۔جب ان کی ادب پروری اور اپنے جونیئرز کے ساتھ پیار بھرے رویئے اور حوصلہ افزائی کی بات کی جائے تو اس کی چھاؤں حیدر قریشی کی شخصیت کا مکمل احاطہ کرتی نظر آتی ہے۔برگد کی چھاؤں کسی بھی اور درخت کی چھاؤں سے یوں بھی منفرد و ممتاز ہے کہ اس کی چھاؤں میں کوئی چھید تک محسوس نہیں ہوتا۔دھوپ کی حدت اس سے چھن کر بھی نیچے تک نہیں پہنچتی کہ پتے اتنے گھنے ہوتے ہیں کہ دھوپ اپنی تمازت لئے اس کی چھتر چھاؤں کے اوپر ہی خیمہ زن رہتی ہے۔برگد کی جڑ لکڑی چھال پتے شاخیں ہی نہیں اس کی رگوں میں خون کی طرح دوڑتا دودھ بھی انسان کے لئے مفید ہوتا ہے۔اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ برگد کا ایک ایک ذرہ حیات بخش اور تسکین آفریں ہے۔ہزار ہا بیماریوں کا شافی علاج رب تعالی نے برگد میں سمو دیا ہے حیدر قریشی نے کس کس صنف میں طبع آزمائی کی انہیں ہم استعارتی طور پر برگد کے حصوں سے جوڑ سکتے ہیں۔

بنظر غائر اگر ہم اردو ادب کے موجودہ دور کے مشاہیر پر نظر ڈالیں تو ہم دیکھیں گے کہ غزل گو شعراء نظم کے پیرائے میں اپنے اظہارِ خیال پر وہ گرفت کھو دیتے ہیں جو غزل کے اشعار میں ان کی انفرادیت اور خاصہ شمار کی جاتی ہے۔اسی طرح نظم گو شعراء غزل کے میدان میں وہ شہسواری نہیں دکھا پاتے جو ان کا طرہ امتیاز ہوتی ہے۔نتیجتاً وہ کسی ایک صنف تک محدود ہو جاتے ہیں۔

اگر تحقیق و تنقید کے میدان میں نظر دوڑائیں تو نقاد اور محقق صرف اسی صنف تک محدود ہو کر رہ جاتے ہیں اس کی وجہ شاید یہ رہی ہو کہ اچھے اچھے شعروں کی درگت بنا کر اور اچھے اچھے کلام کے بخیے اُدھیڑ کر انہوں نے شہرت کی بلندیاں حاصل کی ہوتیں ہیں اب اگر صاحب اسلوب شاعر یا مصنف کہلانا چاہتے ہوں تو انہیں نہایت عرق ریزی سے وہ کچھ تخلیق کرنا پڑتا ہے جس پر کم سے کم قلم رکھا جا سکے اور کم سے کم تنقید کا نشانہ بنے یہی وجہ ہے کہ ایسے نقاد اور محقق آپ کو ہزاروں مل جائیں گے۔جن کی تنقید و تحقیق پر بیسیوں کتابیں ہوں گی مگر اپنا کلام یا تخلیق ایک آدھ کتاب سے آگے نہ بڑھا ہوگا مگر ایسے لوگ انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں جو خود بھی بڑے تخلیق کار ہوں اور تنقید و تحقیق میں بھی یدِ طولیٰ رکھتے ہوں۔حیدر قریشی انہی چند گنے چنے ناموں میں سے ایک ہیں جنہوں نے 1971ء میں صرف اٹھارہ سال کی عمر سے جو ادب کی خدمت شروع کی تو آج تک پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ہر لحظہ ہر ساعت نئی منزلیں تراشیں اور آنے والوں کے لئے مثالیں قائم کیں۔حیدر قریشی کو غیر تخلیقی رویوں نے ہی ہر دور میں چھلنی نہیں کیا بلکہ ادبی زکوٰۃ پر پلنے والوں غیر سنجیدہ تخلیق کاروں نے ان کی راہ میں مخالفت و دشمنی کی کی رُکاوٹیں کھڑی کر کے انہیں سفر جاری رکھنے سے حتیٰ الامکان روکنے کی کوشش کی۔مگر حیدر قریشی تو برگد تھا۔جسے ہر حال میں بڑھتے رہنا تھا۔اور اپنا قد اونچا کر کے ہزاروں آنے والوں کے لئے چھاؤں مہیا کرنا تھی،لہٰذا مخالفین کی کوششیں یکسر رائیگاں ہوتی گئیں اور خلوص نیتی کی ایک بار پھر جیت ہوگئی۔حیدر قریشی نے اپنا سفر جاری رکھا کسی مخالف کی پرواہ کئے بغیر بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ دشمنوں کی دشمنی اور دوستوں کی دوستی کی پرواہ کیئے بغیر محوِ سفر رہے۔دشمن تو مخالفت برائے مخالفت میں راہیں مسدود کرتے ہیں جبکہ دوست بے جا تعریف سے تخفیفِ سفر کا باعث بنتے ہیں۔حیدر قریشی ہر دو سے بچتے ہوئے اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہے اور آج اس مقام پر ہیں کہ انہیں رات کا چاند اور دن کا سورج کہا جا سکتا ہے۔روشنی،نیکی اور محبت ہر دور میں موجود رہے ہیں۔اور تا قیامت موجو رہیں گے۔ان کی مخالفت میں ایک زمانہ ساز باز کر لے مگر ان کے ادبی کام کو مٹا دینا کبھی کسی کے بس میں نہیں رہا۔روشنی کو اندھیرا کچھ وقت کے لئے اوجھل ضرور کر سکتا ہے مگر تا دیر اس کی راہ روکنا کبھی تیرگی کے بس میں نہیں رہا،یہی وجہ ہے کہ تیرگی کے لئے سمندر کو روشنی کی ایک کمزور کرن بھی پاٹ سکتی ہے۔برائی نیکی کے سامنے ہر طور گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جاتی ہے اور محبت نفرت کے مقابلے میں ناکام و نامراد ہوا ایسا نہ آج تک ہوا ہے اور نہ قیامت تک ہوگا،ان کی طاقت ہمیشہ مسلّم رہی ہے۔یہ تینوں چیزیں ہمیشہ حیدر قریشی کے دائیں بائیں رہی ہیں بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ حیدر قریشی کی ہر مخالف طاقت،ہر دشمنی کو زیر کرنے میں روشنی،نیکی،اور محبت ہی ہتھیار ثابت ہوئے ہیں۔اور یہ تینوں ہتھیار جسے رب تعالیٰ کی طرف سے ودیعت ہوئے ہوں۔اس سا خوش نصیب تو پھر شاید ہی کوئی زمانے میں ہو۔

حیدر قریشی کو جب ہم غزل کے حوالے سے دیکھتے ہیں تو ان کے اشعار میں نیا پن نظر آتا ہے ان کی شاعری زندگی کے بہتر رویوں کی طرف اشارہ ہے حیدر قریشی بد سے بدتر حالات سے مایوس نہیں ہیں جو کے انسان

نے خود پیدا کئے ہیں بلکہ وہ اس امید سے بندھے ہیں کہ انسان کو کبھی نہ کبھی اپنی غلطی کا احساس ہوجانے پر انسانیت کی معراج کی طرف لوٹ آنا ہے،اسی کو وہ یوں بیان کرتے ہیں

ابھی کچھ اور بھی الزام وہ لگائے گا
پھر اس کے بعد اسے آپ آب ہونا ہے

حیدر قریشی اپنے کلام کی روشنی میں ایک صوفی بھی ہیں جو روحانی طاقت کے دل سے قائل ہیں اور رب کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہوتے اور نیکی کی قوت کو ہر جگہ کارفرما دیکھتے ہیں

لاکھ صحرا اور سمندر بچھ گئے تھے راہ میں
ان فقیروں کو جہاں سے پار ہونا تھا، ہوئے

ہر شاعر کی طرح حیدر قریشی بھی رومانیت پسند ہیں،انسانوں، چیزوں،مناظر اور رویوں میں خوبصورتی سے متاثر ہوتے ہیں اور اس کو اپنی شاعری کا موضوع بناتے ہیں ان کی یہ شاعری پر اثر بھی ہے اور خوبصورت بھی

جسم کا سحر،طلسم آنکھ کا،لب کے منتر
اس میں بھی کتنے فسوں ساز ہنر رہتے ہیں

تجھ کو خدائے حسن تو ہم مان ہی چکے
مت اس سے بڑھ کے حسن و جوانی پہ مان کر

واجب حضورِ حسن میں ہوتی ہے نذر بھی
اس بارگہ میں پیش تو دل کا جہان کر

اسی طرح حیدر قریشی کی شاعری میں جا بجا بوسیدہ نظام اور اس کے پروردہ آقاؤں کے خلاف ایک نفرت ایک احتجاج بھی ملے گا۔یوں حیدر قریشی نے بے خوفی سے جبر کے خلاف بھی آواز بلند کی ہے اور معاشرتی ناہمواریوں خوب اظہار خیال کیا ہے

خدا کے نام پہ تم نے بہت خدائی کی
تمہارے جبر کا اب احتساب ہونا ہے۔

ماہیا ایک لوک گیت ہے جسے اردو میں غیر ضروری طور پر متنازعہ ادبی صنف بنادیا گیا۔اس کو پہلے پہل کس نے تحریر کیا کی بحث چھڑی اور اس کے وزن کے سادہ سے مسئلہ کو تختۂ مشق بنایا گیا۔اور ان دو مباحث میں ماہیا کی خوبصورتی کو گہن لگنے کے ساتھ ساتھ اس پر جتنا کام ہونا تھا وہ بھی متاثر ہوا۔کوئی بھی تخلیق کار کبھی نہیں چاہتا کہ وہ

نہایت عرق ریزی سے کوئی تخلیق منظر عام پر لائے مگر وہ اس کی نیک نامی اور شہرت میں اضافے کی بجائے محض ایک بحث کا موضوع بن کر رہ جائے۔ایسے حالات میں چند سر پھرے ایسے بھی ہوتے ہیں۔جو ہمیشہ اپنا راستہ سنگلاخ چٹانیں تراش کر بناتے ہیں اور آسیبوں بھرے رستوں سے مردانہ وار ہر رکاوٹ کا مقابلہ کرتے ہوئے منزل پر پہنچنے کی خوشی ایک الگ ہی خوشی ہوتی ہے۔اور ہر دور میں زیادہ نہیں تو چند لوگ ایسے ضرور ہوتے ہیں جو اس خوشی سے سرشار ہوکر منزل تک پہنچنا چاہتے ہیں۔حیدر قریشی نے خود کو کبھی آسان راستے سے گزارنے کا گناہ نہیں کیا۔ماہیا کا بانی کون ہے کی بحث ہو یا اس کے اوزان کا مسئلہ موضوعِ سخن ہو حیدر قریشی نے کسی سے پہلو تہی نہیں کی انہوں نے نہایت خندہ پیشانی سے ہر سوال کو سنا اور پھر برسوں کی محنت کے بعد اب تک ہونے والی تمام مباحث کو اپنی مدلّل تحاریر سے سمیٹ کر اب تک ہونے والی تمام تحقیق کو مدِنظر رکھ کر ایک مثبت، قابلِ عمل اور قابلِ قبول حل پیش کردیا ہے، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ماہیا سے متعلق ہر چھوٹی بڑی دلیل،مضمون، جملے، یہاں تک کہ ذاتی نوعیت کی خط وکتابت تک کو نظر انداز نہیں کیا اور نہایت محنت سے تمام کو کتابی شکل میں پیش کر کے اب تک دستیاب حقائق کی روشنی میں یہ دو مسئلے حل کر دیئے ہیں۔ماہیے کی تحقیق وتنقید کے ساتھ ساتھ اس کی تخلیق کی طرف بھی حیدر قریشی نے بہت توجہ دی اور ایک زود گو شاعر ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے بیش قیمت ماہیے نہ صرف تخلیق کئے بلکہ شائع کر کے انہیں ماہیا سے محبت کرنے والوں تک پہنچایا۔کسی کا حق پہچاننا اور لوگوں تک پہنچانا ایک بہت بڑا کام ہے جو حیدر قریشی کے مزاج کا حصہ بھی ہے حیدر قریشی نے یوں انجام دیا کہ ماہیا نگاری کی ابتدا کے سلسلے میں غلط فہمی کی بنیاد پر جو نام لئے جاتے تھے۔ان میں قمر جلال آبادی اور ساحر لدھیانوی شامل تھے جبکہ ماہیا نگاری کے حقیقی بانی ہمت رائے شرما ہیں۔حیدر قریشی نے 1919ء میں ضلع سیالکوٹ کے مشہور قصبے نارووال میں پیدا ہونے والے ہمت رائے شرما کو مدلل اندازِ گفتگو سے ماہیے کا بانی ثابت کیا۔یوں ایک طرف تو ماہیا کی ابتدا کے بارے میں ہونے والی متنازعہ گفتگو سمیٹ دی تو دوسری طرف ہمت رائے شرما کو ان کا جائز مقام دلوادیا جو شاعری کے علاوہ بھی گوں ناگوں صلاحیتوں کے مالک تھے۔ہمت رائے شرما کے ماہیے 1936ء میں صرف سترہ سال کی عمر میں فلم ''خاموشی'' کی زینت بنے اس کے علاوہ وہ نغمہ نگار، کہانی کار، آرٹ ڈائریکٹر اور ڈائریکٹر تک کے ذمہ دارانہ فرائض خوش اسلوبی سے نبھاتے رہے۔

ماہیا کے ذیل میں حیدر قریشی نے ماہیا کے مزاج، پنجابی لوک گیت ماہیا، ماہیا کے اوزان، ماہیا کی ابتدا، اردو میں ماہیا نگاری، ماہیا اور چن ماہی، اردو ماہیا کی تحریک، ماہیا کی بحث، ماہیا کے فروغ میں خواتین کا حصہ، ماہیا کا جواز، ماہیا کے خدوخال، تمام پر سیر حاصل بحث کی ہے اور کوئی ایسا پہلو نہیں چھوڑا جو تشنہ رہا ہو۔

حیدرقریشی۔۔شخص وعکس

مرتّب: ارشد خالد

مدیر عکاس انٹرنیشنل (اسلام آباد)

نام: قریشی غلام حیدر ارشد

قلمی نام: حیدرقریشی

ولدیت: قریشی غلام سرور

پیدائش: سرکاری کاغذات میں یکم ستمبر ۱۹۵۳ء '

درست خاندانی روایت: ۱۳؍جنوری ۱۹۵۲ء

مقامِ پیدائش: چناب نگر (سابق ربوہ)

آبائی علاقہ: رحیم یارخاں' خان پور (سابق ریاست بھاولپور)

تعلیم: ایم اے (اردو)

ادبی سفر کا آغاز: ۱۹۷۱ء

اصنافِ ادب: **شاعری میں:** غزل' نظم' ماہیا

نثر میں: افسانہ' خاکہ' انشائیہ' سفرنامہ' یادنگاری' تحقیق وتنقید، حالاتِ حاضرہ

....

کتب کی تفصیل:

شاعری

سلگتے خواب (غزلیں)' ناشر: تجدید اشاعت گھر۔لاہور، اسلام آباد۔مطبوعہ ۱۹۹۱ء

عمرِ گریزاں (غزلیں' نظمیں اور ماہیے)' ناشر: تجدید اشاعت گھر لاہور، اسلام آباد۔مطبوعہ ۱۹۹۶ء۔

محبت کے پھول (ماہیے)' ناشر: نایاب پبلی کیشنز۔خانپور۔مطبوعہ ۱۹۹۶ء۔

دعائے دل (غزلیں' نظمیں) ناشر: نصرت پبلشرز لاہور۔مطبوعہ ۱۹۹۷ء۔

چاروں مجموعوں کا مجموعہ **غزلیں' نظمیں' ماہیے** ناشر: سروراد بی اکادمی۔جرمنی۔مطبوعہ ۱۹۹۸ء۔

درد سمندر (غزلیں' نظمیں اور ماہیے) یہ مجموعہ کلیات 'عمرلاحاصل کا حاصل' میں شامل کیا گیا ہے۔

تخلیقی نثر

روشنی کی بشارت (افسانے) ناشر: تجدید اشاعت گھر، اسلام آباد، لاہور۔ مطبوعہ ۱۹۹۲ء۔

قصے کہانیاں (افسانے) یہ مجموعہ الگ سے نہیں چھپا۔ **افسانے** میں شامل ہے۔

افسانے (روشنی کی بشارت اور قصے کہانیاں ایک جلد میں)' ناشر: معیار پبلی کیشنز دہلی۔ مطبوعہ ۱۹۹۹ء۔

ایٹمی جنگ (تین افسانے اردو اور ہندی میں) ناشر: معیار پبلی کیشنز دہلی۔مطبوعہ ۱۹۹۹ء۔

میں انتظار کرتا ہوں (افسانوں کا ہندی ترجمہ) ناشر: ساہتیہ بھارتی، دہلی۔ مطبوعہ ۱۹۹۶ء۔

AND I WAIT (اب تک کے سارے افسانوں کا انگریزی ترجمہ)

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔مطبوعہ ۲۰۰۸ء

میری محبتیں (خاکے)' ناشر: نایاب پبلی کیشنز۔خانپور۔مطبوعہ ۱۹۹۶ء۔

میری محبتیں (خاکے)، ناشر: معیار پبلی کیشنز، دہلی۔مطبوعہ ۱۹۹۸ء۔

کھٹی میٹھی یادیں (یادنگاری) پہلے یہ الگ سے شائع نہیں کی، عمرِ لاحاصل کا حاصل میں شامل ہے۔

اب سال ۲۰۱۳ء میں تین ابواب کے اضافوں کے ساتھ پاکستان سے الگ کتابی صورت میں شائع کی گئی ہے۔

ناشر: عکاس انٹرنیشنل اسلام آباد بہ اشتراک نایاب پبلی کیشنز، خانپور۔مطبوعہ ۲۰۱۳ء

سُوئے حجاز (سفرنامہ۔عمرہ کا احوال)' ناشر: معیار پبلی کیشنز، دہلی۔مطبوعہ ۲۰۰۰ء۔

سُوئے حجاز (سفرنامہ، سفرِ حج کے اضافہ کے ساتھ)، ناشر: سروراد بی اکادمی جرمنی۔مطبوعہ ۲۰۰۴ء۔

فاصلے، قربتیں (انشائیے) یہ کتاب ابھی الگ سے شائع نہیں کی، 'عمرِ لاحاصل کا حاصل' میں شامل ہے۔

....

عمرِ لاحاصل کا حاصل

مذکورہ بالا پانچ شعری مجموعوں اور چھ نثری مجموعوں کی عوامی کلیات۔میگزین سائز ۴۸۴ صفحات

ناشر: معیار پبلی کیشنز۔دہلی۔مطبوعہ ۲۰۰۵ء

....

عمرِ لاحاصل کا حاصل

مذکورہ بالا پانچ شعری مجموعوں اور چھ نثری مجموعوں کی کلیات، لائبریری ایڈیشن۔

میگزین سائز ۶۱۶ صفحات (بعد کی تخلیقات کے اضافوں کے ساتھ)

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔دہلی۔مطبوعہ ۲۰۰۹ء

....

عمرِ لاحاصل کا حاصل (انٹرنیٹ ایڈیشن)

مذکورہ بالا پانچ شعری مجموعوں اور چھ نثری مجموعوں کی کلیات، لائبریری ایڈیشن۔
میگزین سائز ۶۸۰ صفحات (بعد کی تخلیقات کے اضافوں کے ساتھ)
ناشر:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔دہلی۔مطبوعہ ۲۰۰۹ء
کے بعد ۲۰۱۲ء تک کی تخلیقات کے اضافوں کے ساتھ انٹرنیٹ ایڈیشن

قفس کے اندر

چھ شعری مجموعے ایک ساتھ۔۔عوامی اور اکانومی ایڈیشن ایک ہزار سے زائد صفحات کا میٹر صرف ۱۵۲ صفحات میں

سلگتے خواب　　**عمرِ گریزاں**　　**محبت کے پھول**
دعائے دل　　**دردسمندر**　　**زندگی**

ناشر:عکاس انٹرنیشنل اسلام آباد بہ اشتراک نایاب پبلی کیشنز خانپور۔مطبوعہ ۲۰۱۳ء

تحقیق و تنقید

ڈاکٹر وزیر آغا عہد ساز شخصیت (مضامین) ناشر:نایاب پبلی کیشنز۔خانپور مطبوعہ ۱۹۹۵
حاصلِ مطالعہ (تنقیدی مضامین) ناشر:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی مطبوعہ ۲۰۰۸ء
ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور مابعد جدیدیت ناشر:سرورادبی اکادمی جرمنی۔مطبوعہ ۲۰۰۹ء
تاثرات (تنقیدی مضامین اور تبصرے)۔ناشر:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔مطبوعہ ۲۰۱۲ء
ستیہ پال آنند کی ”بُودنی نابُودنی“ (مضامین)۔ناشر:عکاس انٹرنیشنل،اسلام آباد ۲۰۱۳ء
مضامین اور تبصرے (نئے مضامین کا مجموعہ) زیر اشاعت۔ناشر:عکاس انٹرنیشنل،اسلام آباد ۲۰۱۴ء
ہمارا ادبی منظر نامہ (تنقید کے چھ مجموعے ایک جلد میں) ناشر:عکاس انٹرنیشنل اسلام آباد ۲۰۱۴ء
اردو میں ماہیا نگاری (تحقیق و تنقید) ناشر:فرہاد پبلی کیشنز۔اسلام آباد۔مطبوعہ ۱۹۹۷ء
اردو ماہیے کی تحریک (مضامین) ناشر:فرہاد پبلی کیشنز۔راولپنڈی۔مطبوعہ ۱۹۹۹ء
اردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما (مضامین) ناشر:معیار پبلیکیشنز دہلی۔۱۹۹۹ء
اردو ماہیا (ماہیے کے مجموعوں کے پیش لفظ۔یہ کتاب ”اردو ماہیا تحقیق و تنقید“ میں شامل ہے)
ماہیے کے مباحث (مضامین۔یہ کتاب ”اردو ماہیا تحقیق و تنقید“ میں شامل ہے)
اردو ماہیا تحقیق و تنقید (ماہیے کی تحقیق و تنقید کی پانچ کتابیں ایک جلد میں)
ناشر:الوقار پبلی کیشنز۔لاہور۔مطبوعہ ۲۰۱۰ء

حالاتِ حاضرہ

منظر اور پس منظر (9/11 کے بعد حالاتِ حاضرہ پر لکھے گئے فکر انگیز کالموں کا مجموعہ)
ناشر:سرورادبی اکادمی جرمنی اور www.urdustan.com مطبوعہ ۲۰۰۴ء
خبر نامہ (خبروں پر تبصروں کا سلسلہ)۔ناشر:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔دہلی۔مطبوعہ ۲۰۰۶ء۔
اِدھر اُدھر سے (خبروں پر تبصروں اور تجزیوں کا سلسلہ) ناشر:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔مطبوعہ ۲۰۰۸ء
چھوٹی سی دنیا (مشرق و مغرب کے پس منظر میں لکھے گئے کالموں کا مجموعہ)
۲۰۱۲ء میں اس مختصر کتاب کا انٹرنیٹ ایڈیشن شائع کیا گیا
حالاتِ حاضرہ (مذکورہ چاروں کتابوں کو ایک جلد میں یکجا کر کے ای بک آن لائن کر دی گئی ہے۔۲۰۱۳ء)

بطور مرتب

شفق رنگ: (ضلع رحیم یار خان کے شعراء) ناشر:جدید ادب پبلی کیشنز،خانپور،مطبوعہ اپریل ۱۹۷۹ء
کونیں: (بھاولپور ڈویژن کے شعراء) ناشر:جدید ادب پبلی کیشنز،خانپور۔مطبوعہ اپریل ۱۹۸۰ء
سرائیکی غزل: (سرائیکی میں ایک بحث کے ساتھ غزلوں کا انتخاب)
ناشر:جدید ادب پبلی کیشنز،خانپور مطبوعہ ستمبر ۱۹۸۰ء
پہلا ورق: (اوراق کے اداریے) ناشر:مکتبہ ہم زبان کراچی۔مطبوعہ ۱۹۹۰ء

ادارت

ادبی رسالہ ”**جدید ادب**“ خانپور کی ادارت نو سال تک کی۔۱۷ شمارے شائع کیے۔ان میں ۸۰ صفحات سے لے کر ۵۰۰ صفحات تک کے شمارے شامل ہیں۔
جرمنی سے **جدید ادب** ۱۹۹۹ء میں دوبارہ شروع کیا گیا لیکن دو شماروں کے بعد اسے بند کر دیا گیا۔چند برسوں کی بندش کے بعد جولائی ۲۰۰۳ء سے یہی جریدہ اب جرمنی سے جاری کیا ہوا ہے۔یہ رسالہ کتابی صورت کے ساتھ انٹرنیٹ پر اس سائٹ پر موجود ہوتا ہے۔www.jadeedadab.com
اب اس لنک سے بھی جدید ادب کو حاصل کیا جا سکتا ہے: http://jadeedadab.blogspot.de/
ان کوائف کی ترتیب تک اس کے ۱۹ شمارے شائع ہو چکے ہیں۔اس ششماہی رسالہ کے سجاد ظہیر نمبر اور میرا جی نمبر شائع ہو چکے ہیں۔**حیدر قریشی کی سب سے پہلی ویب سائٹ**: www.haiderqureshi.com

---

اہم ای لائبریریز

ان بلاگس میں حیدرقریشی کی تمام کتابیں پی ڈی ایف فائل میں موجود ہیں

http://haiderqureshi-library.blogspot.de/

http://haider-qureshi.blogspot.de/

■■■■■■■■■■■

اس لنک پر حیدرقریشی پر لکھی گئی،مرتب کی گئی کتب ورسائل کی پی ڈی ایف فائلز موجود ہیں

http://work-on-haiderqureshi.blogspot.de/

■■■■■■■■■■■

حیدرقریشی کی تمام کتابیں اس لائبریری میں بھی موجود ہیں

http://issuu.com/haiderqureshi

■■■■■■■■■■■

حیدرقریشی کی کتابوں تک رسائی مزید آسان،دو نئے مربوط بلاگس

حیدرقریشی کی تمام کتابیں الگ الگ صورت میں: http://my27books.blogspot.de/

حیدرقریشی کی تمام ۲۷ کتابیں پانچ کلیات کی صورت میں: http://kuliat-library.blogspot.de/

■■

ادبی بلاگس ان بلاگس پر حیدرقریشی کی کتب یونی کوڈ میں دستیاب ہیں۔

سوئے حجاز: http://soo-e-hijaz.blogspot.de/

■■■■■■■■■■■

''روشنی کی بشارت''،''قصے کہانیاں''اور بعد کے سارے افسانے

http://hq-kayafsanay.blogspot.de/

■■■■■■■■■■■

خاکوں کا مجموعہ ''میری محبتیں'': http://meri-mohabbaten.blogspot.de/

■■■■■■■■■■■

یادوں کا مجموعہ ''کھٹی میٹھی یادیں'': http://khatti-mithi-yaden.blogspot.de/

■■■■■■■■■■■

انشائیوں کا مجموعہ ''فاصلے،قربتیں'': http://inshaiya.blogspot.de/

■■■■■■■■■■■

دوخاص بلاگس

کلکتہ اور دھلی کا سفر،با تصویر

http://haiderqureshi-in-kolkata-delhi.blogspot.de/

■■■■■■■■■■■

حیدر قریشی کی البم:زندگی تصویروں کے آئینے میں

http://haiderqureshi-album.blogspot.de/

■■

وکی پیڈیا کے صفحات

حیدر قریشی : http://en.wikipedia.org/wiki/Haider_Qureshi

جدید ادب : http://en.wikipedia.org/wiki/Jadeed_Adab

عمرِ لاحاصل کا حاصل

http://en.wikipedia.org/wiki/Umr-e-Lahaasil_Ka_Haasil

■■

ادبی اعتراف

حیدرقریشی کے بارے میں لکھی گئی اور مرتب کی گئی کتابیں

۱۔**حیدر قریشی فکر و فن** **مصنف**: **محمد وسیم انجم**

(مطبوعہ ۱۹۹۹ء) **ناشر**: انجم پبلشرز،کمال آباد نمبر۳،راولپنڈی۔پاکستان

۲۔**حیدر قریشی فن اور شخصیت**

مرتبین: **نذیر فتح پوری اور سنجئے گوڑ بولے** (مطبوعہ ۲۰۰۲ء)

ناشر: اسباق پبلی کیشنز۔پُونہ،انڈیا

۳۔**حیدر قریشی کی ادبی خدمات**

مرتب: **ڈاکٹرنذر خلیق** (مطبوعہ ۲۰۰۳ء) ناشر: میاں محمد بخش پبلشرز،خانپور،پاکستان

۴۔**حیدر قریشی شخصیت اور فن** **منزہ یاسمین** کا تحقیقی مقالہ کتابی صورت میں۔

اسلامیہ یونیورسٹی بھاولپور سے ایم اے اردو کا تحقیقی مقالہ۔سال ۲۰۰۲۔۲۰۰۰ء

ناشر: میاں محمد بخش پبلشرز۔خانپور۔پاکستان

۵۔**حیدر قریشی سے لیے گئے انٹرویوز**

مرتب: **سعید شباب** (مطبوعہ ۲۰۰۴ء) **ناشر**: نظامیہ آرٹ اکیڈمی۔ایمسٹرڈیم۔ہالینڈ

۶۔ادبی کتابی سلسلہ **عکاس** حیدرقریشی نمبر۔۔۔**مدیر ومرتب**: **ارشد خالد**

ناشر: عکاس پبلی کیشنز،اسلام آباد(کتاب نمبر۴۔مطبوعہ اکتوبر ۲۰۰۵)

۷۔**حیدر قریشی کی شاعری** **مرتب**: **ہرمے بھانو پرتاپ**

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔دہلی۔(مطبوعہ ۲۰۱۳ء)

۸۔**حیدر قریشی شخص و عکس** (کتاب ہذا) **مدیر و مرتب**: **ارشد خالد**

ناشر: عکاس انٹرنیشنل اسلام آباد(۲۰۱۴)

■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■

حیدر قریشی پر ترتیب دئیے گئے گوشے اور مطالعۂ خصوصی

۱۔گوشہءحیدرقریشی مطبوعہ ماہنامہ ’’**اسباق**‘‘پونہ شمارہ:فروری تا اپریل۱۹۹۳ء۔ایڈیٹر:نذیر فتح پوری

۲۔**حیدر قریشی**(بطورافسانہ نگار)مطبوعہ ماہنامہ’’**شاعر**‘‘بمبئی۔

شمارہ مئی تا دسمبر۱۹۹۷ء۔**ہم عصر اردو ادب نمبر**... ایڈیٹر : افتخارامام صدیقی

۳۔اشاعتِ خصوصی’’دنیائے ادب کا درخشاں ستارہ،حیدرقریشی‘‘ہفت روزہ**ہوٹل ٹائمز** اسلام آباد۲۲مئی تا ۲۸مئی ۱۹۹۸ء۔ مرتبین:اختر رضا کیکوٹی ومحمد وسیم انجم

۴۔گوشہءحیدرقریشی مطبوعہ سہ ماہی’’**ادبِ عالیہ**‘‘وہاڑی۔شمارہ مارچ۲۰۰۲ء۔ایڈیٹرز:ریاض ہانس

۵۔خصوصی مطالعہ ’’**مہرِامروز**‘‘مطبوعہ ماہنامہ **کائنات** شمارہ مئی۲۰۰۴ء

(اردودوست ڈاٹ کام) ایڈیٹر:خورشید اقبال

٦۔گوشہءحیدرقریشی مطبوعہ ماہنامہ **شاعر**بمبئی شمارہ نومبر۲۰۰۴ء ۔ایڈیٹر:افتخارامام صدیقی

۷۔خصوصی مطالعہ سہ ماہی**ادب ساز** دہلی(تقریباً۵۰صفحات میگزین سائز پر مشتمل)

شمارہ:٦،۷،جنوری تا جون ۲۰۰۸ء ایڈیٹر:نصرت ظہیر

۸۔خصوصی مطالعہ’’**عمرِ لاحاصل کا حاصل**‘‘

مطبوعہ ادبی کتابی سلسلہ **عکاس انٹرنیشنل**اسلام آباد(کتاب نمبر۱۰) مدیر:ارشد خالد

۹۔گوشہ بحیثیت محقق ونقاد مطبوعہ ادبی کتابی سلسلہ**عکاس انٹرنیشنل**اسلام آباد

(کتاب نمبر۱۱،مئی۲۰۱۰ء) مدیر:ارشد خالد

۱۰۔مطالعۂ خاص۔**ایک کتاب:’’عمرِ لاحاصل کا حاصل‘‘**۔مطبوعہ ادبی کتابی سلسلہ **عکاس انٹرنیشنل**

اسلام آباد۔کتاب نمبر۱۳۔مارچ۲۰۱۱ء۔ مدیرومرتب:ارشد خالد

۱۱۔**ایک گوشہ حیدر قریشی کے لیے**۔دوصفحات پر مشتمل۔ روزنامہ **پیغام**دہلی

شمارہ:۱۰،مئی۲۰۱۴ء ایڈیٹر:مطیع الرحمٰن عزیز

پاکستان اور جرمنی سے باہر کے اسفار

ہندوستان۔سعودی عرب۔انگلینڈ۔ہالینڈ۔فرانس۔ماریشس۔آسٹریا۔بلجیم۔

حیدر قریشی کاڈاک کا پتہ: Haider Qureshi
Rossertstr.6, Okriftel,
65795 Hattersheim, Germany.
ٹیلی فون نمبر:0049-6190-930078 ای میل:haider_qureshi2000@yahoo.com

---

بحوالہ **عکاس** اسلام آباد شمارہ اکتوبر۲۰۰۵ء **حیدر قریشی نمبر**مدیر**ارشد خالد**

جون۲۰۱۴ءتک تازہ ترین اضافوں کے ساتھ

خصوصی نوٹ

حیدرقریشی کے اوریجنل ورک کے حوالے سے اب تک ستائیس کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں۔

شاعری:چھ مجموعے۔۔۔۔افسانے:دومجموعے۔۔۔۔خاکے:ایک مجموعہ

یادنگاری:ایک مجموعہ۔۔۔انشائیہ نگاری:ایک مجموعہ۔۔۔سفرنامہ:ایک مجموعہ

ماہیا کی تحقیق وتنقید:پانچ کتابیں۔۔۔۔۔متفرق تنقیدی مضامین:چھ کتابیں

حالاتِ حاضرہ:کالموں کے چار مجموعے

یہی ۲۷ کتابیں متفرق اور مختلف ایڈیشنز کی صورت میں پینتیس کی تعداد میں چھپ چکی ہیں۔یہ صرف اوریجنل ورک کے ذیل میں آنے والی کتابیں ہیں۔مرتب کردہ کتب اورادبی رسائل کی ایڈیٹنگ کوان میں شمار نہیں کیا گیا۔

یونیورسٹی سطح کا کام

براہِ راست

۱۔**حیدر قریشی شخصیت اور فن....منزہ یاسمین**

کا اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور،پاکستان سے ایم اے اردو کا تحقیقی مقالہ سال۲۰۰۲۔۔۲۰۰۰ء

۲۔**حیدر قریشی شخصیت اور ادبی جہتیں ڈاکٹرعبدالرب استاد**

کا پی ایچ ڈی کا مقالہ۔سال۲۰۱۳ء۔گلبرگہ یونیورسٹی گلبرگہ،کرناٹک،انڈیا

۳۔**حیدر قریشی۔حیات وخدمات انجم آراء**

کا ایم فل کا مقالہ سال۲۰۱۳ء۔کلکتہ یونیورسٹی،کولکاتا،انڈیا۔

۴۔**حیدر قریشی کی ادبی خدمات ....عامر سھیل**

کا ایم فل کا مقالہ سال۲۰۱۳ء۔۲۰۱۴ء۔ہزارہ یونیورسٹی،مانسہرہ،(ایبٹ آباد)،پاکستان

۵۔**حیدر قریشی کی شاعری کا مطالعہ ھرمے بھانوپرتاپ**

کا ایم فل کا مقالہ،سال۲۰۱۳ء۔۲۰۱۴ء۔جواہرلال نہرو یونیورسٹی،دہلی۔انڈیا

٦۔**حیدر قریشی کی افسانہ نگاری راضینہ خان**

کا ایم فل کا مقالہ سال۲۰۱۳ء۔۲۰۱۴ء۔جواہرلال نہرو یونیورسٹی،دہلی۔انڈیا

بالواسطہ

۱۔**جدید ادب میں شائع ہونے والے مباحث....شازیہ حمیرہ**

سال۲۰۰۹۔۔۔۲۰۰۷ء۔اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور،پاکستان سے ایم اے اردو کا تحقیقی مقالہ

۲۔**اردو میں ماھیا نگاری ڈاکٹر صبیحہ خورشید**

سال۲۰۰۹ء۔ناگپور یونیورسٹی،ناگپور،انڈیا سے پی ایچ ڈی کا مقالہ